خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2016

سال نو مبارک





خواتین ڈائجسٹ

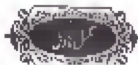
خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37 - اردو بازار کراچی



ناول





افسانے





MEMBER APNS CPNE









2016




Phone: 32721777, 32726617, 0 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com




مُدیرہ

کہی اَن کہی

جنوری سنہ 2016ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بہت سی کامیابیاں، ناکامیاں، مایوسیاں اور شادمانیاں اپنے دامن میں سمیٹے سنہ 2015ء بھی رخصت ہوا۔ انسان لمحہ موجود میں سانس لیتا ہے۔ مستقبل کے خواب دیکھتا ہے لیکن ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس کی زندگی پر ماضی کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ خواہ ماضی خوش کن ہو یا آنکھوں کو نم کرنے والا۔

ہر نئے سال کا استقبال بڑے جوش اور ولولوں سے کیا جاتا ہے۔ منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ خود سے عہد کیے جاتے ہیں مگر تصور سے حقیقت تک پہنچتے ان میں سے اکثر اپنی ہیئت، حیثیت اور اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ترجیحات بدل جاتی ہیں، تعذیر حائل ہو جاتی ہے۔ جو دن گزرتے جائیں گے، صورت بدلتی جائے گی۔ آغاز سے انجام تک اسی کی تفسیر ہے۔ دنیا نہیں بدلتی، ہم بدل جاتے ہیں۔

انسان کو بہت تھوڑا وقت ملا ہے۔ کوشش کریں کہ اس وقت کو مثبت کاموں میں صرف کیا جائے۔ عمر رواں کو اس طرح گزاریں کہ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو کوئی پچھتاوا یا پشیمانی دامن گیر نہ ہو۔

شب تاریک میں محبتوں کے چراغ روشن رکھیں۔ محبتوں کو مصروفیت میں گم نہ ہونے دیں۔ اپنے حصے کی شمع کو بے قیمت نہ جانیں کہ ستم کی سیاہ رات میں اندھیرے کو شکست دینے کے لیے اجالے کی ایک کرن بھی بہت ہے۔

اپنے رب کو خوش رکھیں۔ رب راضی تو سب راضی۔

بہت ساری دعاؤں کے ساتھ قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔

دعا ہے کہ نئے سال کا سورج ہمارے آنگن میں خوشیوں کی کرنیں لے کر اترے۔ آمین۔

انشاجی،

چاند کے شیدائی انشاجی چاند کی کھوج میں ایسے دور نکل گئے کہ واپسی کا رستہ ہی بھول گئے پر ان کے چاہنے والے انہیں آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں، ان کی شاعری آج بھی اسی طرح مقبول ہے۔

انہوں نے کالم لکھے، سفرنامے تحریر کیے، شاعری کا ہر رنگ بھلا، ہر رنگ منفرد، ہر انداز دلکش۔ نثر لکھتے ہیں تو قلم فقروں کی کلیاں سی برساتا جاتا ہے۔ شاعری میں ایک علیحدہ انشاجی جلوہ گر ہیں۔ ایک جوگ۔ جوگی کی دنیا، عجیب ہی دھوپ چھاؤں کا عالم۔

دیوانے دل کے قصے، خواب وخیال کی باتیں۔

انشاجی کی شاعری ہو یا کالم ایک طویل وقت گزر جانے کے باوجود آج کی آواز نظر آتے ہیں۔ 11 جنوری سنہ 1978ء کو انشاجی دنیا سے رخصت ہوئے لیکن ان کی شاعری، ان کی تحریریں انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ دل ونظر کی بات،
- عمیرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول،
- یادیں یاد آتی ہیں۔ قارئین سے سروے،
- باتیں منیب بٹ سے،
- امت العزیز شہزاد کا ناول۔ شہر آشوب،
- مدیحہ سعید کا ناولٹ۔ ادھورے چاند کا دکھ،
- ایمل رضا، ہاجرہ ریحان، ثمرہ عاشق، عروج فاطمہ اور حیرا قریشی کے افسانے،
- نعت خواں تحریم منیبہ سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حیا کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکی سے زیادہ حیادار تھے۔ اگر آپ کو کوئی بات ناگوار گزرتی تو چہرہ مبارک پر اس کے آثار ظاہر ہو جاتے تھے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حیا انسان کی ایک فطری خوبی ہے۔ بے حیائی انسان کے لیے خلاف فطرت کیفیت ہے، جو شیطان کے ورغلانے سے پیدا ہوتی ہے۔

2۔ ناگوار گزرنے والی بات کو برداشت کر جانا اور اس کا کھل کر اظہار نہ کرنا بھی حیا میں شامل ہے، تاہم اگر کوئی خلاف شرع بات ہو تو خاموش رہنا حیا میں شامل نہیں، اس وقت مناسب انداز سے اظہار ضروری ہے۔

3۔ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب لڑکی بالغ ہوتی تو وہ گھر میں اس کمرے میں زیادہ وقت گزارتی جہاں اسے زیادہ تنہائی میسر ہو۔ شادی تک یہی کیفیت رہتی۔ اس کمرے کو (خدر) کہتے تھے، اس لیے "خدروالی" کا ترجمہ "پردہ نشین" کیا گیا ہے۔

حیا

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں تک پہلی نبوت کا جو کلام پہنچا ہے، اس میں یہ بھی ہے جب تو حیا نہ کرے تو جو چاہے کر۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حیا کی اہمیت سابقہ شریعتوں میں بھی مسلمہ تھی۔

2۔ حیا انسان کو برے کاموں سے روکنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ جب کسی میں حیا نہ ہو تو اس سے گندے سے گندے گناہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔

3۔ اس حدیث کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جس کام میں ایک شریف آدمی شرم محسوس نہیں کرتا' وہ شرعاً" جائز ہوتا ہے۔ اور جس کام سے شرم محسوس ہوتی ہو' اس سے بچ جانا چاہیے' تاہم بعض اوقات معاشرے کی حالت تبدیل ہو جانے سے گناہ عام ہو جائے اور نیکی کا رواج نہ رہے تو وہ اس حکم میں نہیں۔

بداخلاقی

حضرت ابوبکرہ (نفیع بن حارث ثقفی) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان جنت میں (لے جانے والا) ہے۔ اور بدکلامی' بداخلاقی کا حصہ ہے اور بداخلاقی جنم میں (لے جانے والی) ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اچھے اعمال کی طرح اچھے اخلاق بھی ایمان میں شامل ہیں۔

2۔ مومن کو اچھی عادتوں کا پابند ہونا چاہیے اور بری عادتوں سے متنفر ہونا چاہیے۔

3۔ بدکلامی سے مراد فحش کلامی' گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا وغیرہ ہے۔ جو مومن کی شان کے لائق نہیں۔

خوش نما

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے حیائی جس چیز میں بھی ہو' اسے بدنما کر دیتی ہے۔ اور حیا جس چیز میں بھی ہو' اسے خوشنما کر دیتی ہے۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ حیا زندگی کے ہر مرحلے اور ہر میدان میں ضروری ہے۔

2۔ بے حیائی کلام میں ہو یا حرکات میں یا معاملات میں' وہ بری ہی ہے۔ ڈھٹائی' بے مروتی' سنگ دلی' بدمعاملہ ہونا اور بدعہدی وغیرہ اصل میں بے حیائی ہی کے مختلف پہلو ہیں۔

تحمل کا بیان

حضرت معاذ بن انس جہنی انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے اپنا غصہ روک لیا جب کہ وہ غصہ (کے مطابق سختی) نافذ کرنے کی طاقت رکھتا تھا' اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب مخلوقات کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جون سی حور چاہے پسند کر لے۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ اپنے سے کمزور پر غصہ آئے تو اسے قابو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اصل بہادری یہی ہے کہ ایسے موقع پر غصہ نکالنے کے بجائے معاف کر دیا جائے۔

2۔ بعض نیکیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص انعامات مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ان انعامات کے حصول کی کوشش کرنا مستحسن ہے۔

3۔ حوریں اللہ تعالیٰ کی خاص مخلوق ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لیے پیدا کی ہیں۔

4۔ ہر جنتی کو حوریں ملیں گی لیکن غصے پر قابو پا کر ظلم سے اجتناب کرنے کی جزا کے طور پر خاص انعام دیا جائے گا۔ ایسے جنتی کو اپنی پسند کی حوریں منتخب کرنے کا حق دیا جائے گا۔

5۔ جنت کی نعمتوں اور جنم کے عذابوں کا تعلق صرف روح سے نہیں' جسم سے بھی ہے کیونکہ دنیا میں نیکی یا گناہ کرنے میں جسم اور روح دونوں شریک ہیں' اس لیے آخرت میں ثواب و سزا جسمانی بھی ہو گا اور روحانی بھی۔

حلم اور حیا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اشج عصری رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔
"تمہارے اندر دو خوبیاں ہیں جو اللہ کو پسند ہیں۔ حلم (بردباری) اور حیا۔" (مسلم)

غصہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"غصے کا وہ گھونٹ جسے کوئی بندہ اللہ کی رضا کے لیے پی لیتا ہے' اللہ کے ہاں اس سے بڑے ثواب والا کوئی گھونٹ نہیں۔" (احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ غصے کا گھونٹ پینے سے مراد غصہ ضبط کرنا اور غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا ہے۔
2۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل بہت پسند ہے کیونکہ وہ خود بہت زیادہ معاف کرنے والا اور گناہ بخشنے والا ہے۔
3۔ بہت سے جرائم محض غصے کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ اگر لوگ حلم اور بردباری اختیار کریں تو جرائم بہت کم ہو سکتے ہیں۔

غم اور رونا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تمہیں نظر نہیں آتا' اور میں وہ کچھ سنتا ہوں جو تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ آسمان چرچراتا ہے اور اس کا حق ہے کہ چرچرائے۔ اس میں چار انگلیوں کی جگہ بھی خالی نہیں مگر (بلکہ ہر جگہ) کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے اللہ کو سجدہ کر رہا ہے۔ قسم ہے اللہ کی! اگر تمہیں وہ کچھ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو تم تھوڑا ہنسو اور زیادہ روؤ' اور بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو سکو اور تم بہ آواز بلند اللہ سے فریاد کرتے ہوئے میدانوں میں نکل جاؤ۔"
اس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا۔
"قسم ہے اللہ کی! میرا جی چاہتا ہے (کاش!) میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت' جہنم اور آسمانوں کے حالات دکھا دیے تھے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تقویٰ اور خوف الٰہی کی وہ کیفیت حاصل تھی جو دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔
2۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق ہیں اور اللہ کی عظمت سے کماحقہ واقف ہونے کی وجہ سے وہ اللہ کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔
3۔ انسان کمزور اور محتاج مخلوق ہے' اسے خشیت کی زیادہ ضرورت ہے۔
4۔ سجدہ فرشتوں کی عبادت میں بھی شامل ہے اور یہ بندے کو اللہ کے قریب کرنے والا عظیم ترین عمل ہے۔
5۔ اللہ کے خوف کا تقاضا ہے کہ اس کی عظمت کا احساس کر کے اور اپنے گناہوں اور کمزوریوں پر نظر کر کے ندامت پیدا ہو' اور اللہ کے سامنے رو رو کر اس سے معافی مانگی جائے۔
6۔ آسمان بہت مضبوط مخلوق ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت کے احساس سے اس میں ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے کسی تخت یا کجاوے پر بہت زیادہ وزنی چیز رکھ دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ آسمان کا چرچرانا عقل کے خلاف نہیں لہٰذا اس کی تاویل کی ضرورت نہیں۔
7۔ حدیث کا آخری جملہ "قسم ہے اللہ کی! میرا جی چاہتا ہے...." مدرج ہے' یعنی یہ جملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی نہیں بلکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔

قرآن کی آیت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ان کے اسلام قبول کرنے کے صرف چار سال بعد یہ آیت نازل ہو گئی

تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہہ فرمائی۔
ترجمہ ”اور (اہل ایمان) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی' پھر ان پر ایک طویل مدت گزری تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔“ (الحدید۔16)

فوائد و مسائل:

1۔ ایمان لانے کے بعد اس کی حفاظت کی فکر کرنا بھی ضروری ہے۔
2۔ گناہوں کے ارتکاب سے دل سخت ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔
3۔ دل کی سختی کا علاج موت کی یاد' قرآن کی تلاوت اور یتیموں سے شفقت کا اظہار کرنا ہے۔

زیادہ ہنسنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”زیادہ مت ہنسو کیونکہ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ دل مردہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردہ انسان کو کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح غافل آدمی کو بھی اپنی آخرت کے نفع اور نقصان کا احساس نہیں ہوتا۔
2۔ دل جب مردہ ہو جائے تو اس میں نرمی کی جگہ سختی' رحم کی جگہ سنگ دلی اور انصاف کی جگہ ظلم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت ختم ہو جاتی ہے۔
3۔ خندہ پیشانی ایک اچھی عادت اور شرعاً مطلوب ہے لیکن ہر چیز سے بے پروا ہو کر ہر وقت ہنسی مذاق اور دل لگی میں وقت گزارنا غفلت اور مردہ دلی کی علامت ہے۔ دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا ضروری ہے۔

تلاوت کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔
”مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔“
میں نے سورۃ نساء تلاوت کی' جب میں اس آیت پر پہنچا۔
ترجمہ ”اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ حاضر کریں گے اور آپ کو اس امت پر گواہ بنا کر لے آئیں گے۔“ (النساء۔14)
(حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں) ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ جس طرح قرآن کی تلاوت بڑی نیکی ہے' اس طرح قرآن سننا بھی ضروری ہے۔
2۔ قرآن کی تلاوت کا دل پر ایک خاص روحانی اثر ہوتا ہے۔ کسی سے قرآن سننے سے یہ اثر زیادہ ہوتا ہے۔
3۔ قرآن کا ترجمہ سیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے تاکہ تلاوت کا دل پر صحیح اثر ہو سکے۔
4۔ قرآن مجید کی تلاوت یا سننے کا اصل مقصد اس کے مطابق اپنی زندگی بنانے کی کوشش ہے۔
حدیث میں مذکور آیت میں قیامت کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے اور قیامت خود ایک عبرت انگیز موضوع ہے۔ ضروری ہے کہ وعظ و نصیحت میں اس موضوع کو اہمیت دی جائے۔

قبر

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ہم ایک جنازے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے کنارے پر بیٹھ گئے اور اتنا روئے کہ مٹی تر ہو گئی۔ پھر فرمایا۔
"بھائیو! ایسی چیز (قبر) کے لیے تیاری کر لو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قبر آخرت کا پہلا مرحلہ ہے' اس کے لیے تیاری موت سے پہلے ہی ہو سکتی ہے' لہٰذا زندگی کے جو چند دن میسر ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
2۔ موت اور قبر کے مراحل یاد کر کے رونا اللہ کے خوف سے رونے میں شامل ہے کیونکہ وہاں اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو سزا ملے گی۔
3۔ مناسب موقع پر وعظ و نصیحت کے چند جملے کہنے میں حرج نہیں لیکن اس طرح کا رواج نہ بنا لیا جائے کہ لازمی جز سمجھ لیا جائے۔ جس طرح بعض حضرات جنازہ پڑھانے سے پہلے وعظ و نصیحت کرنا عملاً" ضروری سمجھ بیٹھے ہیں اگرچہ وہ اسے زبان سے ضروری نہ کہیں۔

عمل کو (غیر مقبول ہونے سے) محفوظ کرنا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:
میں نے کہا" اے اللہ کے رسول! (اللہ کا فرمان ہے) (المومنون 609) "وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جو دینا ہوتا ہے دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔" کیا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو زنا' چوری' اور شراب نوشی کا مرتکب ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"نہیں' اے ابو بکر کی بیٹی!"
یا فرمایا۔
"نہیں اے صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ آدمی ہے جو روزہ رکھتا ہے' صدقہ دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور اسے ڈر رہتا ہے کہ شاید (اس کا عمل) قبول نہ ہو۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ نیک اعمال کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے لیکن عمل پر بھروسا کر کے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔
2۔ بظاہر ایک صحیح عمل میں بھی ایسی خامی ہو سکتی ہے' جس کی وجہ سے وہ قبول نہ ہو۔
3۔ عمل کر کے اس کی قبولیت کے لیے بھی اللہ سے درخواست کرتے رہنا چاہیے۔
4۔ نیکی پر فخر کرنا جائز نہیں۔

اخلاص

حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عملوں کی مثال برتن کی سی ہے۔ اگر اس میں نیچے کا (پانی وغیرہ) اچھا ہو گا تو اوپر والا حصہ بھی اچھا ہو گا۔ اگر نیچے والا خراب ہو گا تو اوپر والا بھی خراب ہو گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اگر عمل کرتے وقت دل کی گہرائی میں خلوص ہو گا تو عمل اچھا اور قابل قبول ہو گا۔ اگر دل میں خلوص نہیں تو بظاہر اچھا نظر آنے والا عمل بھی حقیقت میں اچھا نہیں۔
2۔ برتن میں پانی پڑا ہوا ہو اور برتن کے نچلے حصے میں گندگی موجود ہو تو برتن کا سارا پانی اس سے متاثر ہو کر ناقابل استعمال ہو جاتا ہے' خواہ بظاہر اوپر والا پانی صاف محسوس ہو رہا ہو۔ عمل اور اخلاص کی یہی مثال ہے۔



کسی شخص کے ذاتی افکار و خیالات اور شخصیت کو جاننے کے لیے خط سے بہتر کوئی صنف نہیں بالخصوص ایسے خط جن کے بارے میں لکھنے والے کو گمان تک نہ ہو کہ کل کلاں یہ چھپ کر اس کے چاہنے والوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے خطوط میں جو بے ساختگی' سچائی' تعلق خاطر اور بے لاگ اظہار نظر آتا ہے۔ اس سے مصنف کی اصل شخصیت سامنے آتی ہے۔

انشاء جی جس طرح اپنے کالموں میں ہنستے مسکراتے ظرافت کے پھول کھلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط بھی ان کے کالموں کی طرح ان کی شوخی قلم کا ایک شاہکار ہیں' ان کی سسکتی ہوئی معطر تحریروں کی تمام رعنائیاں لیے ہوئے۔ ایک ایسا پہلو جس میں انشاء جی کی پوری شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ بہت پیاری بہت دل آویز شخصیت۔

ریاض احمد ریاض نے انشاء جی کے خطوط کا مجموعہ "خط انشاجی کے" نام سے ترتیب دیا... اس مجموعے سے کچھ خطوط آپ کی نذر کر رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے نام خط

انشاجی

۳ نومبر ۱۹۷۶ء

برادرم' سلام مسنون

امجد اسلام امجد کا خط آیا' جس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ساٹھویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔ مبارکباد تو قبول کیجیے لیکن آپ میرے لیے ۱۹۴۲ء والے ندیم ہیں' دھڑکنیں والے' چوپال والے' جلال و جمال والے۔ جواں سال اور جواں فکر' نہ صرف میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں بلکہ آپ واقعی ہیں۔ آپ کی فکر میں وہی جولانی اور جوانی ہے۔ میں ان لوگوں سے متفق نہیں جو آپ کی عمر کو ماہ و سال کے پیمانے میں ناپ کر آپ کو بزرگ کرنا چاہتے ہیں۔ خدا آپ کو بزرگی سے بچائے' تخلیقی معنوں میں آپ کے ہاتھ پاؤں چلتے رکھے... میں تھوڑے قدموں سے آپ کے پیچھے پیچھے ہوں' سنگ اٹھاتے ہوئے سرباد آتا ہے میں کسی ساٹھ سالہ احمد ندیم قاسمی کو نہیں جانتا' صرف اپنے پیارے ندیم کو جانتا ہوں ہمیشہ جواں' ہر دم جواں!

میں چند ماہ سے ایک عجیب عالم میں گزر رہا ہوں۔ اگست کے اوائل میں میرے گلے کے نیچے کچھ گلٹیاں نمودار ہوئیں۔ گلٹیاں بے ضرر بھی ہوتی ہیں لیکن یہ اور طرح کی تھیں اور جس جس ڈاکٹر نے دیکھا اس پر موذی مرض کا شبہ کیا۔ پیر حسام الدین راشدی کا کیس بالکل میرے سامنے ہو چکا تھا۔ ان کی گلٹیاں موذی تھیں' رسائی والے آدمی تھے۔ بھٹو صاحب سے کو معجون کو فون کرایا' کچھ پاک سوویت انجمن کے صدر وغیرہ بھی تھے' انہوں نے ماسکو کے بہترین اسپتال میں علاج کیا۔ کینسر تھا' آپریشن کیا... واپس آگئے ہیں' خدا انہیں زندہ اور تندرست رکھے' میں نے ہومیو پیتھی کا علاج کر رکھا تھا۔ پنڈی میں ڈاکٹر شفیق الرحمان نے دیکھا تو کہا فوراً "آپریشن کراؤ اور ان کو ٹیسٹ کراؤ' اگر یہ موذی ہوئیں تو مرض چند دن میں باقی جسم میں پھیل جائے گا۔ ان کے کہنے پر یہاں نیول اسپتال میں مجھے رکھا گیا۔ آپریشن ہوا' پانچ گلٹیاں نکالی گئیں' ان کا مختلف ماہرین نے تجزیہ کیا' یہ بے ضرر تو نہیں ہیں لیکن ضرر رسانی کی شدت اور نوعیت کے بارے میں ابھی بھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ کل اسپتال میں پھر میرے کئی



ٹیسٹ ہوئے' دوبارہ خون لیا' ایکسرے وغیرہ ہوئے' نمونے باہر بھی بھیجے گئے ہیں' امید ہے اس ہفتے کے آخر تک نتیجہ نکل آئے گا اور جو علاج یہاں بیرون ملک (حسب مقدرت) کرانا پڑا' وہ کرائیں گے۔ زندگی موت خدا کے اختیار میں ہے۔ لیکن میں نے اسے وارننگ سمجھ کر اپنے معاملات سمیٹنے شروع کر دیے ہیں۔ یہ قصہ سوائے دو تین قریبی دوستوں کے کسی کو معلوم نہیں۔ آپ سے ہمارا دل کا رشتہ ہے' دعا کا طالب ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی کسی سے ذکر نہ کریں۔ خدا کرے یہ وہ موذی مرض نہ ہو' کوئی ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو..... کوئی کمتر ہو جو قابل علاج ہو..... ورنہ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں..... زندگی میں خوشی' آسودگی' شہرت اور تخلیق کی طمانیت دیکھ لی' باہر کی دنیا کی سیر بھی کرلی' لواحقین بھی میری مدد کے محتاج نہیں رہے..... میں یہ آزردگی اور مایوسی کی باتیں کرنے کا عادی نہیں لیکن ان چند ماہ میں کئی بار اس کا دورہ پڑا۔ نوکری تو کر رہا ہوں لیکن لکھنا بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ میرا دوسرا مجموعہ جو اتنے دن سے رکا ہوا تھا۔ آگیا' تبصرہ ابھی تک اس پر کوئی نہیں آیا' آپ کو بھی فنون کے لیے کتاب نہ بھجوا سکا۔ آپ خود نہیں کر سکتے تو لاہور اکیڈمی سے کتابیں منگوالیں' کسی سے لکھوالیں۔

اسپتال قریب قریب ہر روز جانا پڑتا ہے' مجلسی زندگی ختم ہے۔ یقین ہے کراچی کے احباب یہاں بھی شایان شان نشست کریں گے اور میں یہاں ہوا تو ضرور شریک بھی ہوں گا۔ ایک منصبی کام کی کمیٹی میٹنگ کے لیے شاید آٹھ دس روز میں لاہور بھی آنا پڑے۔

آپ کا

ابن انشاء



۱۴ اپریل ۷۷ء

برادرم قاسمی صاحب

آنے کے بعد آج خط لکھ رہا ہوں۔ دراصل جب بھی کوئی مشکل وقت آتا ہے' آپ کی محبت یاد آتی ہے۔ آج پھر آپ کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کی ضرورت ہے۔

خیال یہ تھا کہ پاکستان میں میرا جو علاج ہوا' وہ کافی رہے گا اور یہاں معاملہ محض چیک اپ کا ہو گا لیکن یہاں کے ڈاکٹروں نے جو مشہور زمانہ ماہر اس مرض کے ہیں۔ مختلف ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ تمہارا آپریشن ہو گا اور تمہاری تلی یعنی Spleen نکالنی ہو گی۔ یہ آپریشن بھی اپریل میں ہونا تھا لیکن میں حیلے بہانے کرکے ٹال گیا۔ اب دوسری تاریخ ۱۹ اپریل دی ہے۔ جس کے لیے ۱۷ کو داخل اسپتال ہوں گا' یعنی اس خط کے ملنے تک میں وہاں ہو گا۔ سب کچھ ٹھیک رہا تو دو ہفتے میں چھٹی دے دیں گے لیکن تلی نکال کر اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ بقیہ عمر اس کے بغیر ہی گزرے گی۔ سنا ہے غصہ بھی تلی کے باعث آیا کرتا ہے' یہ نہ رہے گی تو غصہ بھی نہ رہے گا۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ اچھی بات ہو گی یا نہیں' کبھی کبھی غصہ تو آنا ہی چاہیے۔

آپریشن کا معاملہ دوستوں کو معلوم ہے۔ لیکن گھر والوں سے خفیہ رکھا ہے کہ ناحق پریشان ہوں گے۔ بیوی' بچے اور چھوٹے بھائی ریاض کو ۲۲ کو لندن آنا تھا' اب میں نے لکھ بھیجا ہے کہ فی الحال سردی ہے' مئی کے پہلے ہفتے میں آؤ۔ قدرتاً" یہ جی بھی چاہتا ہے کہ آپریشن کے موقع پر جو کافی بڑا آپریشن ہوتا ہے' یہ لوگ قریب ہوں۔ پھر سوچتا ہوں' ان کو کیوں مبتلائے فکر کروں۔ اپنا غم خود کیوں نہ کھاؤں۔ یہ لوگ میری مدد کیا کرسکتے ہیں..... پس یہ اطلاع بھی آپ تک۔

وہ فنون آیا کہ نہیں جس میں میری نظم شامل ہوئی تھی' آج رسالہ کتاب آیا جس میں فنون کے دو شماروں پر ریویو ہیں' جانے ان میں وہ شمارہ بھی ہے کہ نہیں۔ آپ میرے نام کا پرچہ کراچی ریاض کے پتے پر یعنی خواتین ڈائجسٹ اردو بازار کراچی کی معرفت بھیج دیں تاکہ وہ ساتھ لیتا آئے۔ اگرچہ یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس نظم پر ان لوگوں کی نظر نہ پڑے' پس بہتر یہ ہے کہ نہ بھیجیے یا عام ڈاک سے بھیج دیجیے۔ پتہ:

EMBASSY OF PAKISTAN.
IBNE INSHA O.S.D.
LONDONS.W.I.

اے کاش' آپ یہاں آئیں اور میرے ساتھ ٹھہریں۔

آپ کا
ابن انشاء

وطن کے حالات پڑھتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔

خدا خیریت سے اس منجدھار سے نکالے۔ فنون تو نہ سہی لیکن خط ضرور لکھیے اور اس بار اس پتے پر تاکہ مجھے کوئی اسپتال میں پہنچادے۔

♥ ♡ ♡ ♥

لندن ۳ جون ۷۷ء

برادرم

آج آپ کا خط ملا' بہت خوشی ہوئی' لیکن آپ نے لکھا ہے کہ پہلے بھی دو خط آپ نے بھیجے' وہ کیا ہوئے؟ کہاں گئے..... اسپتال میں ایک دو خط باہر کے مجھے ملے تو تھے لیکن آپ کا نہیں ملا۔ دوسرا خط آپ نے سفارت خانے یا گھر کے پتے پر لکھا ہو گا' وہ بھی گم ہو جاتا ہے اور لندن سے لندن یعنی لوکل خط بھی تین چار دن میں ملتا ہے' تا آنکہ آپ اس پر زیادہ ٹکٹ لگا کر اسے ارجنٹ نہ کریں۔

آپریشن ہو گیا' مرحلہ صعب یہی تھا' زخم کچھ خراب ہو گیا تھا' اس لیے پانچ ہفتے اسپتال میں رکھنا پڑا۔ ساری تکلیف اور ذہنی تشویش آپریشن سے پہلے ہی تھی' آپریشن کے بعد تو اطمینان ہوا کہ ہاں جو نکلنا

تھا وہ نکل گیا۔ بلکہ جو نہ نکلنا تھا وہ بھی نکل گیا' کسی کا بھینسا کنوئیں میں گر گیا تھا' اس نے کہا اچھا ہے' موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے خصی کرلو' ہماری تلی کے ساتھ انہوں نے اینڈکس بھی نکال دیا تاکہ بقیہ عمر میں اینڈے سائٹس کا دغدغہ نہ ہو' ایک دو اور چیزیں بھی نکالیں..... تشویش تو نہ رہی لیکن کمزوری واقعی ہوئی۔ کہاں میرا وزن ۱۷۵ اور ۱۸۰ کے درمیان ہوتا تھا اور کہاں اب ۱۴۰ سے نیچے ہے..... سارے سوٹ بے کار ہو گئے' خیر زیادہ نہیں تو ۱۵۰ یا ۱۵۵ تو ہونا ہی چاہیے۔

ہاں علاج کے دوسرے مرحلے ابھی باقی ہیں' چھ ماہ تک Chemo Thrapy یعنی کسی ڈرگ کے انجکشن' اس کے بعد وہی ظالم ریڈیو تھراپی۔ سینے سے نیچے کے پیٹ پر' اس کے اثرات بہت خراب ہوتے ہیں۔ خیر اس کی نوبت موسم سرما تک آئے گی۔

سچ ہے کہ آپ کے خط کا بہت انتظار رہا' یہ معلوم نہ تھا کہ آپ خود خط لکھ کر جواب کے منتظر ہوں گے۔ بیماری سے زیادہ فکر ملک کے حالات کی تھی' زیادہ خون تو خبریں سن کر گھٹتا تھا' خدا کرے اب بھی یہ اونٹ کسی اچھی کروٹ بیٹھے۔ آپ کا کالم کبھی کبھی یہاں کے ملت میں منقول ہو کر دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ جنگ میں شاید آج کل آپ نہیں لکھتے۔ بہر حال یہاں کے جنگ میں آپ کا کالم نہیں نظر آتا۔

فنون دیکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اپنی نظم دیکھنے کو جی نہیں چاہتا' اسی طرح میں اپنی وہ نامبارک غزل بھی سننے کا روادار نہیں۔ انشاجی اٹھو اب کوچ کرو..... کیونکہ وہ بات سچ ہو چلی تھی حالانکہ اس کے لکھنے کی تحریک اور وجوہ بالکل الگ تھے۔

فنون کا یہ کیجیے کہ سردار محمود کو بھجوا دیجیے' وہ ہوائی ڈاک سے لندن بھجوا دے گا' آخر برادر خورد ہے۔

سب ہی لوگ لندن آئے ہیں' آپ کو بلاوا ابھی ملتا ہے تو نہیں آتے۔ میرے خیال میں آنا چاہیے اور اب تو ضرور ہی آنا چاہیے۔ لندن سے باہر کہیں بھی رہیں' لندن میں اپنے گھر یعنی میرے پاس..... خاصی فراغت کی زندگی بسر ہو رہی ہے' اس لیے کہ فی الحال کام سے زیادہ آرام کر رہا ہوں۔ ویسے تو ساری عمر ہی کیا ہے۔

یاران سر پل کو ہمارا اسلام' خصوصاً'' اپنے خالد اختر کو' خالد احمد کو' عبداللہ قریشی صاحب کو' مستنصر کو' بالخصوص عطاالحق قاسمی کو اور امجد اسلام امجد کو بھی..... ان سب دوستوں نے میرے مرض کے دوران میری بڑی دلسوزی سے دلجوئی کی۔

اسپتال میں' میں نے فنون کے لیے ایک مضمون لکھنے کے لیے نوٹ لیے تھے' دیکھیے کب لکھتا ہوں اور کب بھیجتا ہوں۔

آپ کی دید اور تحریر کا منتظر

آپ کا
ابن انشاء

♥ ♡ ♡ ♥



کیا۔

"کیا حال ہے، جی؟"

"الحمدوللہ۔ آپ سنائیں۔"

"بالکل ٹھیک.... کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"آپ کو پتا ہے کہ جس فیلڈ سے وابستہ ہوں اس میں مصروفیات بھی ایسی ہوتی ہیں۔ ریڈیو FM سماء سے وابستہ ہوں۔ ڈان نیوز سے نیوز اینکر کے طور پر بھی کام کیا کچھ عرصہ اور ان شاء اللہ اسے کچھ عرصہ بعد دوبارہ جوائن کروں گی اور جناب مختلف چینلز سے جو "ترکش ڈرامے" آن ایئر ہوتے ہیں ان کی ڈبنگ میں بھی حصہ لیتی ہوں۔"

"ماشاء اللہ تمہاری آواز، تمہارے بولنے کا انداز بہت خوب صورت ہے، یہ تربیت کا نتیجہ ہے یا خدا کی دین ہے؟"

"اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اندر صلاحیتیں دیتا ہے، بس پھر اس کو جان کر اسے پالش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آواز خدا کا عطیہ ہے اور بولنے کا انداز بھی... گھر کا ماحول ایسا تھا جہاں اونچی آواز میں بات کرنا

تحریم منیبہ سے ملاقات

شاہین رشید

خوب صورت آواز کسی بھی انسان کے لیے اللہ کا تحفہ ہوتی ہے اور گلے میں سُر اللہ کا بہترین تحفہ ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ اس سُر کو حمد و نعت کے لیے استعمال کرے یا گانے کے لیے، کچھ لوگ سُروں کی دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں جہاں انہیں ہر وقت موسیقی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور کچھ لوگ ایسے گھروں میں آنکھ کھولتے ہیں جہاں انہیں حمد و ثنا کی میٹھی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

تحریم منیبہ، معروف نعت گو منیبہ شیخ کی بیٹی ہیں۔ ربیع الاول کے موقع پر ہم نے اس بار ان کا انتخاب

معیوب سمجھا جاتا تھا سو مجھے بھی دھیمے لہجے میں بولنے کی عادت ہوگئی اور یہ سب میری امی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔"

"آج کل تو ربیع الاول کی بھی مصروفیات ہوں گی؟"

"چونکہ نعت خوانی میرا پیشہ نہیں ہے اس لیے خواہ رمضان المبارک ہو۔ ربیع الاول ہو یا سال کا کوئی بھی مہینہ ہو۔ میں اپنے آپ کو مستقل مصروف نہیں کہہ سکتی، میں بہت کم گھروں میں میلاد پڑھتی ہوں کوئی جاننے والے ہوں یا کوئی بہت قریب کے رشتے دار




ہوں تو میں میلاد پڑھنے چلی جاتی ہوں ورنہ عموماً" میں گھر کے میلاد نہیں پڑھتی۔ کمرشل ریزن کی وجہ سے ایک تو لوگ بالکل ہی عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ عجیب طرح کا ان کا معیار ہوتا ہے وہ کیا سننا پسند کرتے ہیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔ اس لیے گھر کے میلاد عام لوگوں میں نہیں پڑھتی۔"

"لوگ مطلب نعت خواں' سب نہیں مگر اکثریت اس ماہ کو سیزن کہتی ہے۔ تو سیزن ہو تو پھر پیسے بھی ہوتے ہیں.... تم ہدیہ لیتی ہو یا ڈیمانڈ کرتی ہو اگر کہیں جانا پڑے تو؟"

"پیسے مانگنے میں میرے خیال سے کوئی برائی نہیں ہے۔ آپ مولوی صاحب کو پیسے دیتے ہیں جو ٹیچر آپ کو پڑھانے آتا ہے' آپ اس کو پیسے دیتے ہیں اگر کسی کی آواز اچھی ہے اور وہ آپ کے لیے ٹائم نکال کر آپ کے گھر آ رہی ہے تو اس کا حق ہے۔ اگر آپ افورڈ نہیں کر سکتے تو مت بلائیں اسے اپنے گھر' آپ کو بھی شوق ہے کہ آپ مشہور نعت خواں کو بلائیں لوگوں کے آگے بھرم بھی ماریں اور پھر اسے پیسے بھی نہ دیں تو یہ تو زیادتی والی بات ہے اور پیسوں پہ اتنا ہی اعتراض ہے تو پھر شامیانے لگا کر اسٹیج بنا کر اور مائیک لگا کر اتنا اہتمام بھی نہ کریں۔ کھانا بھی نہ کھلائیں تو پھر یہ دکھاوا بھی نہ کریں۔ جہاں تک میری بات ہے تو اول تو میں اس طرح میلاد پڑھتی نہیں اور جن قریبی لوگوں کے یہاں پڑھتی ہوں ان سے مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں جہاں مجھے نہیں جانا ہوتا وہاں میں پیسے مانگ لیتی ہوں۔ اور ہاں یہ بات ضرور ہے کہ لوگ پیسے دیتے ہیں' محبت سے دیتے ہیں۔ بہت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے پیشہ نہیں بنایا۔ میں میڈیا پرسن ہوں جہاں سے مجھے میری محنت کا بہت اچھا صلہ مل جاتا ہے۔"

"کب سے نعت خوانی کر رہی ہو؟ اس سوال سے پہلے تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ....؟"

"جی میں آپ کو بتاتی ہوں۔ میں 21 جون 1989ء میں کراچی میں پیدا ہوئی' میری والدہ منیبہ شیخ ہیں اور میں اپنے نام کے ساتھ اپنی امی کا نام اس لیے لگاتی ہوں کہ قیامت کے دن ہم اپنی ماں کے نام سے اٹھائے جائیں گے۔ میرے والد سینئر آڈیٹر ہیں۔ درحقیقت میری امی میری خالہ ہیں اور انہوں نے مجھے میرے بچپن میں ہی گود لے لیا تھا۔ میری امی منیبہ شیخ صاحبہ نے ماشاء اللہ سے تین ماسٹرز کیے ہوئے ہیں اور میں نے "سی اے" کیا ہوا ہے اور آپ کو بلکہ سب کو معلوم ہے کہ میں براڈ کاسٹر بھی ہوں۔ وائس اوور بھی کرتی ہوں۔ ڈراموں کی ڈبنگ میں بھی حصہ لیتی ہوں۔ ہمارا تعلق انڈیا سے ہے اور میری خالہ بچوں کی مسلم لیگ کی سربراہ تھیں اور مسلم لیگ کے ہیڈ کوارٹر ہمارے ہی گھر ہوا کرتے تھے۔"

"اب بتاؤ کہ کب سے نعت خوانی کر رہی ہو؟ اور کب آواز کی خوب صورتی کا احساس ہوا؟"

"میں جب ڈھائی سال کی تھی تب سے نعت خوانی اور تلاوت کر رہی ہوں اور آواز کی خوب صورتی کا احساس یہی کوئی ڈیڑھ دو سال قبل ہوا اور اللہ کا کلام پڑھنے کی جو سعادت حاصل ہوئی' وہ اللہ کا احسان ہی تھا اور اتفاق ہی تھا۔ خود کبھی کوشش نہیں کی' اللہ پاک نے ہی ذریعہ بنایا' اور ظاہر ہے کہ کم سنی سے تلاوت اور حمد و نعت پڑھ رہی ہوں تو تب امی نے ہی احساس دلایا ہوگا کہ تم میں یہ صلاحیت ہے۔ خود سے احساس تو بس کچھ ہی عرصہ قبل ہوا ہے جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا۔"

"کچھ یاد ہے کہ پہلی نعت کب اور کہاں پڑھی تھی؟"

"پہلی نعت جب میں ڈھائی سال کی تھی تو ریڈیو پاکستان سے پڑھی تھی۔ فارسی کا کلام تھا "جان محمد قدسی" نے لکھا تھا "مرحبا سید مکی مدنی" امی بتاتی ہیں کہ لوگ حیران تھے کہ ڈھائی سال کی بچی نے فارسی کی نعت پڑھ ڈالی۔ اتنی واہ واہ ہوئی تھی کہ آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں الحمدللہ۔"

"کہاں کہاں اپنی آواز کا جادو جگایا.... کبھی سرکاری

سطح پہ بھی بلاوا آیا؟"

"جی بالکل آیا۔ ایوان صدر میں میلاد پڑھا تین بار' اپنی امی کے ساتھ گئی تھی۔ باقاعدہ دعوت آئی تھی وہاں سے۔۔۔ حکومت سندھ نے بہترین نعت خواں کا ایوارڈ دیا جب میں سترہ سال کی تھی۔۔۔ سندھ کی بہترین نعت خواں کا ایوارڈ بھی ملا۔"

"کبھی گلوکاری کی طرف رجحان ہوا؟"

"گلوکاری اور نعت خوانی میں صرف موضوع کا فرق ہے' آواز تو وہی ہوتی ہے۔ منع تو کسی نے نہیں کیا لیکن میں خود ہی اس جانب نہیں آئی کہ جو کام امی نے نہیں کیا وہ میں کیوں کروں۔۔۔ اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا رتبہ دیا ہے تو اس کے بعد تو میں گلوکاری کی طرف آنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ویسے میں بڑے بڑے برانڈز کی وا ئس اوور کر چکی ہوں۔ میں نے جنگلز بھی گائے ہیں اور یہ میرا شوق ہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔"

"حمد و نعت میں کلام کا انتخاب آپ کرتی ہیں یا امی کر کے دیتی ہیں؟"

"امی نے اساتذہ کے کلام پڑھے میں بھی ان ہی کے کلام پڑھتی ہوں۔ کسی خاص بندے یا شاعر کا مجموعہ لے کر خود سے کلام کا انتخاب نہیں کرتی اور اب چونکہ میں ایک مختلف انداز سے حمد و نعت پڑھنا شروع کر رہی ہوں للہٰذا خود ہی حمد بھی لکھتی ہوں اور نعت بھی۔"

"زیادہ مصروفیات تو رمضان المبارک میں ہی رہتی ہوں گی جب تم کسی نہ کسی چینل پہ لائیو پروگرام بھی کر رہی ہوتی ہو؟"

"جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے' رمضان میں تو ہم ٹی وی پہ ہی ہوتے ہیں ایک سحری یا روزہ افطار کرنے کا گھر پہ موقع ہی نہیں ملتا۔۔۔ اور چونکہ ریڈیو پہ بھی کرتی ہوں پروگرام تو کبھی ریڈیو کبھی ٹی وی' بس ان ہی دو جگہوں پر سحری اور افطار ہوتا ہے' ہاں عید کا مزہ آتا ہے کیونکہ پورا مہینہ بڑا لطف گزرتا ہے تو پھر عید واقعی عید ہوتی ہے اور عید تو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی گزارتی ہوں۔"

"نعت خوانی کو پیشہ کہنا درست ہے؟"

"نعت خوانی نہ پیشہ ہے نہ تھا اور نہ ہی کبھی بن سکتا ہے۔ محبت رسول کے ذریعے آپ نے کبھی پیسے مانگ لیے۔ آپ کو کبھی مل گئے۔ ٹھیک ہے جائز ہے۔ آپ کے پاس آواز ہے لیکن اس کو پیشہ بنا کر پیسہ کمانا۔۔۔ تو یہ بات تو سننے میں بھی اچھی نہیں لگتی۔۔۔ ویسے ایک بات کہوں جو اس کو فیلڈ' پیشہ کہتے ہیں تو اس سلسلے میں سیاست بہت ہے اور چونکہ میں سیاست سے دور بھاگتی ہوں تو نہ ہی میری دوستیاں ہیں' نہ ہی میری اتنی جان پہچان ہے اور نہ ہی میں پیشہ وارانہ انداز میں نعت خوانی کرتی ہوں۔ میں ایسی بہت کم جگہوں پہ آپ کو نظر آوں گی۔ ٹی وی پر بھی کم نظر آوں گی تو اگر آپ چوبیس گھنٹے ٹی وی پہ رہ کر نعت پڑھنے والی پرسنالٹی بننا چاہ رہی ہیں تو میں تو کبھی بھی اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔ پھر سیاست اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ محبت ایک کنارے لگ جاتی ہے۔"

"انٹرنیٹ اور فیس بک کی وجہ سے مطالعہ کی عادت کم ہو گئی ہے۔ کیا آج بھی میگزین کی اہمیت ہے یا ختم ہو گئی ہے؟"

"آج کل کے دور میں لوگ انٹرنیٹ پہ گھنٹوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں مگر کام ایک روپے کا نہیں کرتے۔ تو ایسے موقع پر میگزین کم وقت میں کام کی بات ڈیلیور کرنے میں ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ بہت سے ذرائع ابلاغ میں میگزین اور ڈائجسٹ بہترین ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح کے میگزین خواتین کو وہ مواد فراہم کرتے ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے اور شاید اس کا انہیں علم بھی نہیں ہے۔ خواتین اور لڑکیوں کو میرا ایک ہی مشورہ ہے جہاں رہیں جیسے رہیں' پڑھیں۔۔۔ پڑھیں۔۔۔ پڑھیں اور بس پڑھیں۔ نان کے نیچے رکھے ہوئے اخبار کو بھی پڑھیں' آپ کو نہیں معلوم کہ کب معلومات کا کوئی حصہ آپ کو مل جائے اور زندگی میں آپ کے کام آئے' صحیح معنوں میں تعلیم ہی انسان کا زیور ہوتی ہے۔"

"نعت خوانی تو ماشاء اللہ ڈھائی سال کی عمر سے کر

رہی ہو۔ ریڈیو جوائن کرنے کا خیال کیسے آیا؟"
"ریڈیو جوائن کرنے کا تو بالکل بھی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا۔ 2009ء کی بات ہے میں ریڈیو کے موضوع پر ایک آرٹیکل لکھ رہی تھی اور اس آرٹیکل کے سلسلے میں ایف ایم 100 جانے کا اتفاق ہوا۔ بزنس منیجر صاحب سے کچھ سوالات کرنے تھے۔ انٹرویو کے اختتام پر جب میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا کہ آپ بطور براڈ کاسٹر ہمارے یہاں کام کریں اور کہا کہ آپ پیر کے دن آجایئے گا۔ میں نے کہا اچھا سوچتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو آنا ہے۔ تو جناب چونکہ ان دنوں تھوڑی فراغت بھی تھی تو میں چلی گئی انہوں نے مجھے ویلکم کیا اور کہا کہ آپ کو مبارک ہو آپ کی جاب پکی ہو گئی ہے۔ حیران بھی تھی اور خوش بھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ کچھ عرصہ یہاں کام کیا۔ پھر ایف ایم 105 کو جوائن کیا اور اب ایف ایم "سماء" کے ساتھ ہوں۔"
"اسکرپٹ لکھتی ہو؟"
"بولنے کی عادت تو ہمیشہ سے ہے اور اب تو اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ اس کے لیے مجھے کسی اسکرپٹ کی ضرورت ہی نہیں ہے اور آپ چاہیں گہری نیند سے اٹھا کر پروگرام کرنے کے لیے کہہ دیں میں بہت آسانی کے ساتھ پروگرام کرلوں گی اور جب ٹی وی کے لیے پروگرام کر رہی ہوتی ہوں تو اس کے لیے بھی اسکرپٹ نہیں لکھتی۔"
"مزاجاً" کیسی ہو؟"
"خود سے کیا بتاؤں۔ میرے بارے میں تو دوسرے لوگ زیادہ بہتر طریقے سے بتا سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں اپنے بارے میں اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ دوسروں کو خوش رکھنا ہنسنا ہنسانا میری فطرت کا حصہ ہے اور یہ کہ غصے کی تیز ہوں مگر اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ میں اپنے غصے پہ قابو پالیتی ہوں۔"
"مگر کبھی تو غصہ باہر آتا ہی ہوگا؟"
"ہنستے ہوئے۔ جب کوئی بہت زیادہ غصہ دلاتا ہے تو پھر غصہ باہر نکالنا ہی پڑتا ہے۔ مگر کس طرح... خاموش ہو جاتی ہوں یا پھر رونے لگتی ہوں اور اپنے آپ کو بالکل اکیلا کر لیتی ہوں اس لیے میرے غصے کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اپنے کمرے میں زیادہ وقت گزارتی ہوں۔"
"مصروفیات میں گھرداری تو بے چاری رہ ہی جاتی ہوگی؟"
"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو کام نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔ مجھے تو گھرداری سے بہت لگاؤ ہے اور میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی ٹائم ضرور نکال لیتی ہوں۔"
"مثلاً" کیا کیا کرلیتی ہو؟"
"مثلاً" کپڑے دھونا اچھا لگتا ہے۔ اور داغ دھبے کہیں پر ہوں خواہ کپڑوں پر ہوں۔ شیشے کی ٹیبل پر ہوں یا فرنیچر پر انہیں برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی پہلی فرصت میں صاف کرتی ہوں روز کھانے پکانے کا بھی بہت شوق ہے۔"
"اچھا گڈ... ہاتھ میں ذائقہ ہے؟"
"جی الحمدللہ بہت ذائقہ ہے جو بھی بناتی ہوں سب پسند کرتے ہیں اور شوق سے کھاتے ہیں۔"
"کھیل سے سیاست سے لگاؤ ہے؟"
"کھیل سے تو بہت زیادہ لگاؤ ہے اور اگر آپ میرا پروگرام سنیں تو میں کھیلوں سے متعلق کافی خبریں بھی سناتی ہوں باتیں اور تبصرہ بھی کرتی ہوں اور مزے کی بات یہ کہ کرکٹ میچ کے دوران سامعین کو تسلیاں بھی دیتی ہوں کہ اگر ہم ہار جائیں تو دل پہ مت لے لینا۔ ہار جیت تو زندگی کا حصہ ہے اور جہاں تک سیاست کی بات ہے تو اس کھیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پاکستان کی سیاست میں حصہ لینا یا دل لگانا گویا اپنا وقت برباد کرنا ہے۔ اس لیے مجھے تو معاف ہی رکھیں سب۔"
"اور کچھ کہنا چاہو گی؟"
"نہیں بس اپنی بہنوں سے یہ ضرور کہوں گی کہ اپنے آپ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ضرور کریں اور کوئی نہ کوئی ہنر بھی سیکھیں۔"
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے تحریم منیبہ سے اجازت چاہی۔

وقت شطرنج ہے۔
جس کی چالوں کو گننا ستاروں کے گننے سے کم نہیں۔
اور ہمارا سفر۔۔۔ یہ ازل سے ابد تک کا سارا سفر۔
ان ہی چند خانوں کی گردش میں ہے ان سے باہر نہیں۔
لاکھوں کروڑوں سال پرانی یہ دنیا۔۔۔ اور ازل سے ابد تک کا لامتناہی سفر۔ انسان نے شمس و قمر کو مسخر کرلیا ہے۔ ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے۔ موسموں کو تابع کرلیا ہے لیکن وقت کی گتھی کو نہیں سلجھا پایا ہے۔

بڑے چرچے ہیں اس آگہی کے
مگر انسان ابھی کیا جانتا ہے

وقت اپنے نقش چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور انسان کا سرمایہ کچھ بکھری تصویریں، کچھ گم گشتہ مسکراہٹیں اور کچھ دھندلی یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔
2015ء کا اختتام ہوا ایک اور نیا سال نئی امیدوں، آرزوؤں کے ساتھ دستک دے رہا ہے۔ ہم نے اپنی قارئین سے گئے سال اور آنے والے سال کے حوالے سے کچھ سوالات کیے ہیں جو کچھ یوں ہیں۔
(1) گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟ کوئی امید، کوئی سوچ، کامیابی یا ناکامی؟
(2) ملکی حوالے سے اور ذاتی حوالے سے کوئی خواہش جو آپ چاہتی ہیں اس سال پوری ہو جائے؟
(3) اس سال آپ نے کوئی کتاب پڑھی؟ یا ٹی وی پر پروگرام دیکھا، اس نے آپ کی سوچ کو نیا رخ دیا۔ کوئی خوبصورت جملہ یا اقتباس لکھیں؟
(4) منیر نیازی نے کہا تھا "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" کوئی ایسی بات، کوئی ایسا کام جسے آپ نے کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا اور پھر کر نہ پائیں، کوئی ایسی بات جو کہنی تھی مگر بقول منیر نیازی دیر کردی، اس پر پچھتاوا ہے؟
آئیے دیکھتے ہیں کہ ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں

یادیں یاد آتی ہیں

ادارہ

مہناز یوسف۔۔۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

1۔ دینے اور لینے کا سلسلہ تو ہر سال چلتا ہی رہتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ مجھے دیتا زیادہ ہے اور مجھ سے لیتا جو کچھ بھی ہے اس میں بھی اس مالک دوجہاں کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سال 2015ء میں کچھ خاص تو نہیں کھویا اللہ کا شکر ہے۔ اس سال میں نے بہت بڑی خوشی پائی یعنی کہ بچپن کی عمر کا خواب پکی عمر میں پورا ہو گیا۔ (قاری بہنیں، مجھے ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے تصور نہ کریں۔) یعنی کہ میری پہلی کہانی "چھوٹی بند" اگست 2015ء میں شعاع میں شائع ہوئی۔ بس جناب کچھ نہ پوچھیے کہ اگست کا مہینہ کیسا گزرا، ہر وقت لبوں پر دھیمی مسکان رہتی جیسی کہ ہماری ہیروئن کے لبوں پر اس وقت ہوئی جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اگست کے پورے مہینے مجھے غصہ نہیں آیا۔ چاہے مجھے نعیم (میرے شوہر) ڈانٹیں یا بچے پریشان کریں، غصہ ہی نہیں آرہا تھا۔ مجھے شعاع نے بہت بڑی خوشی دی۔ میرا خیال تھا کہ





خواتین والے تو سالوں نئے لوگوں کو لائن میں لگائے رکھتے ہوں گے کہ بڑے لوگ ہیں مگر خواتین والوں نے محض چند ماہ بعد میری کہانی شائع کر کے یہ بتا دیا کہ واقعی یہ بڑا اور آرگنائزڈ ادارہ ہے۔ نئے لوگوں کی پذیرائی میں بھی یہ آگے آگے ہے۔ نومبر 2015ء میں میری دوسری کہانی ''تو میرا ہیرو'' شعاع میں شائع ہو گئی' سو یہ سال مجھے دو بڑی خوشیاں دے گیا۔

2 ۔ ملکی حوالے سے تو یہ چاہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ارض پاک کو اس سال دہشت گردی سے پاک رکھے۔ لوڈشیڈنگ مکمل طور پر ختم ہو جائے' میرا وطن ترقی کرے بہت زیادہ ترقی کرے۔ (آمین) ذاتی حوالے سے میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو مطمئن کر دے۔ منفی سوچوں سے میرے ذہن کو آزاد کر کے میرے دل میں سب کے لیے وسعت پیدا ہو جائے۔ میں دوسروں کے لیے اگر خوشی کا سبب نہ بن سکوں تو دل آزاری کی وجہ بھی نہ بنوں اور ایک اور بہت بڑی خواہش کہ اگلے سال میری زیادہ سے زیادہ کہانیاں خواتین کی زینت بنیں۔ (آمین)

3 ۔ اس سال ٹی وی بہت کم دیکھنے میں آیا۔ ہاں پڑھنے اور لکھنے پر نسبتاً'' زیادہ زور رہا۔ اکتوبر 2015ء میں ''دمکل'' میں لکھا ہوا ایک جملہ نمرہ احمد کا بہت اچھا لگا۔

''اور اگر تم سے کوئی بھی کہے کہ انسان کی 'کی گئی' نیکی گھوم پھر کر اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتی ہے تو یقین کر لینا' کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔''

4 ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کسی بھی کام میں اتنی دیر نہیں کی کہ پچھتاوا ہو' ہاں تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو جاتی ہے' میں اپنے دل کی ہر بات جس کے ساتھ شیئر کرنا چاہوں باآسانی کر لیتی ہوں لیکن جب میں حیدر آباد لطیف آباد کے اپوا اسکول میں پڑھتی تھی۔ چھٹی کلاس سے لے کر آٹھویں کلاس تک میری کلاس میں ایک لڑکی صنم پڑھتی تھی' وہ بہت خوب صورت اور ذہین تھی' میری خواہش تھی کہ میں اس سے دوستی کر سکوں لیکن اس وقت میں بہت زیادہ دبو اور کم گو ہوا کرتی تھی اور دوسروں سے بات کرنے میں بھی کافی جھجکتی تھی۔ میری صرف ایک ہی سہیلی تھی جو کہ میرے محلے میں ہی رہتی تھی سو میں صنم سے کبھی نہیں کہہ پائی' میں اس سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ اب تو اس کا چہرہ بھی میرے ذہن سے نکل چکا ہے مگر اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں اس سے کیوں نہیں کہہ پائی۔ صنم ہماری ہوم اکنامکس کی ٹیچر کی چھوٹی بہن تھی۔

نادیہ علی.... کراچی

1 ۔ امید پہ دنیا قائم ہے اور ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

اور کامیابی' ناکامی گئے سال کے حوالے سے یوں خاصی اہم رہی کہ میں نے سال گزشتہ میں نویں اور دسویں کے پرچے دیے۔ پانچ مہینے انگلش کی تیاری کے بعد انگلش کے ایک پیپر میں کامیاب اور ایک میں ناکام رہی۔ (انگلش بالکل بھی پڑھنی لکھنی نہیں آتی تھی پھر بھی....) اور اردو مطالعہ میں بہترین نمبروں سے کامیاب ہوئی' صرف ایک دن کی تیاری کے بعد.... (اردو اپنی قومی اور مادری زبان





ہونے کی وجہ سے اچھی ہے نا۔) یہی سال گزشتہ کی کامیابی اور ناکامی ہے۔

2 ۔ذات کے حوالے سے ایسی کوئی خاص خواہش نہیں ہے۔ہاں مگر ایک گھر جس میں ہم پندرہ سال سے رہ رہے ہیں' وہ خریدنے کی خواہش ہے۔ اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں کہ گھر خریدنے کے اسباب بنائے۔

اور ملکی حوالے سے خواہش یہی ہے کہ ہم غیروں کے حکم پر فیصلے کرنے کے بجائے خود اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر فیصلے کریں۔

اور یہ کہ اس سال الیکٹرونک میڈیا کو لگام ڈالی جائے۔ یہ خواہش اس سال پوری ہو گئی تو ہم بھی باوقار قوموں کی طرح سے جی سکیں گے۔

3 ۔ٹی وی بہت کم دیکھتے ہیں کہ ٹی وی پر وہی روز کا ایک ہی موضوع اور روز کے لڑائی جھگڑے۔ٹی وی کے پروگرام دیکھ کر سوچ تو نہیں بدلتی۔ہاں پڑھے لکھے اور معتبر لوگوں کو جاہلوں کی طرح لڑتے دیکھ کر افسوس اور بے بسی ضرور ہوتا ہے۔کتاب سے رشتہ صرف خواتین' شعاع' کرن کی حد تک قائم ہے۔

عہد الست نے ہماری سوچ کو ایک نہیں کئی نئے رخ دیے۔بلاشبہ عہد الست ایک بے مثال' شاہکار اور لازوال ناول ہے۔یہ میرا سب سے پسندیدہ ناول قرار پایا۔میں نے اپنی مما کو بھی سنایا' ان کو بھی بہت پسند آیا اور وہ سن کر نور محمد کے دکھ پر بہت زیادہ روئیں بھی۔اسی لیے اقتباس بھی اپنے اسی پسندیدہ ناول سے....

''اچھا کیا ہو گا پاکستان تباہ ہو جائے گا۔ختم ہو جائے گا؟'' تحقیر ابھی بھی انداز میں تھی۔سلمان کو اپنا خون ابلتا محسوس ہوا۔پاکستان اس کی دکھتی رگ تھی اور رگ بھی وہ جسے شہ رگ کہتے ہیں۔ شہ رگ.... جہاں اللہ بھی بے حد قریب محسوس ہوتا ہے۔''

''یہ تو مر کر بھی کبھی نہیں ہو گا.... ساری دنیا مل کر بھی آجائے تو وہ ہیرے' جو اس مٹی میں موجود ہیں.... ایسا ہونے نہیں دیں گے ہم جیسے پاکستانی رہیں یا نہ رہیں سر۔پاکستان رہتی دنیا تک رہے گا' ان شاء اللہ سر.... اللہ کے نام پر دی ہوئی چوٹی ضائع نہیں ہوتی۔ملک کیا ضائع ہوں گے سر.... یہ ملک دنیا سے ہم نے اللہ کے نام پر لیا ہے.... آپ اور میں یہ بات بھول بھی جائیں تو اللہ کبھی نہیں بھولے گا۔''

(عہد الست پڑھ کر یہ بھی سوچا کہ کاش نور محمد کی طرح کوئی ڈاکٹر عافیہ کے لیے بھی اسی طرح سے کوشش کرے اور ان کو بھی رہائی ملے۔)

4 ۔دیر تو ہمیشہ منیر نیازی ہی کرتے ہیں۔بھئی خود کہہ رہے ہیں ہمارا کیا قصور ہے۔ہم تو ہمیشہ ہر کام وقت سے پہلے کرنے کے عادی ہیں۔ایسا کوئی کام نہیں جو میں نے ٹالا ہو اور نہ کر پائی ہوں۔ہاں قرآن پاک کو تفسیر سے پڑھنے کی خواہش تھی جواب میں شروع کر چکی ہوں۔نہیں ایسی کوئی بات نہیں جو میں نہ کر پائی ہوں۔

مسرت الطاف احمد.... کراچی

1 ۔جاتا سال میرے لیے بہت ساری خوشیاں' کامیابی اور امیدیں دے کر گیا' یہ سال میری ذاتی زندگی کے حوالے سے بہت لکی رہا' کچھ کر دکھانے کا جنون شروع سے

تھا۔ گیارہ اپریل کو مجھے جاب کی آفر ہوئی جو میرے لیے بہت ہی سرپرائزنگ تھا۔ اسی سال بیس نومبر کو میں نے قیمتی موبائل اپنی پاکٹ منی سے لیا' ورنہ اس سے پہلے امی اور ابو ہی لے کر دیتے تھے' سال کے اختتام میں ہی میری سسٹر صائمہ الطاف کا رشتہ پکا ہوگیا۔ چھ دسمبر کو ہلکی پھلکی تقریب میں انگیج منٹ کا بھی اہتمام کیا گیا' ہم نے بہت انجوائے کیا اور خواتین ڈائجسٹ کے حوالے سے بھی یہ سال میرے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ چھوڑ گیا۔

2 ۔ ملکی حوالے سے ایسی بہت سی خواہشیں ہیں جو اگر اس سال نہ سہی اگلے سال ہی پوری ہوجائیں تو معجزے سے کم نہیں ہوگا۔ میڈیا کی بے جا آزادی' بجلی کی فراہمی' پانی رہے پانی (جو مینڈولین میں ایک ایک مہینے کے بعد آتا ہے۔) سیوریج کا نظام اور جرائم پیشہ عناصر نے عوام کا جینا محال کردیا ہے۔ ہمارا ملک اچھا ہے تو ہماری وجہ سے ہے' یہ برا ہے تو ہماری وجہ سے۔۔۔ ذاتی حوالے سے ایک نہیں' ایسی بہت ساری خواہشیں ہیں جنہیں ابھی پورا کرنا ہے۔ اندر بہتر سے بہترین اور آگے بڑھنے کی خواہش ہے' اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا ہے۔

3 ۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی میرے مشاغل میں سرفہرست شعاع' خواتین' ڈائجسٹ کا مطالعہ کرنا رہا' کیونکہ میں ٹی وی بہت ہی کم دیکھتی ہوں ——

—— شعاع اور خواتین کی تحریریں ہی اتنی سبق آموز اور متاثر کن ہوتی ہیں جو ہماری سوچ کو نیا رخ دیتی ہیں' یہ خوب صورت جملہ جس نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا۔ عمیرہ احمد کے ناول "آب حیات" سے۔

"ذلت جب بھی میرا مقدر بنی تب میرے فیصلوں' میرے انتخاب سے بنی ہے' میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا' پھر اگر اللہ مجھے عزت نہیں ذلت دے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کروں گا لیکن میں دنیا میں کسی اور شخص کے سامنے نہ جھکوں گا۔۔۔ نہ کمپرومائز کروں گا۔"

4 ۔ میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتی اور نہ ہی اس بات کا کوئی خاص پچھتاوا ہوا ہے۔ البتہ ایسے بہت سے کام ہیں جو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیتی ہوں لیکن کرتی ضرور ہوں ادھورا نہیں چھوڑتی۔

کائنات خالد۔۔۔ کراچی

1 ۔ یہ بات تو سچ ہے کہ سال آتا ہے تب بھی کچھ امید' سوچ وغیرہ لاتا ہے لیکن ناکامیاں' دکھ وغیرہ بھی دے جاتا ہے۔ اب کی بار مجھے گیا سال سوچ تو بہت بڑی دے کے گیا ہے اور وہ ہے لوگوں کے "رویوں میں تبدیلی" اب کے سال بہت سی خوشیاں ملیں مگر وہ لوگ جو ہماری خوشیوں میں پیش پیش رہتے تھے' اب ہم سے ایسے ہوگئے ہیں کہ جیسے ہم ان کے کچھ بھی نہیں۔

2 ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

آپ کے اس سوال کے جواب میں بے ساختہ یہ شعر ذہن میں آیا' ملکی حوالے سے اور ذاتی حوالے سے بہت سی ایسی خواہشیں ہیں جن کے پورے ہونے کے آثار تک







میں ہیں لیکن ''امید پہ دنیا قائم ہے'' ملکی حوالے سے سب سے بڑی خواہش ہے کہ جو بھی ہمارا حکمران ہو وہ ملک میں حجاب کو عورتوں کے لیے نافذ کردے۔ (حجاب بھی ایسا جس میں لگے کہ عورت واقعی حجاب میں ہے اور خاص طور پہ چہرہ کا حجاب) ذاتی حوالے سے خواہش ہے ''ایم اے کرنے کی'' (حالات کی وجہ سے امی اجازت نہیں دیتیں۔) میرا جنون ہے کہ میں پڑھوں مگر.... آپ سب سے درخواست ہے کہ دعا کریں کہ اگر میرے حق میں بہتر ہے تو میں پڑھوں....(ویسے امی کہتی ہیں کہ پرائیویٹ کرلو' مگر میں ریگولر کرنا چاہتی ہوں۔ ابو درمیان میں بے بس ہیں۔)

3 ۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سوال کا جواب کس طرح دوں' وہ اس لیے کہ رسالے' کتابیں وغیرہ بہت پڑھتی ہوں' بچوں تک کے رسالے بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ (ویسے میں اتنی بڑی بھی نہیں ہوں۔) جہاں تک بات ٹی وی پروگرامز کی ہے' وہ بھی دیکھتی ہوں تو ایسی بات یا جملہ جس نے سوچ کو نیا رخ دیا' بہت ہیں۔ (اتنی کہ لکھنے بیٹھوں تو اس سوال کا جواب ختم ہی نہ ہو۔) لیکن ایک بات ضرور شیئر کرنا چاہوں گی اور وہ یہ کہ قرآن پاک کو جب سے ترجمے سے پڑھنا شروع کیا' اس سے زندگی کا مزہ آنے لگا اور ''گمراہ کردے اللہ جسے چاہے اور جسے چاہے ہدایت دے۔'' (یہ آیت کا ترجمہ ہے' اگر کچھ غلط ہو تو معافی کی طالب گار' جہاں تک مجھے یاد ہے کہ ایسا کسی آیت کا ترجمہ ہے۔) یہ ترجمہ ایسا ہے جو کہ میرے دل پہ ایسا نقش ہے کہ بس کیا بتاؤں' بے اختیار دل رونے لگ جاتا ہے اور پھر میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگتی ہوں۔ اپنے گھر والوں اور تمام مسلمانوں کے لیے بھی دعا کرتی ہوں۔ میرے خیال سے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

4 ۔ ہائے.... کیسا سوال پوچھ ڈالا ظالم.... ایک بھی نہیں ہزاروں کام.... باتیں ایسی ہیں جن کے دیر ہونے سے پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ (باتیں اور کام چھوٹی نوعیت کے ہیں' اللہ کا شکر اب تک ایسا کوئی بڑا کام نہیں کیا جس پہ پچھتاوا ہو۔) ایک کام تو لیٹ نماز عشا کی ادائگی ہے جس پہ بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔

دوسرا امی ابو کے اکثر کام ہیں جو کہ کہتی ہوں کہ کروں گی مگر ''دیر بہت ہوجاتی ہے۔'' (اپنی یہ عادت بدلنا چاہتی ہوں۔) روٹی بنانا جو کہ مجھے نہیں آتا ٹھیک سے' اس کام پہ بھی پچھتاوا ہے' کیونکہ واحد یہ کام ہے جو میں چاہتی ہوں کہ مجھے آئے مگر اس کو سیکھنے کی کوشش میں بہت کم کرتی ہوں۔ (روٹی صرف آگ پہ سینکی نہیں جاتی' باقی سب ــــ ٹھیک ہے۔)

حرا قریشی...... بلال کالونی ملتان

ابھی ابھی وہ ملا' ہزار باتیں کیں۔ امید؟ کوئی امید بر نہیں آئی۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سوچ؟ سوچ ادراک کے سفر میں رہی اور میں خوش فہمیوں کے سمندر میں.... کامیابی؟ بیسٹ ٹیچنگ ایوارڈ.... ناکامی؟ یاد پڑتا ہے کہ خواب تھے کچھ دھندلے دھندلے' وہ امانت میں

بقیہ صفحہ نمبر 283

کچھ دشتِ جنوں کے بارے میں

امثل آپا! ابھی جب آپ کو خط لکھنے بیٹھی تو مجھے وہ دن یاد آ گئے جن دنوں میں ماہنامہ کرن میں اپنا پہلا قسط وار ناول لکھ رہی تھی۔ بڑا ہی بے فکری کا دور تھا وہ۔

اس وقت کام زیادہ تھے تو وقت بھی زیادہ تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ لکھنے کا شوق بھی پورا کر لیتی تھی۔ سائیڈ لائن دو چار مشاغل بھی تھے۔ زندگی اب بھی خوب صورت ہے لیکن ذمہ داریاں بڑھ چکی ہیں تو وقت کم لگنے لگا ہے۔ خود سے پہلے اسریٰ کا سوچتی ہوں۔

اسریٰ سے آپ کا تعارف کروا دوں۔ میری بیٹی کا نام ہے۔ ابھی تین سال کی ہے لیکن بے حد باتونی اور شرارتی۔ جب سے بولنا شروع کیا ہے، مجھے "آمنہ یار" کہہ کر بلاتی ہے اور ایسے بات کرتی ہے جیسے وہ نہیں میں اس کی بیٹی ہوں۔ میری ساس ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ اسے ماما کہنا سکھاؤ۔ کوئی سنے گا تو کیے گا۔ ماں نے کیا سکھایا ہے۔ لیکن میں نہیں ٹوکتی۔ بڑی ہوگی تو خود ہی سیکھ جائے گی۔ ویسے بھی اسریٰ اتنے پیار سے کہتی ہے کہ میرا مان بڑھ جاتا ہے بات پتا کیا ہے اللہ نے ماں کا دل ہی کچھ ایسا بنایا ہے اپنی اولاد کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔

خیر بات کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ میں تو پورا اسریٰ نامہ ہی لکھ دوں گی۔ جبکہ یہ خط تو سراسر قارئین سے "دشتِ جنوں" کے بارے میں بات کرنے کے لیے لکھا تھا۔ تو چلیں "دشتِ جنوں" کے بارے میں ہی بات کر لیتے ہیں۔ "دشتِ جنوں" موضوع کے اعتبار سے میری پسندیدہ تحریروں میں سے ایک ہے۔

ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب ہم لکھنے کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کرتے ہیں تو موضوع کی وضاحت کے لیے اس کے ارد گرد اپنے تخیل کی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان دیواروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تمام واقعات زندگی سے قریب تر ہوں اور ہمارا تخیل غیر فطری نہ لگے۔

"دشتِ جنوں" لکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ یہ کام آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ زندگی کا ایک سچا واقعہ اٹھاؤں اور اسے قارئین کے سامنے پیش کروں کیونکہ اتفاق سے زندگی میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو حقیقت سے دور نظر آتا ہے اور اگر ہم پر خود بھی بیتے تو ہم اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی ہی چیزوں اور باتوں کو ہم کسی کہانی، ڈرامہ یا فلم میں دیکھ کر اسے "حقیقت سے دور" کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔

مجھے خدشہ ہے کہ میرے قارئین "دشتِ جنوں" کے ساتھ یہی کرنے والے ہیں، اسی لیے میں پہلے سے اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ "دشتِ جنوں" ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے اور چونکہ مجھے کسی کی ذاتی زندگی کو ہائی لائٹ نہیں کرنا تھا اسی لیے کرداروں کے ناموں اور لوکیشنز کو میں نے جان بوجھ کر بدل دیا ہے۔

یہ قصہ ہے، کہانی ہے، داستان ہے لیکن سفرنامہ نہیں ہے۔

آپ دشتِ جنوں سے رویوں کی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں راستوں کی نہیں۔ اس ناول کو میں نے تقریباً ڈھائی سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر مکمل نہیں کر سکی۔ اب بھی اگر قارئین میرا نام منتخب نہ کرتے تو میں اسے لکھنے کا ارادہ نہ کرتی۔ لہٰذا قارئین کا شکریہ جنہوں نے میرا نام تجویز کیا۔ پوری کوشش رہے گی کہ آپ کی توقعات پوری کر سکوں۔

"دشتِ جنوں" کے سب ہی کردار میرے پسندیدہ ہیں۔ امید ہے قارئین کی پسندیدگی کی سند بھی انہیں ضرور ملے گی۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

آمنہ ریاض

آمنہ ریاض

[illegible]

میں ایک راز ہوں
ایک [illegible] راز
ایک ایسا راز جو کئی صدیوں سے قدیم قلعہ کی دیواروں سے ٹکراتا ہے اور چاند کی چاندنی میں گم ہو جاتا ہے
میرے [illegible] سے [illegible] قلعہ کی دیواروں پر [illegible]
داستان بن کر رہ گئے
میں ایک [illegible]
میں [illegible]
میں [illegible]
ایک [illegible]
ایک آہ ہے
ایک سسکی ہے
جو قلعہ کی دیواروں کے ساتھ لگنے کے لیے [illegible]

[illegible]

چونکہ یہ گھر کا پچھلا حصہ تھا اور تائی کی اجازت لیے بغیر بورڈ لگانے کی گستاخی بھی پچھلے دروازے کے ساتھ ہی سرزد کی گئی تھی اس لیے یقین کامل تھا کہ اس گستاخی کی بھنک تائی کو نہیں پڑے گی۔ اور بھنک پڑ بھی جاتی تو کیا فرق پڑنا تھا۔ خوش نصیب کی تو جوتی کو بھی پرواہ نہیں تھی کسی بات کی۔ البتہ اس کی اماں روشن بیگم بھیتائی کی ناراضی کے ڈر سے ہولتی رہتیں اور ان کا ساتھ دیتی خوش نصیب کی بڑی بہن... محترمہ ماہ نور صاحبہ۔ جسے اچھی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ دنیا سے ڈر کر رہنے کا وصف کسی اعزازی ٹرافی کی طرح ملا ہوا تھا۔

تب ہی وہ اپنے ڈر اور اندیشوں کو سنبھال کر ایسے رکھتی جیسے کسی کو گولڈ میڈل مل جائے تو اس کی حفاظت کرتا پھرتا ہے۔

تو خیر بات ہو رہی تھی روشن درسگاہ کے اشتہاری بورڈ کی۔

خوش نصیب بڑی شد و مد سے دعا کر رہی تھی۔

''آپ تو جانتے ہیں اللہ جی! اس اکیڈمی کا کامیابی سے چلنا کتنا ضروری ہے... مجھے بڑا آدمی بننا ہے اور بڑا آدمی بن کر ڈھیر سارے پیسے کمانے ہیں... تاکہ میں روشن امی کے لیے ان کا ایک ذاتی گھر خرید سکوں... نانی کے لیے بتیسی لوں گی... وہ جو منہ میں ایڈجسٹ ہو جاتی ہے اور بار بار نکالنی نہیں پڑتی... اور ماہ نور کے لیے؟'' ذرا سوچ بچار کی پھر دوبارہ سے دعا کا سلسلہ شروع کیا۔

''ہاں... ماہ نور کے لیے میں تھوڑی سی سمجھ داری خرید لاؤں گی... نانی بالکل ٹھیک کہتی ہیں... ماہ نور تو اللہ میاں کی گائے ہے... اور گائے میں عقل نہیں ہوتی جس طرف کو اس کا منہ موڑ دو اس طرف چل پڑتی ہے تو ماہ نور کے لیے تھوڑی سمجھ داری اور تھوڑی ہوشیاری...''

''جب سب کے لیے کچھ نہ کچھ خرید چکو تو اپنے لیے چٹکی بھر عقل بھی خرید لانا۔'' جس وقت خوش نصیب سر پر دوپٹہ رکھے آنکھیں بند کیے' ہاتھ پھیلائے' تھوڑا سا منہ آسمان کی طرف اٹھائے بڑی لگن سے دعا کرنے میں مصروف تھی ٹھیک اسی وقت اس کا جملہ اچک کر بڑے خلوص بھرے لہجے میں کہا گیا۔

خوش نصیب کو دھچکا لگا وہ تو اکیلی بیٹھی اللہ میاں سے مخاطب تھی یہ منحوس کہاں سے بیچ میں کود پڑا۔ پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اپنے آم کے درخت کی سب سے اوپر والی موٹی شاخ پر نیم دراز پایا۔ اف... اس کی آواز نے کیا کم موڈ خراب کیا تھا رہی سہی کسر اس کے دیدار نے پوری کر دی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جان جلانے اکیلا نہیں آیا تھا۔ اپنے چیلوں کا گینگ بھی ساتھ لایا تھا۔ شیرو' ٹیپو' ٹینگی بھی اگلی پچھلی شاخوں پر لٹکے ہوئے مطلب بیٹھے ہوئے اور دانت نکالتے نظر آ رہے تھے۔

''تم... یہ'' ''تم'' انگلی اٹھا کر بطور خاص کیف کے لیے تھا پھر صدمے بھرے انداز میں سب کو دیکھا۔ ''تم... تم سب یہاں کیا کر رہے ہو؟'' تنک کر پوچھا۔

''اندھی ہو گیا؟ دکھ نہیں رہیں... قیلولہ فرما رہے ہیں۔'' سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کا سرہانہ رکھے ایک ٹانگ دوسری پر رکھے وہ اتنے اطمینان سے لیٹا ہوا تھا جیسے اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹا ہو۔ کمبخت کو یہ بھی فکر نہیں تھی کہ ذرا سا سرکا تو دھڑام سے نیچے ہو گا۔

اور گر ہی جاتا تو اچھا تھا۔ ذرا چوٹیں ووٹیں لگتیں... کوئی ایک آدھ ہڈی کھسکتی تو خوش نصیب کو مزہ آتا۔ وہ تو ہر وقت اسی تاک میں رہتا تھا کہ ذرا موقع ملے اور وہ شعلہ دکھا کر خوش نصیب کا دل جلانے کا بندوبست کرے۔

سارا گھر خوش نصیب سے خار کھاتا تھا اور خوش نصیب اس سے خار کھاتی۔

مطلب یہ کہ بدتمیزی' ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی میں اگر کوئی خوش نصیب کا مقابلہ کر سکتا تھا تو وہ صرف اور صرف کیف ہی تھا۔ باقی کسی میں اتنی مجال کہاں؟

"ہائے… اف یہ کیا کہہ دیا بھائی جان!" ٹیپو سر پکڑ کر ادھ موا ہو گیا۔

"کیا؟" کیف نے ادائے بے نیازی سے چیلا نمبر ایک کو دیکھا۔

"یہی… کولہا۔"

"کولہا نہیں قیلولہ نالائق…!" ڈپٹ کر تصحیح کی پھر جتاتی نظروں سے خوش نصیب کو دیکھا جو سر اٹھائے ان سب کو درخت پر چڑھا دیکھ رہی تھی۔ "لگتا ہے روشن درسگاہ کی نالائق استانی کے شاگرد رہے ہو۔ اسی لیے ایک معمولی لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔" ٹیپو کسی دور میں خوش نصیب سے پڑھنے آیا کرتا تھا یہ اسی بات کی طرف اشارہ تھا۔ خوش نصیب اسے دیکھ کر یوں بھی چڑ چکی تھی یہ بات تو سر پر لگی تلووں میں جا کر بھی نہیں بجھی۔

"زبان انتہا کر دھمکی دینے والے انداز میں بولی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو کیف! میں قتل کر دوں گی تمہیں۔"

کیف نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ گرم دوپہر میں سبز رنگ کا سوٹ پہنے شعلہ جوالہ بنی… وہ ایسے لگی جیسے ماش کی پھیکی دال کے ساتھ تیکھی سی سبز مرچ۔ کیف کو دل ہی دل میں اس مثال پر گدگدی ہونے لگی۔ تھوڑا اور رخ بدلا اور چھلانگ لگا کر اس کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔

"جو ہاتھ کیف الحسن کو قتل کر سکیں۔ وہ ہاتھ ابھی دنیا کے کسی سانچے میں ڈھلے نہیں… البتہ آنکھوں سے قتل کرنے کا ارادہ ہے تو معاملہ دوسرا ہے۔" وہ شرارت آنکھوں میں سمو کر اپنی مخصوص چیلنج کرتی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر بولا۔

خوش نصیب نے دانت کچکچائے لیکن آنکھوں کا رخ فوراً پھیر لیا۔ دنیا میں عشق کے نام پر جتنے بھی نقصانات ہوئے ہیں… تاریخ گواہ ہے ان کی راہ ہموار کرنے کے لیے دل نے آنکھوں کا راستہ ہی اختیار کیا ہے۔

کیف نے دیکھا غصے کے باوجود وہ سٹپٹا گئی تھی۔ اور ایسے میں کیف کو ہمیشہ اس پر ترس آ جاتا تھا سو بات بدل کر ٹینکی کو آواز لگائی۔

"اوئے ٹینکی!… کرسی سیدھی کر۔" وہ تینوں گروجی کی ایک آواز کے ہی منتظر تھے۔ دھپ دھپ کر کے چھلانگیں لگائیں اور خوش نصیب کی کرسی اٹھا کر خدمت میں پیش کر دی۔ وہ اکڑ کر بیٹھنے لگا تو خوش نصیب کو پتنگے لگ گئے۔

"خبردار!… اس کرسی پر مت بیٹھنا۔"

"کیوں؟" کیف بیٹھتے بیٹھتے ٹھٹک کر رکا۔ "اس پر کانٹے اگے ہوئے ہیں؟" معصوم سوال۔

"یہ میری کرسی ہے۔" چبا کر بولی۔

"تو کیف بھائی جان بھی تو آپ کے ہی ہیں… یہ کون سا غیر ہیں؟" ٹیپو معصوم بن کر بولا۔ کیف کے زوردار قہقہے نے معمولی بات کو ذومعنی بنا کر خوش نصیب کو شرمندہ ہی کر دیا۔ وہ کیف سے ہمہ وقت ناراض رہتی تھی اس وقت اور بھی بھڑک گئی۔

"ٹیپو کے بچے!… چپ رہو۔" وہ غرائی۔

کیف کی ہنسی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ "بچہ ہے… اس کے بچوں کو تو بخش دو۔" خوش نصیب کا دل چاہا ہاتھ میں پکڑا رجسٹر ہی اس کے منہ میں ٹھونس دے کسی طرح اس کی کمینی ہنسی کی آواز تو بند ہو۔

"اٹھو میری کرسی سے… میرے ابو نے یہ کرسی اس لیے نہیں خریدی تھی کہ اس پر اونگے بونگے لوگ بیٹھتے پھریں۔"

"اب اگر تیرا میرا ہی کرنا ہے تو پہلے ہمارے درخت پر سے اپنی اکیڈمی کا بورڈ ہٹاؤ…" وہ اکڑ کر بولا۔ "میرے بابا

نے بھی درخت اس لیے نہیں لگوایا تھا کہ لوگوں کی اوٹ پٹانگ اکیڈمیز کے بورڈ اٹھاتا پھرے۔" یہ سیر تھی تو وہ سوا سیر۔ کسی بات پر چوکنا تو سیکھا نہیں تھا ان دونوں نے۔

"تمہارے بابا میرے تایا بھی ہیں۔ ان کا جو کچھ ہے وہ میرا بھی ہے۔" حالاں کہ وہ دل سے جانتی تھی کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ لیکن اس وقت حقائق سے زیادہ اہم کیف کو منہ توڑ جواب دینا تھا سو اس نے دیا اور ڈنکے کی چوٹ پر دیا۔

"اور تمہارے ابو میرے چچا بھی تھے۔ ان کی خریدی ہوئی کرسی پر پہلا حق میرا ہے۔"

"آہا۔ تم آ گئے پتا نہیں کہاں سے حق جتانے۔ پہلے ہی میرے ابا کے ترکے پر تم سب سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہو۔ ظالم، حریص۔"

"خوش نصیب۔!" خوش نصیب کی آواز کا گلا روشن امی کی دھاڑ نے دبایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی اور جذباتیت میں آواز کہاں قابو میں رہتی ہے۔ باہر آتی روشن امی جہاں اس کی آواز سن کر ششدر ہوئی تھیں۔ وہیں ان کے پیچھے آتی صباحت تائی جان کو پتنگے ہی لگ گئے۔

"اے لڑکی! زبان کو لگام دو۔ ہم کیوں تمہارے باپ کے ترکے پر بیٹھیں گے۔" وہ تنک کر بولیں۔ "اللہ تمہارے باپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ لیکن مرتے ہوئے اس نے چھوڑا ہی کیا تھا جس کے بل بوتے پر اتنا اکڑ رہی ہو۔"

"میرا منہ مت کھلوائیں تائی جان!۔ آپ خود بھی اچھی طرح جانتی ہیں ابو نے کیا چھوڑا تھا اور کیا نہیں۔" اسے کسی کا لحاظ نہیں تھا تڑخ جواب دینا تو جیسے فرض تھا اس پر۔

"خوش نصیب! اپنی آواز بند رکھو۔" اس کا خوب صورت چہرہ غصے اور ناپسندیدگی سے لال ہو رہا تھا۔

"اس کی آواز کیوں بند کرواتی ہو؟ ارے اس کی آواز بند ہونا ہوتی تو جس روز پیدا ہوئی تھی خود ہی مر جاتی۔ اس کی نحوست تو اس کے باپ کو کھا گئی جس روز پیدا ہوئی اگلے روز گھر سے باپ کا جنازہ نکلا۔ ایسے کالے کرموں والی ہے یہ۔" خوش نصیب کا چہرہ غصے اور توہین سے سرخ پڑ گیا۔

کیف سٹپٹا کر ماں کی طرف لپکا۔

"اوفو امی!۔ آپ کیا پرانی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ چلیں میرے ساتھ اندر۔"

"پرانی باتیں کہاں۔ مجھے تو کل کی بات لگتی ہے۔ کیسا میرا شیر جوان دیور تھا۔ جب اس کا جنازہ اٹھا کوئی آنکھ نہیں تھی جس سے آنسو نہ نکلے ہوں۔" وہ بولتی جا رہی تھیں کیف انہیں زبردستی لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خوش نصیب وہیں کھڑی کھا جانے والی نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

کیف نظر نہ ملا سکا۔ جلدی سے اندر چلا گیا۔

اب کھلے صحن میں آم کے درخت کی چھایا تلے خوش نصیب اور روشن امی تنہا رہ گئی تھیں۔ ٹیپو، ٹینکی اور شیرو ماحول کو گرم ہوتا دیکھ کر پہلے ہی تتر بتر ہو چکے تھے۔ روشن امی نے لال انگارہ آنکھوں سے خوش نصیب کو دیکھا۔

"دنیا تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتی ہے خوش نصیب!۔ ہم پہلے ہی بہت بے بس ہیں۔ ہمیں دنیا کے لیے تماشا مت بناؤ۔" ان کی آواز نرم لیکن دکھ سے لبریز تھی۔ خوش نصیب کا دل چاہا وہ مر ہی جائے۔

"سمیٹو یہ کاٹھ کباڑ اور اندر چلو۔ دوبارہ یہ بورڈ مجھے یہاں نظر نہیں آنا چاہیے۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی اندر چلی گئیں۔

خوش نصیب کے اندر غصے اور بغاوت کا طوفان سر اٹھانے لگا۔ اس نے جھپٹ کر بورڈ درخت کے تنے سے

اتارا اور زمین پر پٹخ دیا۔
اور یوں روشن درسگاہ اپنے قیام کے پہلے ہی دن ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔



پہاڑی پرندوں کی خوشنما آوازوں سے بھری ڈھلتی ہوئی ملیالی شام قلعہ فلک بوس کی چمنیوں سے سرکتی ہوئی عمارت کی دوسری منزل پر اتری اور رینگتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوئی جو چاروں طرف سے کتابوں کی الماریوں سے آباد تھا۔ کمرہ بہت بڑا تھا کونے میں ایک میز پڑی تھی جس کے دوسری طرف ایک خوش شکل نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر بہت سے کاغذات بکھرے تھے' کچھ توڑ مروڑ کر کے فرش پر پھینکے گئے تھے۔ میز پر ایک ٹیبل لیمپ اور کمپیوٹر سسٹم رکھا ہوا تھا۔

وہ میز پر جھکا بڑے انہماک سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ خوب صورت پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے مہرے سے بہت ذہین دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ فریم کا نظر کا چشمہ اس کے چہرے پر بھلا معلوم ہوتا تھا اور مناسب قد کاٹھ اس کی شخصیت کو ایک وقار بخش رہا تھا۔ داہنی ہاتھ پر ایرانی طرز کی ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس سے ڈھلتی ہوئی شام کے نارنجی رنگ ترچھے ہو کر اس کے جسم پر پڑ رہے تھے۔ اور سر کے بالوں کے سرے بھورے بھورے سے دکھائی دیتے تھے۔

جب وہ کافی دیر لکھ چکا تو اس نے پین بند کر کے کاغذات پر رکھ دیا۔ اب وہ تھکا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ دراصل وہ ایک مصنف تھا۔ کہانیاں بننا اور لکھنا اس کا بچپن کا شوق اور اب ذریعہ معاش تھا۔ یہ اس کی زیر طبع کتاب کا آخری حصہ تھا جس کا مسودہ کچھ روز میں مکمل کر کے اسے پبلشر کو بھجوانا تھا۔ اگلے چند روز تک بشام میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ اور اس دوران شہر تک جانے والے راستے لینڈ سلائیڈنگ کے ڈر سے بند کر دیے جاتے تھے۔ اسے یہی فکر تھی کہ بارشوں سے پہلے یہ آخری حصہ مکمل ہو جانا چاہیے۔ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے سر پیچھے کرسی کی پشت سے لگا کر ستانے لگا۔ تھکاوٹ کے باوجود وہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

"وسامہ۔۔۔!" اچانک اس کی سماعت سے اس کی بیوی کی کھنکتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں جانتا تھا۔۔۔ تم مجھ سے لاکھ ناراض سہی۔۔۔ میری خبر گیری کے لیے ضرور اوپر آؤ گی۔" آنکھیں بند کیے وہ متبسم لہجے میں بولا اور گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی پل وہ بری طرح چونکا مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہوئی۔ کمرے میں وہ اکیلا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ششدر رہ گیا اس نے آئے گت کی آواز بہت واضح سنی تھی۔ یہ اس کا وہم نہیں ہو سکتا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تو اس نے جلدی سے ہاتھ مار کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ کمرے میں ابھی شام کے رنگ باقی تھے جو ٹیبل لیمپ جلنے سے ماند پڑ گئے۔

اس نے سرعت سے میز کے ساتھ رکھی بیساکھی اٹھائی۔ اضطراب بھرے انداز میں بکل کھول کر اسے اپنی ٹانگ کے ساتھ باندھا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔ کمرے کے آگے طویل برآمدہ نماراہداری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی اور قلعہ فلک بوس کا اسرار بیدار ہوتی ہوئی رات کے ساتھ چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔

"وسامہ!۔۔۔" قلعہ فلک بوس کی خاموشی میں آئے گت کی آواز کسی سرگوشی کی مانند ایک بار پھر وسامہ کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس بار اس کا دل دہشت سے بھر گیا۔ وہ بیساکھی کے سہارے جس قدر تیز چل سکتا تھا

اسی قدر تیزی کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا لیکن خوف نے جیسے اس کی ہمّت سلب کرنا شروع کردی تھی۔
ایک ان دیکھا ہیولہ سانپ کی طرح سرکتا اس کے تعاقب میں چلا آرہا تھا۔ وسامہ اپنے پورے جسم کی طاقت لگا کر جس قدر تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ جس قدر سرعت سے گول طرز کی سیڑھیاں اتر سکتا تھا اترا۔ آخری پانچ سیڑھیوں پر وہ حواس باختہ ہو کر پھسلا اور منہ کے بل فرش پر گرا۔ خوف اور تکلیف سے ملی جلی کراہیں اس کے لبوں سے برآمد ہوئی تھیں۔
"وسامہ...!" اب یہ آواز اس نے بالکل اپنے قریب سنی۔ دہشت زدہ ہو کر سر اٹھایا۔ آئے کت اس کے سامنے کھڑی ہکا بکا اسے فرش پر گرا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز اب وہم بن کر وسامہ کی سماعت سے نہیں ٹکرائی تھی بلکہ وہ مجسم اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے عقب میں دیوار گیر کھڑکی کے باہر پوری تاریخوں کا بڑا سا طلوع ہوتا ہوا چاند دکھائی دے رہا تھا۔ اور پہاڑی پرندوں کی خوشنما آوازوں سے بھری ڈھلتی ہوئی نیالی شام جو قلعہ فلک بوس کی چمنیوں سے سرکتی ہوئی عمارت کی دوسری منزل پر اتری تھی' دہشت زدہ پراسرار رات میں ڈھل چکی تھی۔



کیف اندر آکر ناراض ہوا۔ "آپ بھی کمال کرتی ہیں امی! کیا ضرورت تھی اتنا بولنے کی؟" اس کا لہجہ جھنجلایا ہوا ضرور تھا مگر بدتمیز نہیں۔ زبان دراز تو وہ صرف خوش نصیب کے لیے تھا باقی سب کے لیے تو اچھا بچہ تھا۔
"ہاں تو کیوں نہ بولتی؟" وہ تنک کر بولیں۔ "اس لڑکی کی زبان نہیں دیکھی... کیسی فرفر چل رہی تھی؟"
اب اس بات کے جواب میں کیف کے پاس کافی دلائل تھے مگر چپ ہی رہا... بتایا ناں وہ اچھا بچہ تھا۔
"اب کیا کردیا خوش نصیب نے؟" فہمینہ کتابیں اٹھائے اندر آرہی تھی۔ کیف حیران ہوا۔
"تمہیں کیسے پتا خوش نصیب کی بات ہورہی ہے؟"
"گھر میں ایک ہی تو لڑکی ہے... جس کی زبان فرفر چلتی ہے۔" اس نے ہنس کر اور قدرے شرارت سے کہا اور چونکہ ماں کی طرح خوش نصیب کے لیے دل میں عناد نہیں تھا سو برے طریقے سے بھی نہیں کہا۔ کیف اور وہ دونوں مل کر اس بات پر ہنسے پھر کیف نے کہا۔
"خوش نصیب کو تو خوامخواہ امی اور فضیلہ چچی نے بدنام کر رکھا ہے... گھر کی باقی لڑکیاں کسی سے کم ہیں کیا؟"
"اے لڑکے! خبردار جو میری فہمینہ کو اس لڑکی سے ملایا۔" صباحت بیگم برا ہی مان گئیں۔
"اوہو امی!... آپ بھی سیریس ہو جاتی ہیں... کیف مذاق کر رہا ہے۔"
"کوئی مذاق وذاق نہیں کر رہا۔" وہ متبسم لہجے میں لیکن قدرے سنجیدگی سے بولا۔ "منہا اور صیام بولتے ہوئے کسی کا لحاظ رکھتی ہیں کیا؟ من مانیاں کرنے میں ان سے کوئی آگے نہیں نکل سکتا... فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کی بدتمیزیوں پر پردے ڈال دیے جاتے ہیں اور خوش نصیب کی ہر چھوٹی بڑی بات کو چار سے ضرب دے کر بتایا اور محسوس کیا جاتا ہے۔"
اس نے بڑا صحیح قسم کا تجزیہ سامنے رکھ دیا تھا۔ صباحت بیگم دل میں قائل ہوئیں لیکن جس تصویر کو ایک ہی رخ سے دیکھنے کی عادت برسوں پرانی ہو' اس تصویر کے کسی دوسرے رخ کی نشاندہی کر بھی دی جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ انسان پرانی باتوں' پرانی یادوں اور پرانے تجزیوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔
"کیف بالکل صحیح کہہ رہا ہے امی!" فہمینہ نے کہا۔

""ارے بھئی... وہ دونوں جانیں اور ان کے ماں باپ... ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو سدھارتے پھریں۔" انہوں نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

"اگر یہی بات ہے تو خوش نصیب کو بھی اس کے حال پر چھوڑ دیں۔" اس نے ماں کی پیشانی کے بلوں کو کن انکھیوں سے تاڑتے ہوئے آہستگی سے کہا مبادہ وہ برا ہی نہ مان جائیں۔

"ارے ایسے کیسے اس کے حال پر چھوڑ دیں... باپ سر پر ہے نہیں اور اس کی اماں کو معصوم بن کر ہمدردیاں بٹورنے کا اتنا شوق ہے کہ بس۔" وہ بری طرح چڑی ہوئی تھیں "کل کلاں اپنی ضدی فطرت کے ہاتھوں کوئی گل کھلا بیٹھی تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے ہم۔"

"اوہو... پلیز امی!... آپ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔" فہمینہ چڑ کر بولی۔ "گھر میں ایک اکیڈمی ہی تو شروع کرنا چاہ رہی ہے... اس میں کون سی قیامت آجائے گی جو آپ اور فضیلہ چچی اس کے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔"

"گھر میں نت نئے لوگ آئیں گے... ہمیں نہیں پسند یہ سب... تم بتاؤ کیف! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" ان کا خیال تھا ابھی کیف نے خوش نصیب کی اکیڈمی کے افتتاح میں جو رخنہ ڈالا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بھی ان ہی کا ہم نوا ہے۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔

"بالکل غلط... سو فیصد غلط..." اس نے فوراً" کہا۔

"ہاں ہاں! تمہیں تو ماں ہی غلط لگے گی۔"

"امی!..." فہمینہ نے کہنا چاہا۔

"اچھا بس!... اب زیادہ اس کی طرف داری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے فوراً" دونوں کو ہی ٹوک دیا۔ "ایسے منہ بھر بھر کے ہم سب کو کوس رہی تھی۔ میرا تو دل چاہا زبان ہی کھینچ لوں... منحوس کرموں جلی..." وہ اٹھ کر اپنی چپل تلاش کر کے پہننے لگیں۔

"اب کہاں جا رہی ہیں؟" فہمینہ نے پوچھا۔

"ذرا فضیلہ کے پاس بیٹھ کر آتی ہوں..." وہ باہر نکل گئیں۔

کیف جھنجلا گیا۔ "ان کے دل میں پہلے ہی خوش نصیب کے لیے اتنی ناپسندیدگی ہے... اب فضیلہ چچی کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھ کر آئیں گی اور چار نئے اعتراضات اٹھا لائیں گی۔"

"تمہیں کیا فکر ہے؟" فہمینہ نے جلدی سے کہا۔ "امی اور فضیلہ چچی جتنے مرضی اعتراضات تیار کرلیں۔ بہو تو خوش نصیب امی کی ہی بنے گی۔" اس نے شرارت سے کہا تھا۔ کیف کے ہونٹوں کے کنارے کانوں تک پھیل گئے خوب زور دے کر بولا۔

"ان شاء اللہ..." پھر دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

"اچھا سنو کیف...!" وہ جانے لگا تو فہمینہ نے کہا۔ "کسی وقت فارغ ہو تو ماموں سے مل آنا... آج بھی میں کتابیں لینے گئی تو تمہارا پوچھ رہے تھے۔" کیف نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا۔ "یار! میں بھول ہی گیا... انہوں نے برسوں سے بلا رکھا ہے... وہ تو بہت ناراض ہوں گے۔"

"فکر مت کرو... وہ عرفات ماموں ہیں... ناراضی کا لفظ ان کی ڈکشنری میں نہیں ہے۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ ساتھ لائی کتابیں بک ریک کے شیلف پر سیٹ کرنے لگی تھی۔



وہ ایک چمکیلی صبح تھی جو بروکلن ہائٹس کے اس پارک پر جھک آئی تھی۔ پچھلی رات بارش برسی تھی لیکن اس

وقت آسمان بالکل صاف ہو چکا تھا۔ اور ہوا میں بارش کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ جاگنگ ٹریک خشک ہو چکا تھا لیکن گھاس میں کہیں کہیں نمی موجود تھی۔

منفرا اور فی بی (FIBI) دور سے جاگنگ کرتی ہوئی آئیں اور اپنے مخصوص بینچ کے پاس رک گئیں۔ بلکہ منفرا رک گئی۔ فی بی کے پاؤں اور ہاتھ تو ابھی بھی "حرکت جاگنگ" میں تھے۔ اس نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے منفرا کو دیکھا۔ تو اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"بس...." وہ تھک چکی تھی اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ جھکی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سانس بحال کرنے لگی۔

"مام کو لگتا ہے اگر میں ایک دن جوگنگ نہیں کروں گی تو مزید موٹی ہو جاؤں گی۔" وہ سخت بیزار لگ رہی تھی۔

"اوہ کم آن.... تم موٹی نہیں ہو۔" فی بی اب وہیں کھڑی ایکسر سائز کرنے لگی۔ ہاتھوں پاؤں کو اوپر نیچے 'دائیں بائیں گھما رہی تھی۔ کبھی ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر دوسری طرف کو جھک جاتی اور اس حد تک اپنے جسم کو گول کر لیتی کہ تیر کمان کی کمان لگنے لگتی۔ اور کبھی ٹانگ پھیلا کر See saw کی طرح اوپر نیچے ہوتی۔

"ان فیکٹ یو ہیو آ ویری گڈ فگر۔" فی بی نے بات جاری رکھی۔ "کل ہی جوزف 'ارنسٹ سے کہہ رہا تھا.... منفرا جیسا فگر پوری کلاس میں کسی دوسری لڑکی کے پاس نہیں ہے۔" منفرا نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اپنی عزیز ترین سہیلی کو دیکھا۔ اس طرح کرنے سے اس کی اونچی پونی ٹیل لہرائی اور اس کی گردن کے گرد بل کھا گئی۔ جس سوسائٹی کی وہ دونوں پروردہ تھیں وہاں اس طرح کے کامپلیمنٹس ملنے پر خوش ہوا جاتا ہے۔ لیکن منفرا کو ماں کا ردعمل یاد کر کے ہنسی آ گئی۔

"یہ بات اگر میری امی نے سن لی تو وہ میرا کالج جانا بند کروا دیں گی۔" اس نے متبسم لہجے میں کہا تھا۔

"آئی نو شی از ویری کنزرویٹو۔" فی بی نے بھی روٹین کی طرح کہا تھا۔

"نو شی از ناٹ۔" منفرا نے ترنت کہا۔

"وہ مشرقی معاشرے کی پیداوار ہیں اور مشرق میں ایسی باتیں تہذیب کے خلاف مانی جاتی ہیں.... لیکن خیر.... تم نہیں سمجھوگی۔"

"کیوں؟.... میں کیوں نہیں سمجھوں گی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیونکہ تم کبھی مشرق نہیں گئیں۔" منفرا نے کندھے اچکا کر کہا۔

"میں انٹرسٹڈ بھی نہیں ہوں.... تمہارا پاکستان تمہیں ہی مبارک ہو۔" چونکہ منفرا اس کی دوست تھی تو مشرق اس کے لیے بس پاکستان ہی تھا۔

"اوئے.... میرے پاکستان کو کچھ مت کہنا...." منفرا نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ فی بی زور سے ہنس پڑی۔

"ساری دنیا کہہ رہی ہے.... ایک میرے کچھ کہہ دینے سے کون سی قیامت آجائے گی؟...." پھر دوبارہ وارم اپ کرنے لگی۔

"میں ایک اور راؤنڈ لگا لوں۔" اس نے بحث ہی سمیٹ دی۔

منفرا مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ فی بی نے اسے بتایا تھا اجازت تو نہیں مانگی تھی کہ جواب کا انتظار کرتی۔ وہ پہلے ہی ٹریک پر دوڑنے لگی تھی۔ منفرا ٹریک اور گھاس کے قطعہ کے درمیان پھولوں کی باڑھ عبور کر کے بینچ پر بیٹھ گئی۔

یہ ان دونوں کا اپنی کئی سالوں کی دوستی بچانے کا بہترین طریقہ تھا۔ جیسے ہی بات ملکی حدود سے نکل کر دہشت گردی اور سیاست تک پہنچتی.... دونوں میں سے کوئی بھی بات ہی بدل دیتا۔ یوں نہ بحث طول پکڑتی نہ دوستی کے

شفاف شیشے میں دراڑ پڑنے کا خدشہ جنم لیتا۔ منفرا یہی سب سوچتی بینچ پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کا جائزہ لینے لگی۔
یہ اس کا شروع دن کا معمول تھا۔ ہمیشہ جاگنگ اور ایکسر سائز کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھ جاتی اور لوگوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرنے لگتی۔ کچھ چہروں پر اسے بہت سی کہانیاں مل جاتیں۔ کچھ یونہی خاموش خاموش سے محسوس ہوتے۔ کچھ کے چہرے سے مایوسیاں جھلکتیں اور کہیں اسے خوشیوں کے رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے۔ انسانوں کے چہروں سے ان کی نفسیاتی الجھنوں کا سراغ لگانے کی کوشش ایک ایسا مشغلہ تھا جو خود اس کی بے ضرر سی نفسیاتی گرہ بنتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ خیال آنے پر محظوظ ہوتی تھی پھر سوچتی۔ وہ کراس کلچرل سائیکالوجی پڑھ رہی تھی۔
سینٹ فرانسس کالج کی ذہین اور محنتی لڑکیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اسکالر شپ پر اسے ایڈمیشن ملا تھا اگر یہ نہ ہوتا تو امی کبھی اسے اتنے مہنگے کالج میں ایڈمیشن لینے اور نیویارک جیسے مہنگے ترین شہر میں بھجوانے پر راضی نہ ہوتیں۔ مطلب یہ کہ وہ انتہائی قابل لڑکی تھی اور قابلیت صرف اسائنمنٹس اور کتابوں تک ہی تو محدود نہیں ہوتی ہے۔ عام زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ تو اس کی قابلیت یہ تھی کہ وہ چہرے پڑھنے لگی تھی۔ اس کا گمان تھا کہ اس کے لگائے ہوئے اندازے ستر فیصد درست ثابت ہوتے ہیں اور اس کا خیال تھا باقی تیس فیصد پر وہ محنت نہیں کرتی۔ اگر کرتی تو اتنا مارجن بھی نہ چھوڑتی۔
یہی سب سوچتے وہ بینچ کی بیک سے ٹیک لگا کر ستانے لگی تو اسے سامنے والے ٹریک پر جاگنگ کرتا ہوا کوئی دکھائی دیا۔ منفرا غیر ارادی طور پر ایک دم سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بالکل لاشعوری طور پر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
اس نے گرے کلر کا اپر پہن رکھا تھا اور اپر کا ہڈ چہرہ چھپا رہا تھا۔ مگر منفرا اسے جانتی تھی۔ یہی ایک چہرہ تھا جس کی گتھی سلجھانا تو دور کی بات منفرا اس کا پتا بھی نہ لگا پائی تھی۔ وہ اکثر اسے پارک میں دیکھتی۔ جاگنگ ایکسر سائز کرتے ہوئے نظر آجاتا۔ کبھی پارکنگ میں تو کبھی ٹیلی فون بوتھ کے پاس منفرا کو یقین تھا باقی لڑکیاں بھی اس کی ٹوہ میں رہتی ہوں گی۔ وہ مہنگے جوتے پہنتا تھا۔ ڈیزائنر ٹریک سوٹ ہوتا تھا اس کا۔
پھر وہ ہینڈسم تھا۔ ستائیس اٹھائیس سال عمر ہوگی یا ممکن ہے بتیس، تینتیس سال کا ہو۔ بہرحال اس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ بظاہر کسی کو لفٹ بھی نہیں کرواتا تھا یعنی اس میں وہ ہر خصوصیت تھی جو لڑکیوں کو متوجہ کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لیکن منفرا کا دلچسپی کا پہلو وہ اسرار تھا جو اس بندے کی شخصیت میں جھلکتا تھا۔
گو کہ اس نے ہمیشہ اسے بہت فاصلے سے دیکھا تھا پھر بھی وہ پراسرار لگتا۔ اور اسرار میں کشش ہوتی ہے۔
دو چار بار وہ سینٹ فرانسس میں بھی نظر آیا۔ بعد میں پتا چلا وہ منفرا کے کلاس میٹ ایرک کے بیسٹ فرینڈ مبین کا سیکنڈ کزن تھا۔ اس کا نام معاویہ اردشیر ازدی تھا۔ ایرک کہتا تھا مبین اس کے بارے میں جو کہانی سناتا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ منفرا نے ابھی تک وہ کہانی نہیں سنی تھی لیکن ایرک کہہ رہا تھا تو یقیناً" اس میں کچھ دلچسپی ہو گی۔ ویسے بھی ایرک بہت بہترین داستان گو تھا۔ وہ یہ کہانی سناتا تو یقیناً" اسے سننے میں لطف آتا۔ وہ اس کے سامنے سے گزر کر مین گیٹ کی طرف چلا گیا۔ تب ہی ٹی بی واپس آگئی۔
"یہ تو ایرک کا کزن ہے ناں؟" ٹی بی بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"نہیں... ایرک کے فرینڈ کا کزن ہے۔" منفرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"اس کی بیوی کا کچھ پتا چلا؟" ٹی بی نے منفرا سے پوچھا۔
"بیوی؟" منفرا کو یہ لفظ سن کر شاک لگا یہ ایسا ہی ردعمل تھا جیسے کسی کے بارے میں کوئی غیر متوقع بات پتا چلے تو لگتا ہے۔ "یہ میرڈ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ایرک بتا رہا تھا لیکن اس کی بیوی اب اس کے ساتھ نہیں رہتی۔"
"کیا مطلب؟"
"یار! بڑی ٹریجڈی ہوئی ان دونوں کے ساتھ۔"
"کیسی ٹریجڈی؟"
"چھوڑو یار! دوسروں کی ٹریجڈیز۔۔۔ کے بارے میں جان کر ہم کیا کریں گے۔۔۔ یہاں تو جس کی زندگی کھول کر دیکھو کوئی نہ کوئی ٹریجڈی ضرور ملے گی۔" نی بی۔ جیب سے چھوٹا سا رومال نما تولیہ نکال کر اپنی گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ پھر بولی۔
"چلیں؟۔۔۔ مجھے ٹیمی کے ساتھ کلارک اسٹریٹ جانا ہے۔۔۔ سنا ہے وہاں تمام فیمس برانڈز پر 50%off سیل لگی ہوئی ہے۔۔۔ مجھے اپنے لیے کوٹ خریدنا ہے۔"
"چلو۔۔۔" منفرا اٹھ کھڑی ہوئی۔



خوش نصیب کرسی پر سر جھکائے، منہ سجائے، بازو باندھے بیٹھی تھی۔
ماہ نور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی، روشن امی پلنگ کے کنارے پر ذرا سا پہلو ٹکائے بیٹھی تھیں۔ بوڑھی بیمار نانی تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں اور پتا نہیں جاگ رہی تھیں کہ سو چکی تھیں۔ خوش نصیب کو تو صرف اتنا پتا تھا تینوں کی تینوں مسلسل اسے ملامتی نظروں سے گھور رہی ہیں۔
وہ ناراضی کے اظہار کے طور پر چپ تھی لیکن زیادہ دیر تک چپ رہنا اس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ سو تھک ہار کر سر اٹھایا اور سب کو دیکھا اور نروٹھے پن سے بولی۔
"اب کیا آنکھوں سے آگ نکال نکال کر آپ لوگ مجھے بھسم کر دیں گے؟۔۔۔ کہہ تو رہی ہوں، غلطی سے منہ سے بات نکل گئی۔۔۔"
"کیسے منہ سے بات نکل گئی؟" ماہ نور نے کہا۔ "میرے منہ سے تو آج تک کوئی بات غلطی سے نہیں نکلتی۔" اپنے خوب صورت نقوش کی طرح اس کا لہجہ بھی دھیما تھا۔
خوش نصیب نے طنز سے اسے دیکھا۔ "تمہارے منہ سے لفظ باہر نکل آتے ہیں یہی بڑی بات ہے۔"
"اب بڑی بہن سے بدتمیزی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" روشن امی نے ڈپٹ کر کہا۔ "جاؤ اور اپنی تائی جان سے معافی مانگ کر آؤ۔"
"کیوں جاؤں؟" وہ روٹھی ہو کر بولی۔ "ایسی کون سی بڑی بات کہہ دی میں نے۔۔۔ اور اگر کچھ کہہ بھی دیا تو تائی جان نے بھی تو مجھے کتنی باتیں سنائی تھیں حساب برابر۔"
"وہ بڑی ہیں کہہ سکتی ہیں۔"
"بڑوں کو حق ہوتا ہے جیسے چاہے چھوٹوں کی بے عزتی کریں؟"
"کیا وہ آکر معافی مانگیں گی تم سے؟"
"یہ میں نے کب کہا؟۔۔۔ صرف یہ کہہ رہی ہوں معافی نہیں مانگوں گی۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تھا۔ "اور ویسے بھی زیادہ غلطی اس کیف چوہے کی ہے، آیا کہیں کا کرائم رپورٹر۔ کس نے کہا تھا میرے معاملے میں ٹانگ اڑائے۔۔۔ پتا نہیں کہاں سے آگیا اپنی پوری ٹیم اٹھا کے۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں روشن امی! کیف جان بوجھ کے مجھے تنگ کرتا ہے.... کسی دن واقعی قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں۔" دانت کچکچا کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے.... تم نہیں جاتیں تو میں چلی جاتی ہوں" روشن گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اس سے پہلے کہ گھر کے مردوں تک بات پہنچے.... کسی نہ کسی کو تو معافی مانگنا ہی پڑے گی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ خوش نصیب جلدی سے بھاگ کر ان کے سامنے آگئی۔

"کیوں جذباتی ہو رہی ہیں.... تایا ابو کے آنے تک تو تائی جان سب کچھ بھول بھی چکی ہوں گی۔"

"آج تک وہ کوئی بات بھولی ہیں جو اب بھولیں گی؟" روشن امی نے جھنجلاہٹ بھری بے بسی کے ساتھ کہا تھا۔ "اور اگر وہ بھول بھی گئیں تو فضیلہ انہیں یاد دلا دیں گی.... ہماری غلطیاں یاد رکھنے کے لیے اس گھر میں پورا ایک دفتر موجود ہے۔" وہ کچھ تلخی سے کہہ گئی تھیں۔

"دیکھا.... یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں۔" خوش نصیب نے ہتھیلی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جہاں صرف ہماری غلطیوں کا حساب رکھا جاتا ہے وہاں ہم کیوں رہیں؟ ابو کی وفات کے بعد سے کتنی خدمت کی ہے آپ نے ان سب لوگوں کی اور بدلے میں کیا مل رہا ہے.... سوائے لعنت ملامت کے؟"

"تو میں کیا کرتی؟ دو بیٹیوں کو لے کر دنیا میں اکیلی نکل جاتی؟" انہوں نے ناراضی سے پوچھا۔ "لعنت ملامت مل رہی ہے تو سر پر چھت بھی تو ہے.... اور یہ بھی غنیمت ہے' بھائیوں نے یہاں سے نکل کر اپنی اپنی زندگیاں بسالیں.... بوڑھی ماں کا بھی خیال نہیں کیا.... میں کہاں جا کر ان سے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے لیے سوال کرتی۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"آپ اللہ کے بھروسے کوئی اسٹینڈ تو لیتیں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "دنیا میں جس کا کوئی نہیں ہوتا روشن امی!.... اس کا بھی اللہ ہوتا ہے۔"

"اللہ کے بھروسے ہی بھائیوں کا گھر چھوڑ کر نکلی تھی.... تمہارے تایا بھی سہارا نہ دیتے تو کہاں لے کر جاتی میں تم دونوں کو۔"

"آپ اس احسان مندی کے چکر سے کبھی باہر نہیں آسکتیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو خوش نصیب! یہ سب ہمارے اپنے ہیں اور اپنا مارتا ہے تو بھی چھاؤں میں ہی ڈالتا ہے۔" وہ عاجز ہو کر بولی تھیں۔

"ماشاء اللہ.... " خاصا طنز بھرا ماشاء اللہ تھا۔ "کوئی دیکھے تو سہی.... کس قدر خوب صورت چھاؤں میں ڈالا ہوا ہے ہمیں.... ہمارے اپنوں نے گھر کا سب سے گندا کمرہ ہمیں دیا گیا ہے۔ بارش ایک دن ہو یا دس دن.... پہلی بوند کے ساتھ چھت ٹپکنا شروع ہو جاتی ہے.... معمولی سے اخراجات کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کب تایا ابو اور چچا کی جیب اجازت دے اور ہمیں بھی اپنی ضروریات پوری کرنے کا موقع ملے.... مجھے نہیں یاد پڑتا روشن امی! میرے اسکول کالج کی فیس کبھی ایک دفعہ مانگنے پر ملی ہو....."

"ہاں کبھی ایک بار مانگنے پر فیس نہیں ملی.... لیکن مل تو جاتی تھی۔"

"آپ کے جتنی صابر میں مرتے دم تک نہیں ہو سکتی۔" گہری سانس بھر کر کہا اور یہ پچھتاوا نہیں تھا بلکہ اکتاہٹ کا اظہار تھا۔

"وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے میری جان!" انہوں نے اس کا سر تھپکا اور نرمی سے بولیں۔ "جاؤ.... اب معافی مانگ کر آؤ.... میں جانتی ہوں صباحت آپا اور فضیلہ اسی انتظار میں بیٹھی ہوئی ہوں گی.... ماہ نور! خوش نصیب کے ساتھ جاؤ۔"

"چلو۔" ماہ نور آگے بڑھی۔

"تم رہنے دو۔۔۔ میں خود ہی چلی جاتی ہوں۔۔۔ ایک میرے معافی مانگنے سے ہی ان سب کے احساس برتری کو سکون مل جائے گا۔" اس نے ترنخ کر کہا اور پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

روشن امی اور ماہ نور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔



شام میں منفرا بھی نی بی اور ٹیمی کے ساتھ کلارک اسٹریٹ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

نی بی کو آنے والے موسم کی مناسبت سے اپنے لیے گرم کوٹ خریدنا تھا جب کہ ٹیمی کا اپنے چار سال پرانے بوائے فرینڈ سے نیا نیا بریک اپ ہوا تھا۔ اسے خریداری سے زیادہ کلارک اسٹریٹ میں دوسری چیزوں میں دلچسپی تھی، اسی لیے اس نے لباس ایسا منتخب کیا تھا کہ منفرا نے باقاعدہ سیٹی بجا کر اسے داد دی تھی۔

منفرا اور نی بی کا چونکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا سو انہوں نے اپنے کپڑوں پر کوئی خاص دھیان نہ دیا اور جیکٹس اور گرم اونی ٹوپیاں پہن کر نکل آئیں۔ ابھی بارشوں کا موسم تھا، رات کو ٹھنڈی یخ ہوائیں چلتی تھیں۔ منفرا کو بوائے فرینڈ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور گرم کوٹ خریدنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ڈیڈ مونٹاک میں مچھلیوں کے دوسرے درجے کے بیوپاری تھے۔ ان کے پاس اپنی ذاتی کشتی تھی اور ایک چھوٹا سا دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ تھا۔ مالی اعتبار سے زندگی اچھی گزر رہی تھی لیکن عیاشیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈیڈ اور منفرا کے اصرار پر امی نے اسے نیویارک بھیج دیا تھا یہی بڑی بات تھی۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے منفرا کو پیسے سمجھ داری سے خرچ کرنے کی تاکید بھی کی تھی۔ وہ مہینے میں ایک بار مونٹاک جاتی اور واپسی پر اپنا خیال رکھنے کی ڈھیر ساری تاکید کے ساتھ فضول خرچی سے بچنے کی نصیحتیں بھی ساتھ لے کر آتی تھی۔

منفرا چونکہ سمجھ دار لڑکی تھی سو اس نے ایسی طرز زندگی کو بہت سارے پاکستانی نژاد خاندان کے بچوں کی طرح اپنی جذباتی آزار بننے نہیں دیا تھا۔ وہ بوائیس ہاسٹل میں تھی اور امریکن لڑکیوں کی طرح پارٹ ٹائم ملازمت کر کے اپنے ایکسٹرا اخراجات پورے کر لیتی تھی۔ سو اس سال بھی اس نے اپنے تین سال پرانے کوٹ اور سویٹرز استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اور خود کو سختی سے تاکید کی تھی کہ بازار کم سے کم جائے گی تاکہ نہ نئی ورائٹی دکھے گی نہ اس کا خریدنے کے لیے دل للچائے گا۔ اس روز بھی وہ ہاسٹل میں اکیلی رہ کر بور نہیں ہونا چاہتی تھی سو ان دونوں کے ساتھ چل پڑی۔

سب وے تک انہوں نے پیدل جانے کا فیصلہ کیا اور یہ محض ایک اتفاق تھا کہ زیر زمین ٹرین میں اسے معاویہ نظر آ گیا۔ وہ ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور لاتعلقی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کی گود میں فوربز میگزین پڑا ہوا تھا اور کلائی پر Tag heuer کی گھڑی۔

یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اتنا بہترین سوٹ اور اتنی قیمتی گھڑی پہننے والا شخص ٹرین سے سفر کیوں کر رہا ہے۔

بہر حال منفرا کے علاوہ ٹیمی کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی اور اتنے ہینڈسم اور امیر نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر وہ خوشی سے بے قابو بھی ہونا شروع ہو گئی تھی۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں۔۔۔ دیکھو jesus نے اسے میرے لیے بھیج دیا ہے۔۔۔" اس نے اپنی جیکٹ کی زپ کھولتے ہوئے کہا اندر پہنی ہوئی کالی شرٹ کا گلا بہت گہرا تھا۔

"میرا نہیں خیال اس سے بہتر بوائے فرینڈ مجھے مل سکتا ہے۔" اس نے غیر محسوس انداز میں گہرے گلے کو کھینچ کر کچھ مزید گہرا کیا اور آنکھ کا کونہ دبا کر شرارت سے ہنستی اس کی طرف چلی گئی۔




"تم دیکھنا۔ یہ چار منٹ میں بے عزتی کروا کر واپس آئے گی۔" فی بی نے ہنس کر اگلے ہی منٹ پیش گوئی کی تھی۔
منفرا کا خیال تھا فی بی کا اندازہ غلط ہو جائے گا۔ ٹیمی آج اتنی خوب صورت اور پرکشش لگ رہی تھی کہ منفرا کو یقین تھا کوئی حس لطافت سے عاری انسان ہی ہو گا جو اسے اگنور کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی جب واقعی چند منٹ بعد ٹیمی منہ لٹکا کر ان کے پاس واپس آگئی۔
"ہی از سو روڈ۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ لڑکیوں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔" اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔
ان لوگوں کے پاس سے ہٹ کر وہ معاویہ سے چند قدم دور کھڑی ہو گئی لیکن اس رخ پر کھڑی ہوئی تھی کہ اسے واضح طور پر نظر آتی رہے لیکن جب اس نے ٹیمی کے کھڑے ہونے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تو ٹیمی نے اسے مخاطب کر کے اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی۔ اس سیٹ پر معاویہ نے اپنا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔
معاویہ نے اس کے مخاطب کرنے پر بالکل سرد مہری سے اسے دیکھا تھا اور لیپ ٹاپ اٹھا کر اسے جگہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا ایک لفظی انکار ٹیمی کے دماغ پر جا کر لگا تھا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی جبکہ فی بی اور منفرا اس کی درگت بننے پر خوب ہنسی تھیں۔ ہنستے ہوئے اور ٹیمی کا مذاق اڑاتے ہوئے ان کی آوازیں بلند ہو گئی تھیں اور ارد گرد کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔
ہنستے ہنستے منفرا کی نظر معاویہ پر پڑی تو اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ منفرا سے نظریں ملتے ہی جہاں منفرا کی ہنسی کو بریک لگا تھا وہیں معاویہ نے سرد مہری سے نظریں پھیرلی تھیں اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔
لیکن نظر ملنے کا وہ ایک لمحہ منفرا پر بڑا گراں گزرا تھا۔ اسے اس شخص کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی نظر آئی تھی۔ ہر بار اس شخص پر نظر پڑنے پر وہ اسے پراسرار لگتا تھا لیکن اس بار بے حس لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن منفرا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔



صباحت تائی جان، فضیلہ چچی کے پورشن میں تھیں۔ فہمینہ کی نشاندہی پر وہ انہیں ڈھونڈتی وہاں چلی آئی اور سب سے پہلا ٹکراؤ صیام سے ہوا۔ وہ پاستا کی پلیٹ اٹھائے شاید نہیں یقیناً "کیف" پر اپنے سگھڑاپے سے زیادہ اپنی خوب صورتی کا رعب جمانے جا رہی تھی۔ بینگنی رنگ سے ذرا سے ہلکے رنگ کی گھٹنوں تک آتی اسٹائلش قمیص جس کے دامن پر مردانہ جیبیں لگی ہوئی تھیں، چوڑی دار پاجامے کے ساتھ پہنے دوپٹے سے بے نیاز، کھلے ہوئے سلکی لمبے بال سمیٹ کر ایک کندھے پر آگے کو ڈال لیے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے خوب ہی آفت قیامت لگ رہی تھی۔
لیکن ایک آفت قیامت وہ بھی تھی جو بے دھیانی میں سامنے سے چلی آ رہی تھی اور جبراً "معافی مانگنے" کے لیے بھیجی گئی تھی تو موڈ بھی سخت خراب تھا۔
اب خدا جانے غلطی کس کی تھی لیکن عین دروازے کے بیچ و بیچ دونوں ٹکرائیں اور پاستا کی پوری پلیٹ صیام کی اسٹائلش قمیص کو مزید اسٹائلش بناتی زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی۔
"دیکھ کر نہیں چل سکتیں۔ پلیٹ میرے پاؤں پر لگ جاتی تو۔" خوش نصیب کو اس کی قمیص سے زیادہ اپنے




پیروں کی فکر تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ سارا زمانہ اپنی فکر میں ہلکان ہوتا ہے۔ صیام نے اپنی قمیص اور محنت خراب ہونے کے صدمے سے سنبھل کر اسے غضب ناک نظروں سے گھورا۔

"تم کہاں سے آگئیں؟... مصیبت" وہ بڑبڑائی۔

"دروازے سے۔" وہ تنک کر بولی۔ "اور یہ مصیبت کسے کہا ہے؟"

"پورے گھر میں تمہارے علاوہ اور کوئی ہے جسے یہ لقب دیا جاسکے۔" اپنی محنت اور قمیص خراب ہونے کا اسے بہت ہی صدمہ پہنچا تھا خوش نصیب کو ایسی نظروں سے گھورا کہ اگر آنکھوں سے سچ مچ کی آگ نکل سکتی تو اب تک خوش نصیب جل کر بھسم ہوچکی ہوتی۔

"امی بالکل ٹھیک کہتی ہیں... تم ہو ہی منحوس... جہاں سے گزر جاؤ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کام ٹھیک ہو جائے۔" اس نے پاؤں پٹخے اور پلٹ کر دھپ دھپ کرتی اندر چلی گئی۔

خوش نصیب ایسی باتیں بچپن سے سنتی آئی تھی کبھی موڈ آف ہوجاتا کبھی ساری کی ساری باتیں سیدھی جاکر دل پر لگتیں اور دماغ خراب کردیتیں۔ اب بھی اس نے سر جھٹکا اور اندر کی طرف چل پڑی۔ ٹی وی لاؤنج سے گزر کر اسے فضیلہ چچی کے کمرے تک جانا تھا۔ وہ یا اپنے کمرے میں ہوتیں یا اپنے پورشن کے پچھلے حصے میں پائی جاتیں۔ لیکن فضیلہ چچی سے پہلے اسے شاہجہان عرف مٹھو بھائی نظر آگئے۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے براجمان کوئی سیاسی ٹاک شو دیکھتے ہوئے خود کو بڑا دانشور سمجھ رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ سنجیدہ تاثرات کے باوجود چہرے سے ہونق پن ٹپک رہا تھا۔ خوش نصیب کے کانوں میں صیام کا جملہ گونجا۔ "امی بالکل ٹھیک کہتی ہیں تم ہو ہی منحوس جہاں سے گزر جاؤ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کام ٹھیک ہوجائے۔"

دیو مالائی داستانوں میں جیسے آدم خور انسانی خون کی بو پاکر "آدم بو' آدم بو" کی گردان شروع کردیا کرتے تھے ٹھیک ویسے ہی اس وقت خوش نصیب کے کانوں میں "انتقام' انتقام" کی گردان شروع ہوگئی۔ اس کی آنکھیں عیاری سے چمکیں اور دبے پاؤں شاہجہان بھائی کے پیچھے جاکھڑی ہوئی۔

ٹی وی کی بلند آواز تھی۔ خوش نصیب نے ایک بار بلایا انہوں نے نہیں سنا۔ دوسری بار آواز دی پھر بھی کوئی رسپانس نہ ملا تو اس نے آگے کو جھک کر دیکھا۔ سنجیدہ صورت والے مٹھو بھائی اسے ہمیشہ سے زیادہ مزاحیہ لگے تھے اس وقت۔

"طوطے بھائی! آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے؟" وہ بالکل ان کے کان کے قریب ہوکر چلائی۔

محترم دانشور ٹاک شو میں بری طرح غرق تھے۔ اس افتاد پر اس بری طرح ہڑبڑائے کہ اپنی جگہ سے دو فٹ اچھلے اور ریموٹ نے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں قلابازی کھائی اور ٹھاہ کرکے ٹی وی اسکرین سے ٹکرایا۔

"کک... کیا؟ کیا ہوا خوش نصیب؟" دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھے وہ بس بے ہوش ہونے کے قریب تھے۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔" اس نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جتنی بری طرح ریموٹ ٹکرایا ہے... ہونہہ ہے... اسکرین ضرور ڈیمج ہوئی ہوگی۔"

"نہیں میں ٹی وی کا نہیں پوچھ رہا... تم اتنی زور سے بولیں کیوں؟"

"زور سے نہ بولتی تو کیا کرتی... کب سے بلا رہی ہوں لیکن آپ سن ہی نہیں رہے تھے طوطے بھائی..." اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ طوطے بھائی نے فوراً برا مان کر جملہ اچکا۔

"بات سنو لڑکی! میرا نام شاہجہان ہے۔"

"اتنا مشکل نام..." اس نے بے بسی سے کہا۔ "میں تو طوطے بھائی ہی کہوں گی۔" ٹھنک کر کہا گیا۔

"سارے گھر والے پیار سے مٹھو کہتے ہیں... تم بھی یہی کہہ لیا کرو۔ لیکن یہ طوطا مت کہو... سچ بہت برا لگتا

ہے ہمیں۔" انہوں نے التجا کی

"ہائے۔۔۔" واری صدقے ہوتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ "کتنے معصوم ہیں آپ طوطے بھائی! یہ جو آپ کے گھر والے ہیں۔۔۔ کوئی پیار دیار سے مٹھو نہیں کہتے۔۔۔ یہ تو آپ کی طوطا ناک کی وجہ سے یہ نام رکھا ہوا ہے۔۔۔ ایک بار مجھے فضیلہ چچی نے خود بتایا تھا۔۔۔ ہائے یہ میں کیا بول گئی۔" اف کیا زبردست اداکاری تھی۔ کسی فلم یا ڈرامے میں چانس ملتا تو اس سین کے لیے ضرور آسکر ایوارڈ کی نامزد ٹھہرائی جاتی۔

مٹھو بھائی کا منہ مارے صدمے کے کچھ اور ہونق لگنے لگا۔ ایک تو وہ بیچارے پیدائشی "بھولے" اوپر سے خوش نصیب کے ہتھے چڑھ گئے۔۔۔ سمجھو مرے پہ سو درے والا حساب ہوا۔

"کک۔۔۔ کیا بتایا تھا امی نے؟"

"چھوڑیں۔۔۔ رہنے دیں۔۔۔ خوامخواہ آپ کا دل برا ہوگا۔" بڑا اپنی سی بن کر بولی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ تم بتاؤ اب ایسا بھی نازک دل نہیں ہے میرا۔" خوش نصیب کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ ٹوہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

"چچی مجھ سے خفا ہو جائیں گی طوطے بھائی! کہ آپ کو اتنے راز کی بات کیوں بتائی۔" وہ لاچاری سے بولی۔

"ارے اب بتا بھی چکو۔ امی کو کون بتائے گا کہ تجھے تم نے بتایا ہے۔" وہ رونے والے ہو گئے۔

"اچھا۔۔۔" اس نے سوچا پھر بولی۔ "اب آپ اتنا مجبور کر رہے ہیں تو بتا ہی دیتی ہوں۔ جب آپ پیدا ہوئے تو چچی فضیلہ کی سہیلیاں آپ کی ٹیڑھی ناک دیکھ کر مذاق اڑایا کرتی تھیں۔۔۔ کہ فضیلہ! اللہ نے پہلوٹھی کی اولاد کیسی ٹیڑھی ناک والی دے دی ہے اس کی ناک تو میاں مٹھو سے ملتی ہے۔ سب آپ کو مٹھو بلاتی تھیں۔۔۔ ان کے دیکھا دیکھی صیام نے بھی آپ کو مٹھو کہنا شروع کر دیا۔۔۔ اب آپ کا دل رکھنے کے لیے چچی نے کچھ تو کہنا تھا۔۔۔ سو کہہ دیا مٹھو پیار کا نام ہے۔ اچھا۔۔۔ صباحت تائی جان کہاں ہیں۔۔۔؟ صیام کہہ رہی تھی یہیں کہیں ہیں۔" وہ صدمے سے نڈھال تھے چونک کر بولے۔

"امی کے کمرے میں دیکھ لو۔۔۔ وہیں ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" وہ اٹھلاتی ہوئی جانے لگی پھر رکی اور بولی۔

"آپ دل چھوٹا نہ کریں طوطے بھائی! صیام آپ کو چڑانے کے لیے مٹھو کہتی ہے تو کیا ہوا۔۔۔ چچی کے تو آپ بیٹے ہیں وہ تو پیار سے ہی کہتی ہوں گی۔" اسے تسلی دی اور مزے سے کہہ کر چلتی بنی۔ ٹی وی کے سامنے کھڑے مٹھو بھائی نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں رگڑیں اور صیام کے کمرے کا رخ کیا۔

خوش نصیب نے دل ہی دل میں قہقہے لگائے۔ معافی کا کیا ہے مانگ ہی لے گی۔ بچپن سے ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے مانگتی آئی تھی۔ لیکن اب جو صیام کے کمرے میں طوفان آنا تھا اس نے دل کی ہر خلش کو مٹا دینا تھا۔

اسے اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ فضیلہ چچی کی بات پر بھی از سر نو یقین آیا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھیں۔ خوش نصیب کہیں سے گزر جائے اور وہاں کوئی طوفان نہ آئے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اتنی بڑی عمر کی خاتون کہتی ہیں تو ٹھیک ہی کہتی ہوں گی۔



کلارک اسٹریٹ میں ونڈو شاپنگ کرتے، ٹیمی کے ساتھ مختلف کوٹ اور جیکٹس پہن پہن کر دیکھتے ہوئے بھی وہ منفرد اکے دماغ سے نہیں نکلا۔ شاید یہ اس کے بارے میں اتنا زیادہ اور بار بار سوچنے کا اثر تھا کہ دو چار لوگوں پر اسے اسی شخص کا گمان ہوا۔ ایک بار ایسا لگا جیسے وہ بالکل اس کے پاس سے ہو کر گزرا ہو۔ دوسری بار وہ اسے کافی

شاپ کے دوسری طرف کھڑا نظر آیا اور تیسری بار فرانسیسی طرز کے ہیٹ میں چھپا ہوا چہرہ اسی کی شباہت لیے محسوس ہوا۔ منفرا جھنجلا سی گئی اور جب ٹیمی ایک جینز ٹرائی کرنے کے لیے ٹرائی روم میں گئی تو اس نے بی بی سے پوچھا۔

"بی بی! تم اس لڑکے کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں؟"

"کون سا لڑکا؟" بی بی ہینگرز میں ڈھیلے کی ہوئی شرٹس دیکھ رہی تھی۔

"وہی۔ جو ابھی ٹرین میں تھا۔ ایرک کے دوست کا کزن۔" منفرا نے اپنے لہجے کو حتی المقدور سرسری بنا کر پوچھا تھا۔

بی بی نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ "کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں.... ویسے ہی پوچھا تھا۔" منفرا نے جلدی سے کہا۔

بی بی مسکرانے لگی اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ "یہ بات تم اس سے کہو جو تمہیں جانتا نہ ہو.... پہلے تو تم نے کبھی کسی کے بارے میں اتنے سوال نہیں پوچھے.... کسی کے بارے میں اتنی پر تجسس نہیں ہوئیں۔"

"بی بی! میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا...." اس نے ہنس کر اور زور دے کر کہا تھا لیکن بی بی کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا وہ ایسے ہی معنی خیزی سے مسکراتی رہی۔

"تمہیں وہ اچھا لگ رہا ہے کیا؟" شرارت سے اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔

منفرا جھینپ سی گئی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اوہ کم آن.... تمہیں مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے منفا!" اتنے سالوں کی دوستی کے باوجود وہ اس کا نام صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں بول پاتی تھی اسی لیے اسی لیے اسے منفا کہتی تھی۔

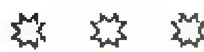
"مجھے خوشی ہوگی اگر تمہاری زندگی میں بھی ایک بوائے فرینڈ آجائے۔" بی بی ابھی بھی سنجیدہ نہیں ہو رہی تھی۔ منفرا ہنسی اور بے بسی والے انداز میں وضاحت دینے لگی۔

"وہ صرف میرے دماغ سے نہیں نکل رہا.... صرف اتنی سی بات ہے.... میرا اسے بوائے فرینڈ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں...." وہ کسی طرح یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ "ویل ایک بار ٹیمی سے ضرور ڈسکس کر لینا.... ابھی اس کی جتنی انسلٹ ہوئی ہے میرا نہیں خیال وہ تمہیں الاؤ کرے گی کہ اس بندے سے کوئی ریلیشن شپ بناؤ۔" وہ مزے سے مشورے دیتی جا رہی تھی۔

"شٹ اپ بی بی!" منفرا نے ہنستے ہوئے ہاتھ میں پکڑا والٹ اسے کھینچ مارا۔

بی بی بھی ہنسنے لگی۔ اسی وقت ٹیمی ٹرائی روم سے باہر آگئی تو ان دونوں نے ہی موضوع بدل دیا۔



رات تک خوش نصیب کے اٹھائے ہوئے طوفان نے سارے گھر میں اپنی تباہ کاریاں پھیلا دی تھیں۔

شاہجہان نے صیام کے سلکی بال نوچ نوچ کر کچھ جڑ سے اکھاڑ دیے باقی جو بچے وہ خود رو جھاڑیاں دکھائی دینے لگے۔

صیام نے بے شک ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی تھیں لیکن بدلہ لینے میں چوک جانا اس نے بھی نہیں سیکھا تھا' سو اپنا ناک کر گلدان مارا کہ بڑے بھائی کی ناک کے معمولی سے خم کو بالکل ہی ٹیڑھا کر دیا۔ عینی شاہدین بتاتے ہیں کہ خون کا فوارہ نکلا تھا مٹھو کی ناک سے اور پورا فرش خون و خون ہو گیا تھا۔ روشن امی' نانی اور ماہ نور کو افسوس

ہوا لیکن فائدہ یہ ہوا کہ خوش نصیب کی بدتمیزی کی داستان وقتی طور پر دب گئی اور جس کی یہ ساری کارستانی تھی وہ کچی اینٹوں والے ٹھنڈے کمرے میں نانی کے پلنگ پر لیٹ کر ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب پڑھتی رہی اور اونچے اونچے قہقہے لگاتی رہی۔

رات گئے اس نے آواز دبا کر لیکن خوب ہنس ہنس اپنا کارنامہ ماہ نور کو سنایا۔ ''دنیا کے سارے شیر جوان مرگئے ہیں جو میں شاہجہان کو پیار سے کچھ کہوں؟... ہم تو بھئی... طوطے بھائی ہی کہیں گے۔''

فرش پر بچھائے ہوئے بستر میں گھسی ایک ہاتھ کی کہنی کھڑی کرکے اس پر سر رکھے لیٹی وہ جیسے اپنی ہی بات سے محظوظ ہوتی تھی۔ ماہ نور کو ہنسی آئی لیکن حیرانی زیادہ تھی۔ خوش نصیب کا دماغ ایسے معاملات میں زرخیز تھا وہ جب چاہتی جہاں چاہتی اگلے کو تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیتی۔ ماہ نور صبر و تحمل سے اچھے وقت کی آس میں زندگی گزار دینے پر یقین رکھتی تھی۔

''بہت ہی بدتمیز واقع ہوئی ہو ویسے تم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بلکہ کچھ ملامتی انداز میں کہا تھا۔

''شکریہ۔'' خوش نصیب ڈھٹائی سے دانت نکالتی ایک ہاتھ سے کورنش بجالائی۔

''فضیلہ چچی کو پتا چلا تو... سمجھو تمہاری خیر نہیں ہے۔''

''ارے جاؤ... میں کسی سے نہیں ڈرتی۔'' اس نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر جیسے مکھی اڑائی اور کروٹ بدل کر چت لیٹ گئی۔

''تم نہیں ڈرتیں لیکن امی ڈرتی ہیں...'' ماہ نور نے نرمی سے اور آہستگی سے کہا تھا' ساتھ ہی ایک نظر چپکے سے روشن امی کی طرف بھی دیکھا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے پر نانی اور روشن امی کے پلنگ برابر برابر بچھے ہوئے تھے۔ اور دونوں ہی گہری نیند سو رہی تھیں۔

''کیوں ڈرتی ہیں؟ یہی ان کی غلطی ہے' غلطی تھی۔'' اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے ''ہے اور تھی'' پر زور دے کر کہا تھا۔

''جب وہ حق پر تھیں تو ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا چاہیے تھی... اگر تب بھی حق نہ ملتا تو اسے چھین لینا چاہیے تھا... لیکن انہوں نے ڈر ڈر کر زندگی گزار دی۔''

''ایسے نہیں ہوتا ناں خوش نصیب! عورت کو ڈر کر ہی رہنا پڑتا ہے۔ یہ اس دنیا کا اصول ہے۔''

''انسان اپنے اصول خود بناتا ہے اور ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے دنیا کے سامنے ڈٹ جاتا ہے... جو دنیا کے بنائے ہوئے اصول فالو کرتا ہے میرے نزدیک وہ بزدل ہے۔''

ماہ نور کو اس کی بات سے صدمہ پہنچا۔ ''روشن امی کو بزدل کہہ رہی ہو... ہمارے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی برباد کردی۔''

''دھت تیرے کی... انہیں کیسے بزدل کہہ سکتی ہوں؟ میرے جیسی بہادر بیٹی کی ماں بزدل ہو بھی نہیں سکتی... وہ تو میری آئیڈیل ہیں... ایسی بہادر' ایسی عظیم کہ میرا دل چاہتا ہے ان کا مجسمہ بنوا کر شہر کے سب سے بڑے چوک میں لگوا دوں... یادگار کے طور پر...'' بولتے بولتے اس کی آواز نیند کے جھونکوں میں جھولنے لگی اور پھر بولتے بولتے ہی وہ گہری نیند سو گئی۔

خدا جانے خوش نصیب نے یہ بات سیریس ہو کر کہی تھی یا مذاق میں کہہ گئی تھی۔ ماہ نور سمجھ نہ سکی۔ ویسے بھی خوش نصیب مذاق مذاق میں بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ اور جو کچھ سنجیدہ ہو کر کہتی تھی وہ تو اس ''بہت کچھ'' سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔

ماہ نور نے گہرا سانس بھر کر اسے دیکھا۔ سوتے ہوئے کیسی معصوم سی لگ رہی تھی اور جاگتے میں پوری دنیا کے

لیے بھی چھل پیری بن جاتی یعنی جس کے پیچھے پڑجاتی پھر اس کی جان آسانی سے نہ چھوڑتی۔ ماہ نور کو بے اختیار اس پر پیار آیا تو جھک کر اس کی پیشانی کو چوما' اس کا لحاف درست کیا اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تو ماضی کے کتنے ہی لمحے نیند کی دہلیز سے جھانکنے لگے۔

اس کے ابو باسط احمد کا جب انتقال ہوا تو وہ تین سال کی تھی اور خوش نصیب تین دن کی۔ ابو نے بڑی محبت سے اس کا نام خوش نصیب رکھ دیا لیکن جب ایک تیز رفتار گاڑی انہیں کچل کر نکل گئی تو دنیا نے اسے بدنصیب ہی تصور کرلیا۔

لیکن ماہ نور کو اور روشن امی کو وہ اچھی لگتی' بڑی بڑی آنکھوں اور گندمی رنگت والی گڑیا۔ لیکن ماہ نور کی طرح اس کے مزاج میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ بات روشن امی ہمیشہ کہتی تھیں۔

اور وقت نے ثابت کیا ان کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کی طبیعت میں بغاوت تھی' وہ لڑنے بھڑنے پر تیار رہتی' جو چیز چاہیے اسے چھین کر حاصل کرلیتی لیکن دستبردار نہ ہوتی۔ پتا نہیں وہ ہر چیز کو روشن امی اور ماہ نور کی طرح جو ہے' جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کیوں نہیں کرلیتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا پتھروں سے بھی بیر باندھ لے کہ اس کی مرضی کی شکل میں کیوں نہیں ڈھلتے۔

روشن امی کو ایک پرسکون' پر آسائش زندگی فراہم کرنا اس کی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ بچپن میں روشن امی کو فرش پر پونچا لگاتے ہوئے دیکھتی تو کہتی۔ "بڑی ہو کر کام والی ماسی بنوں گی تاکہ آپ کو — پونچا نہ لگانا پڑے۔"

ایک بار انہوں نے بتادیا' تمہارے ابو کے گھر پر چچا تایا نے قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی وکیل کا بندوبست کریں جو قبضہ چھڑوا دے۔

اس روز خوش نصیب نے طے کیا وہ بڑی ہو کر وکیل بن جائے گی۔ لیکن روشن امی کی آنکھوں میں آنسو آنے نہیں دے گی۔

اب بڑی ہو گئی تھی لیکن نہ کام والی ماسی بن سکی تھی نہ وکیل اور نہ ہی روشن امی کی آنکھوں کے آنسو روک پائی تھی۔ یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خلش تھی اور یہی دنیا سے اس کا سب سے بڑا جھگڑا!۔ یہی سوچتے سوچتے ماہ نور بھی گہری نیند سو گئی۔



اس رات وہ تینوں بہت لیٹ واپس آئی تھیں۔ ٹیمی کو بوائے فرینڈ نہیں ملا لیکن دو اچھے کوٹ اور ایک لیدر جیکٹ مل گئی۔ بی بی کو کوئی بھی چیز پسند نہیں آئی' سو وہ آج کل میں دوبارہ کلارک اسٹریٹ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ منفرا آتے کے ساتھ ہی سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن آنکھیں بند کرتی تو سامنے معاویہ کا چہرہ آجاتا اور اس کی آنکھوں کی سفاکی اسے بے چین کرنے لگتی۔

"تم نے اس کی آنکھیں دیکھیں بی بی؟" ٹیمی نے اچانک پوچھا وہ اپنے کوٹ پہن پہن کر دیکھ رہی تھی۔

"بہت بری آنکھیں تھیں اس کی۔" اس سے پہلے کہ بی بی کوئی جواب دیتی' خود اسی نے ناک چڑھا کر کہا۔

"بری —؟" بی بی کو حیرانی کا جھٹکا لگا۔ وہ پڑھنے کے لیے اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھ چکی تھی' مڑ کر ٹیمی کو دیکھا۔

"اب اس نے تمہیں لفٹ نہیں کروائی تو تم اس کی اتنی برائی تو مت کرو۔ اچھی خاصی اٹریکٹو آنکھیں تھیں اس کی۔"

"نہیں — ٹیمی ٹھیک کہہ رہی ہے۔" منفرا نے کہا۔ "عجیب سی آنکھیں تھیں اس کی۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

○ ○ ○

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

☆ ☆

[illegible]

اس نے سر اٹھایا اور پائن کے درختوں میں گھری اس تین منزلہ پر شکوہ عمارت کو دیکھا جس پر اسرار کا سایہ محسوس ہوتا تھا۔

معاویہ نے ہاتھ بڑھایا تو پھاٹک خود بخود کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر آگیا۔ عمودی پہاڑ کے سینے پر لمبی سرمئی روش بچھی تھی جو سیدھی عمارت کے مرکزی عالی شان دروازے تک جاتی تھی۔ روش کے دونوں طرف اور عمارت کے چار اطراف وسیع و عریض لان تھے اور پر اسرار خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ روشنی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ لیکن مٹے مٹے سے مناظر تھے' کچھ بھی واضح نہ ہوتا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچا تو مرکزی دروازہ ایسے کھلا جیسے دربان اسی کے منتظر ہوں۔

وہ جھجکتا ہوا سا اندر آگیا۔ اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ بڑی بڑی کھڑکیاں۔ بہت بڑا ہال نما گول کمرہ۔ جس کے اطراف سے راہداریاں نکلتی ہوئی کہیں اندر غائب ہو رہی تھیں۔ راہداریوں ــ کے سامنے موتیوں کی لڑیوں کے پردے تھے اور ان لڑیوں کے پیچھے کا منظر تاریک اور ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا۔ سامنے آدھے دائرے کی شکل کی دو طرفہ سیڑھیاں' جو نرم قالینوں سے ڈھکی تھیں۔ درمیان میں شاہانہ صوفے بچھے تھے' داہنے ہاتھ لکڑی کا بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ اوپر ایک بہت بڑا فانوس تھا۔ جو ہوا سے لرز رہا تھا اور ایک خاص طرح کا ردھم پیدا کر رہا تھا۔

اچانک کوئی چیز پوری قوت سے پیانو پر آگری۔ ہیبت ناک شور اس کے دماغ کو جھنجوڑنے لگا۔ اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ تو سکوت چھا گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دنگ رہ گیا۔

وہ ایک تابوت میں قید تھا اور تابوت کی چھت دھیرے دھیرے اس کی طرف آرہی تھی۔ معاویہ کا سانس گھٹنے لگا۔ چیخنا چاہا تو آواز نے حلق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے زور زور سے ہاتھ چلائے۔ کہیں سے سانس کی رمق ملے ــ اسے آزادی ملے لیکن ــــ

معا" پروں کے پھڑپھڑانے کی تیز تیز آواز آنے لگی۔ روشنی پوری شدت سے اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اسے یوں لگا کہ اسے نگل ہی لے گی۔ یہ ایسا خوفناک احساس تھا کہ نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

بیڈ کے قریب میز پر رکھا اس کا موبائل فون پچھلی رات سیٹ کیے گئے الارم کے تحت مسلسل بج رہا تھا۔

خواب کے اثر سے نکلنے میں اسے چند منٹ لگے تو اس نے دیکھا وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ کے آرام دہ بیڈ روم میں ــ یہ بروکلین ہائٹس تھا نیویارک کا پوش علاقہ۔ بشام سے کئی سو میل دور ــــ

راتوں رات وہ کیسے وہاں جا سکتا ہے اور تابوت میں قید ہو سکتا ہے۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے خود کو تسلی دی تو گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے چہرہ پونچھا۔ اپنی بے حس آنکھوں کو نرمی سے دبایا پھر ہاتھ بڑھا کر الارم بند کرنے کے لیے موبائل اٹھانے لگا تو بے دھیانی میں موبائل کے ساتھ رکھی سرمئی جلد والی ڈائری پر ہاتھ لگا۔ معاویہ نے چونک کر دیکھا اور ڈائری اٹھالی۔ سرمئی جلد پر بریل کے ہندسوں کی طرح سیاہ رنگ سے ایک نام ابھرا ہوا تھا۔

"دسامہ طالب۔" اس نے انگوٹھے سے ابھرے ہوئے لفظوں کو چھوتے ہوئے زیر لب نام پڑھا۔

ایک جھٹکے سے کمبل ہٹایا۔ ڈائری واپس میز پر رکھی۔ بستر سے نکلا۔ ڈائری نیچے قالین پر گر گئی۔ معاویہ نظر انداز کر کے باتھ روم میں چلا گیا۔ بیڈ کے قریب میز پر رکھے موبائل کا الارم ابھی بھی مسلسل بج رہا تھا۔



کیف نے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے مدھم سی "ہوں" سنائی دی تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجائے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ عرفات ماموں اپنی آرام دہ کرسی پر جھول رہے تھے اور ابن خلدون کی پانچویں جلد پڑھنے میں مصروف تھے۔ کمرے میں کتابوں کے بوسیدہ پن کی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عرفات ماموں نے چشمے کے اوپر سے اندر داخل ہونے والے کو دیکھا اور والہانہ استقبال کیا۔

"ارے کیف صاحب! آیئے آیئے... آج تو ضرور سورج مغرب سے نکلا ہو گا... جو بڑے بڑے لوگ ہمارے کمرے میں تشریف لائے ہیں۔" کیف مسکراتا ہوا ان کے پاس آگیا اور مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں کل بھی آیا تھا... لیکن آپ پتا نہیں کہاں غائب تھے۔"

"میں ذرا چہل قدمی کرنے چھت پر چلا گیا تھا... شیرو نے بتایا تھا مجھے کہ تم آئے تھے۔" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے ملازم لڑکے کا نام لیا تھا۔

"چہل قدمی کرنے گئے تھے یا تانک جھانک کرنے؟" بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص شرارتی انداز میں کہا۔

عرفات ماموں نے چشمے کے اوپر سے ابرو اچکا کر اسے دوبارہ دیکھا۔ ہونٹ دبا کر مسکرائے۔ ان دونوں کی عمروں میں فرق تھا لیکن حس مزاح میں بڑی مماثلت تھی سو دونوں کی بنتی بھی خوب تھی۔

"بزرگوں سے مذاق کرتے شرم نہیں آتی برخوردار!"

"ارے واہ..." اس نے کرسی لا کر ان کے سامنے رکھی اور ٹھنک کر بولا۔ "بزرگ آس پڑوس کی آنٹیاں تاڑتے نہ شرمائیں اور ہم بات کرتے ہوئے شرمائیں... کیا بات ہے آپ کی۔ کل ہی ساتھ والی نعمی آنٹی امی سے شکایت لگا کر گئی ہیں... کہ آپ کا بھائی سارا دن منڈیر سے لٹک کر ہمارے گھر کنکریاں پھینکتا رہتا ہے۔"

"اچھا تو کیا جواب دیا آپا نے؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"امی بھی آپ ہی کی بہن ہیں کہنے لگیں... صبر کرو بہن! جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہیں۔" عرفات ماموں کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"کیا بکتے ہو... یہ کام تو میں نے جوانی میں نہ کیا تو اب کیا کروں گا۔"

"جانے دیں ماموں! آپ کی جوانی کے قصے میں نے امی سے کئی بار سنے ہیں... شکیلہ خالہ کی بیٹی نے آپ کے لیے اپنی کلائی کاٹ لی تھی... سارا خاندان جانتا ہے۔" شرارتی انداز میں وہ مزے سے بولتا جا رہا تھا۔

"ارے وہ تو اس کی اپنی حماقت تھی... میں نے کوئی وعدے تھوڑا ہی کیے تھے۔" وہ جھینپ کر بولے۔

"ہمیں کیا معلوم۔" کیف نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا جیسے جتا رہا ہو "اسے ان کی بات پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔"

"امی تو کہتی ہیں فیروز چچا کی بہن ایک رات گھر سے بھاگ کر آ گئی تھیں... کہ دلہن بنوں گی تو عرفات کی بنوں گی... ورنہ سولی پر لٹک جاؤں گی۔" وہ دور پرے کے رشتہ داروں کے نام لے رہا تھا۔ عرفات ماموں سن سن کر محظوظ ہوتے رہے۔

"آپا کی باتوں پر دھیان کم دیا کرو... انہیں تو یہی لگتا تھا ان کے شیر جوان بھائی کے لیے ساری دنیا کی لڑکیاں خودکشی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔"

"شیر جوان بھائی میں بھی تو کچھ نہ کچھ گُن ہوں گے۔" وہ شرارت سے بولا۔ "وہ راحیلہ باجی والا قصہ تو مجھے بھی کچھ کچھ یاد ہے... جن کے ساتھ آپ گولا گنڈا کھاتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔" وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

"تم انسان کا بچہ ہو یا وکی پیڈیا جس کی یادداشت سے کوئی بات نہیں مٹتی۔" انہوں نے کتاب کا صفحہ پلٹ کر

شانی لگائی اور بولے۔
"اس وقت تم جھولے میں ہوگے۔ جتنی پرانی یہ بات ہے۔"
"یعنی کوئی نہ کوئی قصہ تھا ضرور۔" اس نے فوراً" کہا۔ "بس مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔" وہ ہنسا عرفات ماموں جھینپ گئے۔
"بہت ہی شیطان ہو تم۔ خوش نصیب بالکل ٹھیک کہتی ہے۔"
"کیا کہتی ہے خوش نصیب؟" اس کے کان کھڑے ہوئے۔
"یہی کہ کیف جیسا خبیث ابھی تک اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔"
کیف جی بھر کے بدمزہ ہوا انگلی سے سر کھجا کر بولا۔ "بس یہ بھی اس کی محبت ہے کہ ایسے کمنٹس دیتی رہتی ہے ... ورنہ آج کی دنیا میں کون کسی کی تعریف کرتا ہے۔" عرفات اس بار اپنا قہقہہ روک نہیں پائے اور جی بھر کر اس کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوئے۔ کیف بھی زیر لب مسکراتا رہا۔ وہ جانتا تھا اس کی مسکراہٹ کمال کی ہے سو فیاضی سے اپنی مسکراہٹ کی کرنیں بکھیرتا رہتا۔ آنکھیں یوں بھی شرارت کی پوٹلی تھیں۔ بڑی روشن اور چمک دار۔ بات کرتا مسکرا کر' غصہ کرتا تو بھی مسکراتا ہی رہتا۔
صباحت تائی جان بتاتی تھیں' وہ سوتے ہوئے بھی مسکرا رہا ہوتا ہے۔ خوش نصیب نے جب یہ سنا تو اندازہ لگایا جس روز کیف مرے گا اس روز بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوگی۔ یہ شکر ہے کہ اس بات کا اظہار اس نے کیف کے سامنے بھی اسی وقت کیا' جب وہ ان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جواب میں نانی کی کسی میزائل کی رفتار سے اڑتی ہوئی چپل آئی اور آکر اس کی کمر پر لگی۔ کیف دل کھول کر ہنسا۔ خوش نصیب نے اس دن کے بعد سے اپنے اس نادر خیال کا اظہار کسی کے بھی سامنے کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن کیف کو اس "کسی" کی لسٹ سے نکال دیا۔
"آپ نے مجھے بلوایا کیوں تھا؟ کوئی کام تھا۔" اسے یاد آیا تو پوچھا۔
"ہاں .... کل پرسوں .... جب بھی تمہیں فرصت ملے .... چوبرجی والی دکانوں کا کرایہ وصول کرنے چلے جانا .... کچھ دنوں سے میری کمر میں درد ہے .... میں جا نہیں پاؤں گا۔"
"آپ مجھے کرائے کے اندراج والی ڈائری دے دیں .... یہ کام آج ہی کرلیتا ہوں .... ہوسکتا ہے کل اسلام آباد چلا جاؤں۔"
"اسلام آباد کیوں؟"
"آج کل یونیورسٹی میں چھٹیاں چل رہی ہیں .... تو ہم دوستوں نے سوچا تھوڑی اوننگ ہی کرلی جائے .... فہد رتی گلی میں کوئی پراجیکٹ مکمل کروا رہا ہے .... کب سے دعوت دے رہا تھا میں نے سوچا چلو اسی بہانے فہد سے بھی مل آتا ہوں۔" اس نے اپنے بچپن کے دوست کا نام لیا۔
"اچھا سنو .... شیرو بتا رہا تھا کل بڑا ہنگامہ ہوا؟" عرفات ماموں نے بات چھیڑی اور جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"کون سے ہنگامے کی بات کررہے ہیں؟ جو خوش نصیب نے مچایا یا شاہجہان بھائی والے ہنگامے کی خبر ملی ہے آپ کو۔"
"خوش نصیب والی بات بتاؤ یار! شاہجہان کا قصہ پھر کبھی سنوں گا۔" تحمل سے بولے۔ کیف نے گہری سانس بھری اور ذرا سی شرمندگی کے ساتھ بولا۔
"غلطی میری ہے .... نہ میں خوش نصیب کو چڑانے جاتا .... نہ وہ اتنا زور سے بولتی اور نہ امی کے کان میں آواز جاتی۔"

"ہوں۔۔۔" عرفات ماموں نے ایسے سرہلایا جیسے کہہ رہے ہوں میرا یہی اندازہ تھا۔ پھر بولے۔
"تمہاری اماں تو بہت غصے میں ہوں گی؟"
کیف نے اس بار بھی اثبات میں سرہلایا۔ "کچھ غصہ تھا کچھ فضیلہ چچی نے ان کے غصے کو ہوا دے دی۔۔۔ اور آپ دیکھیں ناں۔ خوش نصیب کو کیا ضرورت تھی اتنا بولنے کی۔۔۔ تھوڑا تو خیال رکھنا چاہیے تھا کہ امی اس کی ہونے والی ساس ہیں۔" وہ ذرا جھنجلا رہا تھا۔
عرفات ماموں اس کے پر اعتماد پر ہنسے اور مذاق اڑانے والے انداز میں اسے رشک سے دیکھا۔
"واہ۔ کیا کانفیڈنس ہے۔۔۔ وہ تمہاری شکل دیکھنے پر راضی نہیں ہوتی اور تمہیں لگتا ہے وہ تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔"
کیف لاپروائی سے بولا۔ "مجھ سے نہیں کرے گی تو کس سے کرے گی؟ اس پوری دنیا میں مجھ سا باحوصلہ انسان اور کوئی نہیں ہے جو اس چمچاک (چمگادڑ) کے نخرے برداشت کر سکے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ اور جادوئی محبت اس کے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ عرفات ماموں نے اس پیارے سے لڑکے کو بڑی محبت سے دیکھا۔
"اتنی محبت کرتے ہو تو اسے بتاتے کیوں نہیں ہو؟"
"کتنی بار بتاؤں؟" اس نے ترنت انہی سے پوچھا۔ "سو دفعہ بتا چکا ہوں۔۔۔ وہ یقین ہی نہیں کرتی۔۔۔" معصومیت سے کہا۔
"تمہارا طریقہ غلط ہے۔" انہوں نے رسان سے کہا۔ "محبت کا یقین دلانا ہو تو محبت ظاہر کرنی پڑتی ہے۔۔۔ دل کھول کر سامنے رکھنا ہوتا ہے۔۔۔ کہ دیکھو یہ ہے تمہارا خانہ۔۔۔ یہاں لکھا ہے میں نے تمہارا نام۔۔۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکتی۔۔۔ میں تمہارے لیے چاند تارے توڑ کر لا سکوں یا نہیں۔۔۔ تمہیں دنیا کی ہر مشکل گھڑی سے بچاؤں گا۔۔۔" کسی خیال کی رو میں وہ بولتے گئے۔ کیف نے انہیں مسکراتے ہوئے سنا اور جب وہ چپ ہوئے تو بولا۔
"کتنا اچھا بول لیتے ہیں آپ۔۔۔ روشن چچی کے سامنے کبھی کیوں نہیں بولے؟" عرفات ماموں تھم سے گئے۔ ایک معمولی سے جملے نے انہیں کئی سال پیچھے پہنچا دیا تھا۔ پھر انہوں نے گہری سانس بھری اور قطعیت سے بولے۔
"یہ گئے دنوں کی بات ہے کیف! اور میں ماضی میں زندگی بسر کرنے کے سخت خلاف ہوں ہم سے پہلے بھی کہا تھا اب پھر کہہ رہا ہوں۔۔۔ یہ ذکر مت کیا کرو میرے سامنے۔" کیف چپ سا ہو گیا۔ پھر دیر بعد بولا۔
"ٹھیک ہے، جیسے آپ خوش، لیکن مجھے مت سکھائیں؟ جس نے محبت اور عشق سے متعلق سارا فلسفہ آٹھویں کلاس میں ہی گھول کر پی لیا تھا۔" اس نے شرارت سے آنکھیں چمکائیں۔
"خوش نصیب میری محبت پر اعتبار کرے یا نہ کرے۔۔۔ ایک بات آپ لکھ کر رکھ لیں۔۔۔ خوش نصیب صرف میرا نصیب ہے۔۔۔ کسی اور کا میں اسے ہونے ہی نہیں دوں گا۔" جگمگاتی آنکھوں کے ساتھ اس نے دعوا کیا تھا اور اس طرح کہتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے وہ اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ عرفات ماموں نے بے ساختہ اس کے حق میں دعا کی تھی۔
"شیرو کہاں ہے؟۔۔۔ میں ذرا اسے چائے کے لیے کہہ کر آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ عرفات ماموں اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے پھر دوبارہ سے کتاب کھول لی۔



اس صبح وہ پارک جانے کے بجائے سڑکوں پر ہی پھرتا رہا۔ بروکلن ہاؤس پر یہ صبح بارش کا لبادہ اوڑھ کر اتری۔

تھی۔ معاویہ کبھی رک جاتا کبھی بھاگنے لگتا۔ اسے ٹھنڈ سے فرق پڑ تا تھا نہ ننھے ننھے بارش کے قطروں سے۔ آنکھیں ہی نہیں جیسے وجود اور دل بھی بے حس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بھاگتا رہا' چلتا رہا لیکن اندر کا اضطراب کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کچھ یادیں تھیں جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ کچھ آوازیں تھیں جو مسلسل اس کے تعاقب میں بھاگتی چلی آرہی تھیں۔ گزشتہ رات نظر آنے والا خواب پچھلے کئی خوابوں کی طرح اس کے دماغ پر سوار ہو چکا تھا۔ کچھ آوازیں تھیں' کچھ جملے تھے جو مسلسل اس کے دماغ پر ہتھوڑا بن کر ضربیں لگا رہے تھے۔

"مجھے خوف آتا ہے... ایسا لگتا ہے وہ ہر وقت میرے آس پاس ہے۔"

"اس کی موجودگی میں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سارے جسم پر چیونٹیاں چل رہی ہوں۔"

"اس کی انگلیاں میری گردن پر ہوتی ہیں... میں محسوس کر سکتا ہوں... اس کے ہاتھ گندے چپ چپے ہوتے ہیں... مجھے گھن آتی ہے اس کے ہاتھوں سے۔"

"میں اس کی آواز سن سکتا ہوں... لیکن وہ نظر نہیں آتی... کوئی مانتا ہی نہیں کہ وہ یہیں ہے۔"

"مجھے بچاؤ۔ کوئی ہے' جو مجھے یہاں سے باہر نکالے' رحم کرو میرے حال پر رحم کرو۔"

"میں کہاں ہوں مجھے باہر نکالو... بچاؤ کوئی ہے یہاں' بہت اندھیرا ہے مجھے اس قبر سے باہر نکالو بچاؤ۔"

وہ بروکلین برج سے گزرا۔ کورٹ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور بھاگتے بھاگتے مقامی چرچ کے سامنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بری طرح ہانپنے لگا۔ ایک آواز کئی جملے... خوف اور بے بسی سے اٹے ہوئے۔ سارے جملے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ہر آواز دوسری پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ معاویہ کو لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اس نے زور سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور اذیت کے شدید ترین احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے تب تک ہاتھ نہ ہٹائے جب تک ساری آوازیں دم نہ توڑ گئیں۔

پھر اس نے ہاتھ کانوں سے ہٹائے اور بے دم ہو کر گھٹنوں کے بل سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھا وسامہ کی ڈائری کے صفحوں میں گم ہونے لگا۔ وہ اتنی بار اس کی ڈائری پڑھ چکا تھا کہ اپنے بھائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک ایک بات اسے یاد تھی۔ ایک ایک لفظ اسے ازبر تھا۔ خوف کے جو پل وسامہ پہ گزرے' وہ معاویہ نے اس ڈائری کو پڑھتے ہوئے ہر بار اپنی ذات پر حاوی ہوتے محسوس کیے تھے۔ وسامہ کی بے بسی' اس کا خوف معاویہ کو اندر سے کھرچ چکا تھا پھر بھی ماند نہ پڑتا تھا۔

وہ رو نہیں رہا تھا لیکن اس کی بے حس آنکھوں میں نمی تھی اور سینہ سسکیوں کے زور سے بوجھل ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ مر جائے تب بھی وسامہ کی مدد نہیں کر پائے گا۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا غم تھا یہی سب سے شدید پچھتاوا۔



سچ تو یہ ہے کہ مرحوم باسط احمد کی خواہش نہ ہوتی تو اس کا نام کبھی خوش نصیب نہ رکھا جاتا۔

بیس سال کی ہو چکی تھی اور ان بیس سالوں میں بیس سو روایتیں تھیں جو اس کی بدنصیبی سے منسوب کی جاتی تھیں۔ سوئے اتفاق چند ایک کو چھوڑ کر وہ تمام کی تمام ایسی تھیں جنہیں سن کر رونا کم اور ہنسی زیادہ آجاتی تھی۔

چار سال کی عمر میں اس نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر پالتو بکری کے ماتھے کو چوم لیا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو

اسی دن سے بے چاری بکری نے دودھ دینا چھوڑ دیا۔ خوش نصیب نے امرود کی شاخ پر جھولا ڈالا۔ اس موسم کا سارا پھل کیڑے کھا گئے۔ گھر والوں کے حصے میں ایک بھی امرود نہ آیا۔ اس نے دادی سے برفی مانگی 'دادی نے دینے سے انکار کر دیا۔ چند گھنٹے بعد وہی برفی کھاتے ہوئے دادی کا سامنے کا دانت ٹوٹ کر منہ سے باہر آ رہا۔ خالص دیسی گھی اور کھوئے سے بنی ہوئی برفی..... کوئی بتائے ایسی نرم مٹھائی کھاتے ہوئے بھی کسی کا دانت ٹوٹ سکتا ہے کیا؟
ثابت ہوا یہ خوش نصیب کی بدنصیبی کا سایہ تھا جو دادی کا دانت ساتھ لے گیا۔

وہ کچن کے پاس سے گزر جاتی تو اس روز سالن جل جاتا تھا۔

دلچسپ بات یہ کہ اس کے نصیب ہی نہیں زبان بھی کالی تھی اور اتنی کالی تھی کہ جو بری بات منہ سے نکال دیتی وہ تھوڑا کم تھوڑا زیادہ کے تناسب سے پوری ضرور ہوتی تھی۔ کیف ایف ایس سی کے دو سال اس کی منتیں کرتا رہا۔

"پیاری خوش نصیب! بددعا دے دو کہ فرحان کے کیمسٹری میں چار نمبر مجھ سے کم آ جائیں۔" اس کے چار نمبر کم آتے تو کیف کی پوزیشن بن جاتی۔ لیکن خوش نصیب اتنی اچھی نہیں تھی کہ اتنے آرام سے اس کی بات مان لیتی۔ اس نے کیف کی جیب سے دو برگر کھائے۔ تین بار جوس پیا اور ایک بار مرغیوں کا ڈربا جو صاف کرنا اسی کی ذمہ داری تھی کیف سے صاف کروایا۔ بددعا پھر نہیں دی۔

نتیجتاً "فرحان کے چار نمبر کم آنے کے بجائے آٹھ نمبر کیف سے زیادہ آ گئے۔ کیف کی سیکنڈ پوزیشن بنی اور اس دن کے بعد سے کیف نے یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ خوش نصیب کی زبان کالی ہو سکتی ہے۔ لیکن خود خوش نصیب کو اس بات پر سو فیصد یقین تھا۔ بچپن میں جب اپنی اس خصوصیات کا علم ہوا وہ تب سے سب بچوں کو دھمکاتے ہوئے پائی جانے لگی۔

ایک بار شاہجہان سے کہنے لگی۔ "یہ لڈو مجھے دے دیں..... نہیں تو ابھی آپ گٹر میں گر جائیں گے۔" شاہجہان اس وقت چودہ سال کا تو ہو گا اور وہ خود چھ سال کی۔

اس نے لڈو نہیں دیا اور گٹر میں گر گیا۔ آئندہ کسی بھی بچے نے اس کا مطالبہ نہ ماننے سے توبہ کر لی اور یوں خوش نصیب بنا ووٹنگ کے بچوں کی اس ٹولی کی لیڈر مان لی گئی۔

گھر میں بچوں کی بہتات تھی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کا شاخسانہ۔

پارٹیشن کے وقت جو حویلی نما مکان خوش نصیب کے دادا افضل احمد کے حصے میں آیا۔ انہوں نے انڈیا سے آئے ہوئے بیشتر رشتہ داروں کو وہیں ٹھہرا لیا تھا۔ اس وقت سب ہی بٹوارے کا صدمہ سہ رہے تھے دلوں میں گنجائش بھی زیادہ تھی 'سو کئی افراد اسی حویلی میں سماتے چلے گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور مالی اعتبار سے مستحکم ہوتے ہی بہت سوں نے اپنی راہ لی۔ اور جنہیں ایک دوسرے سے زیادہ محبت تھی وہ یہیں رہ گئے۔ یوں دوسری سے تیسری نسل کو جو مکان منتقل ہوا وہاں دادا جی کے ساتھ ساتھ ان کے بھائی کا خاندان بھی آباد تھا۔ رشتے بھی آپس میں ہوئے 'سو یوں گنجلک رشتہ داریوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیواریں کھڑی کر کے پورشن الگ ضرور کیے گئے 'لیکن سب بچوں کی پسندیدہ جگہ گھر کا وہ پچھلا صحن تھا جہاں دادا جی نے اپنے ہاتھوں سے آم کا درخت لگایا تھا۔

صابر احمد اور شفیق احمد 'مرحوم ہاسط احمد کے بڑے بھائی تھے۔ صباحت تائی جان 'صابر احمد کی بیوی اور کیف اور فہمینہ کی امی تھیں ان کی بڑی بیٹی رامین کی شادی غیر خاندان میں ہوئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا جا چکی تھی۔

فضیلہ چچی 'شفیق چچا کی نصف بہتر تھیں۔ اور اپنے مضبوط مالی بیک گراؤنڈ کی بنا پر خاندان کی سب سے مستحکم

بہومانی جاتی تھیں۔ شفیق چچا نے ان سے پسند کی شادی کی تھی اور دادا دادی کی زندگی میں ہی ان کی اہم حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ صیام اور اصفا چھوٹی تھیں شاہجہان اور شاہ میر بڑے تھے۔ فضیلہ چچی کو اپنی خوب صورتی اور مالی حیثیت کا بڑا ناز تھا لیکن اللہ نے پہلی اولاد چھوٹے دماغ والی دے دی تو ان کا دل افسردہ ہو گیا اور انہوں نے اسے اللہ کی آزمائش قرار دیا۔ اس وقت خوش نصیب نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو یقیناً "یہ مصیبت بھی اسی کی بدبختی کے کھاتے میں ڈال دی جاتی۔

عرفات ماموں' صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی اور دادا جان کی بہن کے بیٹے تھے۔ اور خوش نصیب کی امی یعنی روشن آرا عرفات ماموں کی خالہ زاد بہن تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں صرف خالہ زاد مانتے تھے۔ نہ بہن مانا نہ ہی باسط احمد کی حیثیت سے بھابھی تسلیم کرسکے۔ اب اڑتالیس کی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن ساری جوانی خاندان کی تاریخ میں رنگین داستانیں رقم کرنے والے عرفات ماموں نے شادی کا سوچا تک نہیں تھا۔ شادی کیوں نہیں کی' یہ ایک ایسا راز تھا جس کی ٹوہ میں رہنا بھی اب خاندان والوں نے چھوڑ دیا تھا۔

وہ نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک تھے۔ سچے اور کھرے۔ بات سمجھانے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ نصیحت ایسے کرتے کہ بات سیدھی دل میں اتر جاتی۔ کیف کے وہ آئیڈیل تھے اور ایک یہی بات تھی جس پر اس کی اور خوش نصیب کی پسند ایک دوسرے سے میل کھاتی تھی۔ ورنہ تو بقول نانی دونوں کا اینٹ کتے کا بیر تھا۔

خوش نصیب کے خیالات سے سارا گھر واقف تھا۔ کیف کے دل میں جو تھا اس سے اس کے قریبی لوگ ہی واقف تھے۔ باقی سب قیافے لگاتے رہتے۔ اور اپنے اپنے حال میں خوش رہتے۔ کیف نے بارہا اس سے محبت کا اظہار کیا تھا لیکن ہمیشہ مذاق کے پیرائے میں۔ ایسے جیسے محض چڑانے کو کہہ رہا ہو۔ یہ نہ بھی ہوتا تو خوش نصیب اس کی بات پر کبھی اعتبار نہ کرتی کیونکہ وہ اسے بھی خاندان کے باقی افراد کی طرح خائن سمجھتی تھی جنہوں نے اس کے بابا کے ترکے پر قبضہ کرلیا تھا۔ دراصل وہ بدگمان روح تھی۔ ہر کسی سے متنفر ہو جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وسامہ نے دیکھا پورا چاند آئے کت کے عقب میں تھا۔
کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً" آئے کت اور چاند کے حسن کا موازنہ کرکے محظوظ ہوتا اور بلاشبہ آئے کت کی خوب صورتی کو کچھ اضافی نمبر بھی دیتا' کیونکہ ہم نام ہونے کے باوجود پورے چاند کی خوب صورتی آئے کت کے بیش بہا حسن کے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔
یا شاید یہ اس کی محبت تھی جو اس کی نظر میں آئے کت سے بالاتر کسی کو ہونے ہی نہیں دیتی تھی۔
"وسامہ! تم ٹھیک ہو۔" اس نے دیکھا گھبرائی ہوئی آئے کت تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔
کانپتا ہوا وسامہ اپنی ناکارہ ٹانگ اور اس سے لپٹی بیساکھی کو سیدھا کرتا اٹھ بیٹھا۔ آئے کت نے اسے بیٹھنے میں مدد دی۔ اس وقت وسامہ کا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔
"وہ... وہ آگئی ہے آئے کت! میں نے تم سے کہا تھا ناں وہ یہیں کہیں ہے۔" دہشت زدہ سا وہ ہکلا کر بولا۔
آئے کت اپنی ہتھیلی سے اس کی پیشانی کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی بات سن کر بالکل شاکڈ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
"کون؟... کس کی بات کر رہے ہیں؟"
"وہ... وہ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا' وہ اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آئے کت نے اس طرف دیکھا جہاں وسامہ اشارہ کر رہا تھا اور جہاں میرون قالین سے ڈھکی ہوئی گول طرز کی سیڑھیاں تھیں۔ جو دوسری منزل تک جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ وسامہ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہوئی تھی اس کی بات سن کر ساکت ہی رہ گئی۔
"وہ... کون؟ وسامہ!" اپنے دل میں آئے ہوئے خدشے کے رد ہو جانے کی دعا کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"وہ... وہ بھٹکی ہوئی روح... قلعہ فلک بوس کا آسیب۔" خوف سے پیلے پڑتے چہرے کے ساتھ وسامہ نے ہکلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ آئے کت ششدر سی رہ گئی۔ قلعے کی چھت ایک آن میں جیسے اس کے سر پر آ گری تھی۔
"میں نے تم سے کہا تھا ناں آئے کت!... میں کہتا تھا ناں... وہ کہیں گئی ہی نہیں تھی... وہ یہیں تھی اسی جگہ ... ہمارے آس پاس۔" خوف' ہراس' پریشانی... کیا تھا جو وسامہ کی آواز اور لہجے سے نہیں جھلک رہا تھا۔
آئے کت کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وسامہ کا رنگ اڑا چہرہ اور حواس باختہ کیفیت اسے اپنے ہی یقین کو جھٹلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے منتشر ہوتے ہوئے خیالات کو سمیٹا اور سن ہوتے ہوئے دماغ کو تسلی دے کر بہت نرمی سے وسامہ کے ہاتھ کو تھپک کر بولی۔
"میں دیکھتی ہوں..." وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر سیڑھیوں کی طرف جانا چاہتی تھی لیکن وسامہ نے زور سے اس کا بازو دبوچ لیا۔
"نہیں..." وہ اس کا ارادہ بھانپ کر مزید ہراساں ہو گیا تھا۔ "میں تمہیں اوپر جانے نہیں دوں گا۔"
"مجھے اوپر جانے دیں وسامہ!" اس نے نرمی سے کہا۔
"میں نے کہا ناں... میں تمہیں نہیں جانے دوں گا... میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔" آئے کت الجھی۔ اصرار نہیں کر سکی۔

لیکن وہ متذبذب ہوئی تھی کہ اب اسے وسامہ کو خوف کے حصار سے نکالنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔
"میں ۔۔۔ میں معاویہ کو بلاتی ہوں۔" اسے اچانک خیال آیا لیکن اس بار بھی وسامہ نے اسے اس کے ارادے پر عمل کرنے نہیں دیا۔
"نہیں' معاویہ بہت جذباتی ہے' وہ ضرور اوپر جانے کی کوشش کرے گا۔" وسامہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بول رہا تھا اور وہ سخت پریشان بھی ہو گیا تھا۔
"میرا کیا دماغ خراب ہے' جو میں بائیس سال کی عمر میں اوپر جانے کی کوشش کروں گا؟" وسامہ اور آئے کت نے بے ساختہ اس آواز پر گردن موڑ کر ہال کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔
گولائی کی شکل میں بنی ہوئی دیدہ زیب پارٹیشن جو خواب گاہوں کے سامنے بنی ہوئی راہداری کو اس ہال نما سٹنگ روم سے الگ کرتی تھی۔ پارٹیشن میں موتیوں کے ٹکرائے لٹک رہے تھے جنہیں کچھ دیر پہلے آئے کت نے سمیٹ کر ایک طرف کر دیا تھا۔
معاویہ کچی نیند سے بیدار ہوا وہیں کھڑا تھا۔ اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اب بیزاری سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
"میں اتنی گہری نیند سو رہا تھا۔ آپ دونوں نے اتنا شور مچایا کہ میری نیند خراب ہو گئی' کمال ہے یار! گھر آئے مہمان کے ساتھ تم لوگ یہ سلوک کرتے ہو۔" وہ بہت ناراضی سے کہہ رہا تھا۔
آئے کت اور وسامہ کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا وہ دونوں اپنی ہی کشمکش میں تھے۔



کیف شیرو کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ شیرو اندر داخل ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے جیسے بچپن کے بچھڑے ہوئے دوست مل گئے ہوں۔
"شیرو! میرے دوست۔" کیف نے بازو پھیلائے۔
"ارے کیف بھائی!" اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "آپ کب آئے؟ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔" کیف گھر میں سب کا ناپسندیدہ تھا سوائے خوش نصیب کے۔
"یار شیرو! میں کون سا تمہاری محبوبہ ہوں کہ میرے آنے کی خبر خود بخود تم تک پہنچ جائے۔" اس نے شیرو کا کندھا تھپتھپایا۔
"کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی جان!" شیرو شرما گیا۔ کیف نے بمشکل اپنی ہنسی دبائی اور اس کے سر پر ایک چپت لگا کر بولا۔
"اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔"
"بھائی جان! چائے نہیں بن سکتی۔" شیرو نے منہ لٹکا کر کہا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے شیرو!" عرفات ماموں نے ناراضی سے کہا۔ "بھائی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"
"میں بتا رہا ہوں ناں سرجی! چائے نہیں بن سکتی۔" لاچاری سے کہا۔
وہ چودہ پندرہ سال کا مؤدب بچہ تھا۔ چھوٹی عمر سے عرفات ماموں نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا تھا' چونکہ وہ تنہا رہتے تھے اور کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے سو شیرو ان کے لیے خانساماں' دھوبی بن گیا۔ دو چار مہینوں کے بعد گاؤں جاتا ماں باپ سے مل کر ایک ہی دن میں واپس آجاتا۔ پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا اور خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیے عرفات ماموں کو "سرجی" بلاتا تھا۔ در حقیقت وہ عرفات ماموں کا ملازم تھا لیکن

گھر کے دیگر افراد بھی اس کی دوڑیں لگوائے رکھتے تھے۔
"کیوں؟" عرفات ماموں نے سابقہ ٹون میں کہا۔
"کچن میں چھپکلی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے چھپکلی سے۔" اس نے شرمندگی سے کہا تھا۔
"نام تمہارا شیرو ہے اور حوصلہ چوہے کے جتنا بھی نہیں ہے۔" اس بار کیف نے چپت سے کچھ زیادہ زوردار ہاتھ اس کے سر پر مارا۔ "چلو چھپکلی کو بھگاتے ہیں۔"
"نہیں بھائی جان! چھپکلی کو بھگانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ خوش نصیب باجی پہلے ہی چھپکلی کو مار چکی ہیں۔"
"ایں۔" دونوں کو حیرانی کا جھٹکا لگا۔ "خوش نصیب نے کیسے چھپکلی ماردی؟"
"انہوں نے آلو گھما کر مارا چھپکلی پھڑک کر نیچے گر پڑی۔" وہ بڑا خوش تھا خوش نصیب کے کارنامے پر۔
"واہ۔۔۔ سبحان اللہ۔" کیف جھوم اٹھا اور عرفات کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ایسے ہی تو میں اس کی محبت میں پاگل نہیں ہو رہا۔ پورے خاندان میں ہے ایسی کوئی بہادر لڑکی! جو آلو سے چھپکلی مار سکے؟"
"بکومت۔" اسی وقت خوش نصیب اندر داخل ہوئی اور دانت کچکچا کر بولی۔ "کسی روز میں ایسے ہی آلو گھما کر ماروں گی اور تمہارا قتل کر دوں گی۔" اس کے عزائم خطرناک تھے۔
"اور اس کے بعد پوری زندگی بیوہ بن کر سفید جوڑا پہننا پڑے گا۔ میری بات یاد رکھنا۔" کیف نے ترنت کہا۔ شیرو کھی کھی کرنے لگا۔
"ٹھیک ہے۔" خوش نصیب نے بھی دوبدو کہا۔ "مجھے بیوہ بن کر رہنا منظور ہے لیکن تمہارے ساتھ رہنا نہیں۔"
اتنی بڑی بات وہ بڑے آرام سے کہہ گئی تھی اور اسے احساس تک نہیں تھا کہ اس کے اس ایک جملے نے کیف کے دل کو کتنی چوٹ پہنچائی ہے لیکن چونکہ وہ مسکرانے کا عادی تھا سو مسکراتا ہی رہا۔ اور شرارت سے اسے دیکھتا رہا۔
"خوش نصیب! بات کرتے ہوئے تھوڑا تو سوچا کرو۔" عرفات ماموں نے ناراضی سے کہا۔
"اللہ نہ کرے کہ کیف بھائی کو کچھ ہو یا آپ کو بیوہ بن کر رہنا پڑے۔" شیرو دہل ہی گیا تھا۔ کیف نے دیکھا شیرو کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔
"یار! تیرا دل واقعی چھوٹا ہے۔ یہ کوئی رونے کی بات ہے۔" اس نے جلدی سے شیرو کے کندھے پر بازو پھیلا لیا اور اسے لے کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
"لوگ لکھ کر رکھ لیں۔ اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں میں۔" خوش نصیب کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ اس کے کان کے پاس جھکا اور متبسم لہجے میں سرگوشی کی۔
"ویسے بھی۔ میرا نام کیف ہے اور میرا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یاد رکھنا۔" کھنکتے لہجے میں اس نے کہا اور قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عرفات ماموں اٹھ کر اپنی کتابوں کی الماری تک چلے گئے تھے۔ ابھی جو ہوا انہوں نے دیکھا نہیں۔ لیکن خوش نصیب تھم سی گئی۔ نا جانے کیوں۔ اس نے دانت کچکچائے اور ایسے سر جھٹک دیا جیسے کہہ رہی ہو۔ "دفع دور۔"



معاویہ نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا اور ہال نما لاؤنج کی ساری بتیاں جلا دیں۔ صرف فانوس کو اس نے چھوڑ دیا اور

گردن موڑ کر دیکھا۔ نڈھال سا وسامہ اپنی بیساکھی کی قید سے آزاد ہو کر سر جھکائے اب وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔
آئے کت اس سے چند قدم پیچھے کھڑی دانتوں سے انگوٹھے کا ناخن کتر رہی تھی۔ سر اس نے بھی جھکا رکھا تھا اور لگتا تھا سخت اضطراب کا شکار ہے۔
شاندار کرسٹل فانوس چھت پر بے نور لٹک رہا تھا۔ چھت اور دیواروں پر لگی ٹیوب لائیٹس اور بلب سے نکلنے والی روشنی کسی خاص اینگل سے فانوس کے کلس سے ٹکراتیں تو دلفریب روشنیاں نکل کر ان تینوں کے سروں پر منڈلانے لگتیں۔
معاویہ نے بے آواز ایک گہری سانس لی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ان دونوں کے پاس آگیا۔ وہ ان دونوں کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اپنے چہرے پر معاویہ کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے آئے کت نے بے دھیانی میں سر اٹھایا اور اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
معاویہ صوفے پر بیٹھ گیا۔
"تو۔۔۔ تم دونوں یہ کہنا چاہتے ہو کہ فلک بوس haunted (آسیب زدہ) ہے؟ اور یہاں آلو شمتی کی روح کئی سالوں سے بھٹکتی پھر رہی ہے؟" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن ان دونوں میں سے اگر کوئی بھی اس کی طرف دیکھ لیتا تو جان جاتا کہ معاویہ شیرازی اس وقت بڑی مشکل سے اپنے قہقہوں کا گلا گھونٹ رہا ہے۔
"نہیں۔۔۔ میں نہیں۔" آئے کت نے جلدی سے اور بے ساختہ کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وسامہ کی وجہ سے جھجک گئی اور بولی۔ "آ۔۔۔ وسامہ کا خیال ہے کہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" اس بار معاویہ اپنا قہقہہ روک نہیں پایا۔ وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ آئے کت اسے ہنستا دیکھ کر مسکرا بھی نہ سکی۔ البتہ وسامہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔
جب معاویہ دیر تک ہنس چکا تو وسامہ نے سنجیدگی اور قدرے بیچارگی سے کہا۔
"یہ سب مذاق نہیں ہے معاویہ! کہ اس پر ہنسا جائے۔۔۔ وہ ابھی بھی یہیں کہیں ہے۔۔۔ اسی قلعے میں ہم تینوں کے آس پاس۔" اس کی آواز میں اب بھی خوف محسوس کیا جا سکتا تھا۔
"اوہ ریئلی!۔۔۔" اس نے غیر سنجیدگی سے آنکھیں پھیلائیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور زور سے بولا۔
"اگر ایسی بات ہے تو اسے ابھی بھی ہمارے پاس ہونا چاہیے۔۔۔ ہیلو میڈم آلو شمتی! کیا آپ میری آواز سن سکتی ہیں۔۔۔ پلیز سامنے آئیں اور آ کر مجھ سے بات کریں۔۔۔ میرے بھائی نے آپ کی موجودگی کو محسوس کیا ہے' لیکن میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں پلیز سامنے آئیں کوئی ہے؟ کوئی سن رہا ہے مجھے۔" وہ شرارت سے زور زور سے بول رہا تھا اور پورے لاؤنج میں گھوم رہا تھا۔ اس کی شرارتی آواز قلعے کی دیواروں سے ٹکرائی اور گونج بن کر ان تینوں کی سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔
"معاویہ! پلیز۔۔۔" آئے کت نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں وسامہ کی بات کو سنجیدگی سے سننا چاہیے۔"
وسامہ جانتا تھا آئے کت کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا لیکن اپنے شوہر کی بات یا اس کا مذاق اڑایا جانا بھی آئے کت کی برداشت سے باہر تھا۔
لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آئے کت کا اس طرح سے معاویہ کو ٹوکنا خود معاویہ کو کتنا برا لگا ہے۔
"تمہیں مجھے انسٹرکشن دینے کی ضرورت نہیں ہے' میں اپنے بھائی کی باتیں سنجیدگی سے ہی سن رہا ہوں۔" اس نے دوٹوک آئے کت سے کہا۔ آئے کت کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔ معاویہ نے وسامہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لوگ ابھی بہن بنانے کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہو کیونکہ آپ جانتے ہیں۔ تجھے پتہ ہے کہ اب تک میرے آٹھ بہن بھائیوں میں کنواری ہیں۔ اگر اتنی جلدی کی رسم کا ماحول ہے تو آج سے پہلے کسی کو فکر کیوں نہیں لگی۔"

"آپ کہاں رہ رہی ہیں؟" رمامہ نے آہستگی سے کہا۔ "بچپن سے لے کر اب تک ہم جب بھی یہاں آئے ہیں — یہی اس مدرسے کے قصے سنتے آ رہے ہیں۔"

"ایک منٹ۔" اس نے کہا۔ "یہ بات ٹھیک ہے کہ ... کی بات سے تو کہا۔" "آج تک مجھے کوئی کیوں نہیں کہ آپ نے مجھے بتایا نہیں، اب میرے کس کو یہ بتایا جائے۔"

"کسی نے بہت بالی عمر کر کے ہو کر نہیں کیا تھا۔" رمامہ نے ترچھی بات کی۔ "مجھے کیا تھا تم سے ہو گا۔"

"اب یہ محض اتفاق ہی تھا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "ویسے بھی لڑکی کی مرضی کی اہمیت ہوتی ہے، باہر کیا ہوا، کیا ہوا، یہ بات نہیں ہے۔" اس نے محفل کی طرف دیکھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔

"انہوں نے بات کی اصل میں۔" وہ مسکرائے بغیر بولا، ماحول خاموش ہو گیا تھا۔

"تم نے اس کی سادگی کو محسوس کر کے اس سے کہا۔" "تمہیں یہ بات پتہ ہے، اس کی آواز میں ایک سادگی اور اداسی تھی، مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگی، تم میری بات کا یقین کرو۔"

وہ خوف اور خاموشی کی کیفیت میں اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ رکا، اٹھ کر اس کے پاس سے گزرا، دل میں کچھ سوچ کر اس نے آہستہ سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بار بار اس کے ساتھ ساتھ کی بھی کہانی سنا گئی۔

محفل ختم ہو گئی۔ آج کے دن کے لیے یہی بات کافی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی کہ وہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے، میں نے اس دن کہا تھا کہ یہ سب ایک دن ختم ہو جائے گا، یہ محبت کی صورت ہے۔"

"کیا واقعی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا؟" رمامہ کا ہاتھ سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کی طرف بڑھا۔

وہ سب سے اس بات کا یقین کرتے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر اپنے دل سے لگایا۔ چند لمحے اسی طرح کھڑے رہے، سانس لیتا رہا، پھر آہستہ سے اس کی ہتھیلی چھوڑ دی اور کمرے کی طرف چلی گئی۔

سلوی آج بھی اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

جانے سے پہلے انہوں نے ایک نظر سلوی پر ڈالی، وہ دیکھ رہی تھی کہ ان دونوں کی بات کا انتظار ہی نہیں تھا۔ وہ مسکرا کر چلی گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episode Visit
Paksociety.com

آمل رضا



"سوچیں ہمیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہیں ۔۔۔ ورنہ میں بھی تمہاری طرح جوان ہوتی۔"

جمیلہ نے امریکن مارتھا کی صحت اور جوان عمری کو حسرت سے دیکھا اور طنز کیا۔

"کیسی سوچیں؟" مارتھا حسرت بھانپ سکی نہ طنز۔

"جن کی تین بیٹیاں ہوں ۔۔۔ انہیں سوچیں نہیں ہوں گی کیا؟ پر تم کیا جانو۔" جمیلہ نے استہزائیہ جتایا۔

"میری دو بیٹیاں ہیں ۔۔۔ اور میری بہن کی تین ۔۔۔ کیا بیٹیاں ہونے میں کوئی پرابلم ہے؟"

"بیٹیوں کے ہونے میں نہیں ۔۔۔ ان کی شادیوں کے ہونے میں ۔۔۔ بوجھ ہوتی نہیں لیکن معاشرہ بنا دیتا ہے۔"

"معاشرہ؟۔۔۔ کون معاشرہ۔۔۔؟"

"ارے بھئی ۔۔۔ یہ ہی لوگ ۔۔۔ اور کون ۔۔۔ بوجھ بنا دیتے ہیں انہیں ہمارے لیے۔"

"تم اس معاشرے میں شامل نہیں ہو؟"

"مجھ ایک سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق کیوں نہیں پڑتا ۔۔۔ تمہاری سوچ سے تمہاری نسل کی سوچ بدلے گی۔" جمیلہ ہنسی۔

"میں تو یہ سوچ لوں گی کہ بیٹیاں بوجھ نہیں ۔۔۔ سارا معاشرہ کیسے سوچے گا۔"

"خود کو بدلنے سے جب ہم معاشرے کو بدلنے کا سوچنے لگتے ہیں تو دراصل کچھ بھی نہیں بدل سکتے ۔۔۔ تبدیلی ایک دم سے نہیں آتی۔"

"بھئی تم لوگوں کو ایسی باتیں بنانی خوب آتی ہیں ۔۔۔ کبھی ہماری جگہ آکر دیکھو کس تلوار پر چل رہے ہیں ہم ۔۔۔ کل میری بیٹی کو جو لوگ دیکھنے آئے تھے 'وہ آنے والے اکتیسویں تھے ۔۔۔ باقی دو بیٹیوں کے لیے بھی ہم دیش اتنے ہی آچکے ہیں ۔۔۔ ہماری ہی ہمت ہے جو یہ سب جھیلتے ہیں ۔۔۔ تم لوگ کیا جانو رشتے کیسے طے ہوتے ہیں۔"

"کیا تم نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی؟"

"ہاں ۔۔۔ ایک بڑے بیٹے کی شادی کر چکی ہوں میں۔"

"تم کتنی لڑکیاں دیکھنے گئی تھیں۔ اکتیس یا اکتالیس ۔۔۔ یا پہلی ہی لڑکی پسند کر آئی تھیں؟"

"تو کیا کوئی بھی ایسی ویسی اٹھا لاتی اپنے بیٹے کے لیے۔"

"لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں نہ ویسی ۔۔۔ اگر وہ پڑھی لکھی سمجھ دار ہیں تو وہ ایک پرفیکٹ رشتہ ہے۔۔۔"

"ہاں جی پڑھی لکھی سمجھ دار ہی مانگتے ہیں ہم ۔۔۔ کوئی شہزادیاں نہیں چاہیے ہمیں۔"

"ساری بیٹیاں شہزادیاں ہی ہوتی ہیں ۔۔۔ ویسے تمہارے گھر جو اکتیس خاندان آچکے ہیں ۔۔۔ انہوں نے کیا کہہ کر انکار کیا؟"

"بس کچھ نہ پوچھو۔۔۔" جمیلہ اداسی اور دبے ہوئے غصے سے بولی۔

"کسی کو گھر پسند نہیں ۔۔۔ کسی کو لڑکی کا قد۔ کوئی گوری چٹی مانگتا ہے۔ کوئی کم عمر ۔۔۔ کسی کے لڑکے سے میری بیٹی دو سال بڑی ہے ۔۔۔ کسی کو نوکری والی چاہیے ۔۔۔ کسی کو چھوٹی فیملی چاہیے۔"

"ابھی تم نے کہا ۔۔۔ پڑھی لکھی 'سمجھ دار چاہیے ہوتی ہیں۔" مارتھا ہنسی۔

"بس یہی ہے، رشتے ناتے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔" [illegible]

"ایسے ہوتے ہیں... تم نے ایسے کیسے شروع کر دیا، بھرپور وضاحت بھی؟"

"میں کیا بتاؤں، بڑی کامیابی اور خوب صورت ہیں۔"

"اگر کسی کی بیٹی خوب صورت ہے تو [illegible]"

[illegible]

"ایسے ہی... لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

"ولیا شاہ بھی شامل ہے۔"

[illegible]

پوچھا۔
"تمہاری بہو کیسی ہے؟"
چاند کا ٹکڑا۔" جمیلہ کا چہرہ کھلکھلایا۔
"بائیس سال کی ہے۔ اس کا ایک بھائی ڈاکٹر ہے۔ ایک باہر امریکہ میں ہوتا ہے۔"
"تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے؟"
"بڑا بیٹا تو کمپنی میں ملازم ہے۔ اور چھوٹا ابھی پڑھ رہا ہے۔"
"چھوٹی بیٹی کی عمر کیا ہے؟"
"چھوٹی بیٹی۔ وہ اگلے سال اکیس کی ہو جائے گی۔"

"تمہیں اپنے بیٹے کے لیے اکیس بائیس سال کی لڑکی چاہیے تھی۔ اور وہ تم نے ڈھونڈ بھی لی۔ تو اب تمہاری دو بیٹیوں کا کیا ہوگا۔ وہ تو شادی کی عمر سے ہی نکل گئی ہیں۔"
"نہیں۔ نہیں۔" جمیلہ نے اپنا دل تھام لیا "ایسے کیسے شادی کی عمر سے نکل گئیں۔ ابھی کل کی ہی تو بات ہے۔ کھیلتی پھرتی تھیں آنگن میں۔ پتا ہی نہیں چلا کب عمر بیس میں جمع ہونے لگی۔"
"جب تمہیں پتا نہ چلا کہ کب ان کی عمر بیس میں جمع ہونے لگی تو تم اپنے بیٹے کے لیے وہ لڑکی کیوں نہ لائیں جس کی ماں کو پتا چل چکا تھا کہ اس کی بیٹی کی عمر بیس میں جمع ہونے لگی ہے۔ ویسے تمہیں کوئی تمہارے بیٹے کی ہم عمر ملی تھی؟"
"کوئی ایک۔ بے شمار ملی تھیں۔ ہر دوسرا تیسرا رشتہ بڑی عمر والیوں کا ہی تو ہوتا تھا۔ ایک جو میرے بیٹے سے دو سال بڑی تھی اپنا اسکول چلاتی تھی۔ بہت پیسے کماتی تھی۔ پر میں نے انکار کر دیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی بوڑھی بہو بیاہ کر لانے کی۔"
"کتابوں میں پڑھا ہے میں نے کہ تمہارے آخری نبی کی پہلی بیوی ان سے عمر میں کافی بڑی تھیں۔"
"توبہ توبہ۔ وہ تو نبی تھے۔ کہاں ان کی شان کہاں ہماری۔"
"کیا وہ تمہیں دین و دنیا سکھانے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے؟"
"ہاں۔ بے شک۔ لیکن۔"
"انہوں نے ایک اچھی مثال قائم کی۔ خود سے عمر میں بڑی اور ایک بیوہ عورت سے شادی کی۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگ ہیں جو خود سے عمر میں بڑی عمر کی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔"
"وہ لوگ یقیناً" بہت کم ہوں گے۔ تم کیوں نہیں ان لوگوں میں شامل۔"
"تم تو پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔" جمیلہ نے ناک بھوں چڑھائی۔
"مجھے وجہ بتا دو۔ تم نے اس لڑکی کو بوڑھا کیوں کہا۔"
"بھئی عورت۔ مرد سے چھوٹی ہی اچھی لگتی ہے۔"
"اگر ایسی ہی بات تھی تو تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔"
"بس۔ بس کہا نا وہ شان والے تھے۔"
"چلو یہ بتاؤ۔ تم اتنی چھوٹی لڑکی کو کیوں بہو بنا کر لائی؟"
"بہوویں کم عمر۔ بھولی بھالی ہی اچھی لگتی ہیں۔ پہننا اوڑھنا بھی اچھا لگتا ہے۔ شوہر کے رعب میں بھی رہتی ہیں۔ بڑی عمر کی عورتیں تو مائیں بن جاتی ہیں شوہروں کی۔ سسرال آکر سارا راج پاٹ سنبھال لیتی ہیں۔"
"میرے بھائی نے خود سے چھ سال بڑی لڑکی سے شادی کی ہے۔ شادی کو سات سال ہو گئے۔ ابھی تک وہ شوہر کی ماں نہیں بنی۔ نہ ہم نے اسے جتایا کہ تم اس کی ماں ہو۔ دونوں میاں بیوی کافی خوش ہیں۔"
"تم لوگوں کو بس باتیں بنانی آتی ہیں۔ تمہاری اپنی اولاد تو بہت آزاد خیال ہوتی ہے نا۔ تمہیں کیا پتا کہ رشتوں کے کتنے جھمیلے ہوتے ہیں' رشتے والے کیسی کیسی باتیں کر جاتے ہیں۔ تمہاری زندگیوں میں تو

سکون ہی سکون ہے۔"
"ہماری زندگیوں میں سکون ہے نہیں۔۔۔ ہم نے پیدا کیا ہے۔۔۔ جہاں ہماری اولاد شادی کرنا چاہتی ہے ہم انہیں ذات پات 'گھر' اسٹیٹس دیکھ کر ریجیکٹ نہیں کرتے۔۔۔ ان کے گھروں میں جا کر ہم گھر اور برتن نہیں دیکھتے۔۔۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کے ڈرائنگ روم میں کیسے صوفے اور کیسے پردے لگے ہیں' لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے۔۔۔ اور بھائی ڈاکٹر' انجینئر ہے یا نہیں' اس کا قد کتنا ہے' وہ عمر میں کتنی چھوٹی ہے۔۔۔ رنگ صاف ہے یا نہیں۔۔۔ کھانا پکانا آتا بھی ہے کہ نہیں۔۔۔ اس کی پہلی منگنی کیوں ٹوٹی۔۔۔ اس کا گھر محلے میں یا گلی میں کیوں ہے۔۔۔ کسی کالونی یا بڑے ایریا میں کیوں نہیں ہے' اس کے گھر کے پورچ میں کتنی گاڑیاں کھڑی ہیں۔۔۔ کھانے کی ٹیبل پر وہ کیا کیا رکھتے ہیں۔۔۔ ہمیں ایسی باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"
"ہونہہ۔۔۔ تم کیا جانو رشتے طے کرنے کے طریقے سلیقے۔۔۔ ویسے تم لوگوں نے جان چھڑائی اپنی جہیز سے۔"

"تم بھی چھڑوالو۔۔۔ جہیز کا حکم ہے تمہارے مذہب میں؟ جب میری اور میرے شوہر کی شادی ہوئی تھی تب میرے شوہر نے ایک کمرے کے فلیٹ کو اپنے پیسوں سے سجایا تھا۔ جب میری بیٹی کی شادی ہوئی تو میری بیٹی اور اس کے شوہر نے مل کر یہ کیا۔ ہم سے ایک پیسہ نہیں لیا۔"
"ہمیں تو خوشی ہوتی ہے اپنی بیٹیوں کو دے کر' تم لوگوں کی طرح دبا کر نہیں رکھتے پیسوں کو۔"
"اگر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے تو پھر بیٹیوں کو بوجھ کیوں کہا تم نے؟۔۔۔ اور یہ تم وقت سے پہلے بوڑھی کیوں ہو رہی ہو؟"
"کیا کریں معاشرے کے منہ کو دیکھنا پڑتا ہے۔"
"کیسا معاشرہ؟ کیا تم نے اپنی بہو سے نہیں لیا جہیز؟"
"میرا بیٹا کوئی ارب پتی نہیں ہے۔۔۔ وہ ساری زندگی گھر کی چیزیں ہی جمع کرتا رہتا؟"
"جب تمہارا بیٹا چیزیں اکٹھی نہیں کر سکتا تو تمہارا داماد کیوں کرے؟"
"تم میری جگہ ہوتیں تو میں تم سے پوچھتی۔۔۔"
"میں تمہاری جگہ ہوتی تو اپنی جگہ بدل لیتی۔"
"ہونہہ۔۔۔ یہ شادی بیاہ بچوں کے کھیل نہیں ہیں۔۔۔ جو تم یوں منہ اٹھا کر کہہ رہی ہو کہ جگہ بدل لیتی۔۔۔ سو چیزیں دیکھنی پڑتی ہیں۔۔۔ اور پھر اچھے رشتے ملتے ہی کہاں ہیں؟"
"کیا اچھے لوگوں کی اتنی کمی ہے تمہارے یہاں؟۔۔۔ ذرا مشاہدہ کرو اپنے معاشرے کا۔۔۔ اچھے لوگ تو بہت ہیں۔۔۔ اچھی لڑکیاں بھی۔۔۔ اچھے لڑکے بھی۔۔۔ بس اچھے اسٹیٹس کے نہیں ہیں۔۔۔ اچھی لڑکیاں جو پڑھی لکھی بھی ہیں اور ہنر مند بھی۔۔۔ ان کے دو کمروں کے یا ٹوٹے پھوٹے گھروں میں رشتے نہیں لے جانے جاسکتے' جو لوگ زیادہ جہیز نہیں دے سکتے وہاں بھی۔۔۔ جو دھوم دھام سے شادی نہیں کر سکتے وہاں بھی۔۔۔ جب تم نے روایت نہیں توڑی تو کوئی تمہارے لیے روایت کیوں توڑے؟ جب بھر بھر جہیز تم نے اپنے گھر منتقل کیا۔ جب بیٹے کے لیے تم نے منہ سے چیزیں مانگیں تو کوئی تمہاری خوب صورت سلیقہ شعار لڑکیوں کو کیوں دیکھے گا۔"
"کیا میرا حق نہیں ہے اپنے پڑھے لکھے' خوبرو بیٹے کے لیے اچھے گھر سے لڑکی لانے کا؟"
"تم لوگ اچھا گھر کسے کہتے ہو؟۔۔۔ جہاں پورچ میں گاڑی کھڑی ہو؟ باپ سرکاری ملازم ہو یا بزنس مین؟ پانچ وقت کا نمازی۔۔۔ سبزی بیچنے والا باپ اور محدود آمدنی میں صبر و شکر سے گزارہ کرنے والی بیٹیاں اچھے گھروں میں شامل نہیں ہیں؟ باپردہ' باکردار' تہذیب یافتہ لڑکیاں تمہاری آنکھوں میں جچتی کیوں نہیں ہیں؟"
"چھوٹے گھروں کی لڑکیاں چھوٹی ذہنیت کی ہوتی ہیں۔"
"ذہنیت تو ان کی بھی چھوٹی ہے جو ان کو چھوٹے گھروں کی کہتے ہیں۔۔۔ سنا ہے محلوں میں تو فرعون رہتے ہیں۔۔۔ تم نے اپنی بے سکونی کی وجوہات خود ہی بتا

دیں۔۔۔ ٹھیک ہے رہو بے سکون۔۔۔" مارتھا کہہ کر پارک کی خوب صورت فضا کو محسوس کرنے لگی۔

"تمہارے بچے تو خود ہی باہر کے باہر شادی رچا کر آجاتے ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔۔۔ میرے بیٹے نے شادی سے پہلے مجھے میری بہو سے ملوایا تھا۔۔۔ اس کے بارے میں سب بتایا تھا۔۔۔ میں نے اور میری بہو نے بیٹھ کر ایک دوسرے کے مشاغل کے بارے میں بات کی تھی۔۔۔ پھر جب دونوں نے شادی کا دن طے کیا ہم نے اس کے لیے بڑھ چڑھ کر تیاریاں کیں۔۔۔ ان دونوں کی مرضی اور ان کی زندگی کے اہم موقعے پر ہم نے اپنی پسند سے زیادہ ان کی پسند کو ترجیح دی۔"

"ہاں۔۔۔ شتر بے مہار ہے تمہاری اولاد تو۔۔۔ کرتی ہے اپنی مرضیاں ہی۔"

"شتر بے مہار نہیں۔۔۔ اپنے پیروں پر کھڑی اولاد۔۔۔ میری بہو نے کہا وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔۔۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔۔۔ بیٹے نے کہا وہ الگ رہنا چاہتا ہے ہم نے کہا ٹھیک ہے۔۔۔ ہم نے اس بات کو ایشو نہیں بنایا کہ بہو نے بیٹے کو ماں سے الگ کر دیا۔"

"تمہاری بلا سے۔۔۔ تمہاری اولاد کہیں بھی رہے۔۔۔ ہم تو نہیں رہ سکتے۔۔۔ پھر وہ ہمارا سہارا ہوتے ہیں۔۔۔ کما کر دیتے ہیں ہمیں۔"

"میرے بیٹے کا گھر میرے گھر کے ساتھ ہے۔۔۔ میرے اکاؤنٹ میں وہ ہر ماہ کچھ رقم ٹرانسفر کرواتا ہے۔ جبکہ میں اپنا بزنس۔۔۔ کر رہی ہوں۔۔۔ اگر وہ پیسے نہ بھی دے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا کہ وہ نہیں دیتا اور نہ میں یہ کہوں گی کہ اس کی بیوی نے سب چھین لیا۔ ہر چیز پر قبضہ کر لیا۔۔۔ میری بہو مجھے ہر ہفتے میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جاتی ہے۔ میرے ساتھ مل کر شاپنگ کرتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار مل کر ہم لنچ کرتے ہیں۔۔۔ فارغ وقت میں ہم مل کر گپ شپ کرتے ہیں۔۔۔ جب جب اس کی ماں آتی ہے وہ میرے گھر ٹھہرتی ہے۔۔۔ ہماری اچھی دوست ہے۔۔۔ میں اپنی بہو یا اس کی ماں سے کوئی بیر نہیں رکھتی۔۔۔ نہ ہی وہ مجھ سے رکھتی ہے۔"

"بس۔۔۔ بس اتنے بھی اچھے نہیں ہوتے تم۔۔۔ ہمارے یہاں کی بہوؤں کو تم نہیں جانتی کیسی چنڈالیں ہوتی ہیں۔"

"اگر وہ چنڈالیں ہوتی ہیں تو ساسیں بھی کم نہیں ہوتی ہوں گی۔۔۔ کھانا کیا پکایا۔۔۔ کام کتنا کیا' نندوں سے کیسے بات کرتی ہے' بیٹھتی کیسے ہے۔ بولتی کیسے ہے۔ صبح کتنے بجے اٹھی۔ رات کتنے بجے سوئی۔۔۔ میکے کیوں جاتی ہے۔۔۔ اپنے میکے والوں کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہے۔ اتنے دن میکے میں رہتی ہے۔۔۔ روز گھومنے چلی جاتی ہے۔ اتنی شاپنگ کرتی ہے۔۔۔ یہ سب باتیں ساسیں نہ کریں تو وہ بھی چنڈالیں نہ بنے۔۔۔ میرا بیٹا جب باپ بننے والا تھا تو میں اس کے گھر جا کر کھانا پکا آتی تھی۔۔۔ میری دائیں ٹانگ کا آپریشن ہوا تو میری بہو کھانا' لانڈری' ڈسٹنگ سب کر جاتی تھی۔۔۔ احساس کے ساتھ احساس ہے۔۔۔ اگر میری بہو یہ سب نہ بھی کرتی تو میں اپنے بیٹے کے کان نہ بھرتی۔۔۔ رشتوں کو باندھ کر رکھیے لیکن پھندے سے لٹکا کر نہ رکھیں۔۔۔ ساس بنو۔۔۔ بیٹے کی ماں بنو۔۔۔ لیکن اعتدال رکھو۔"

"بہو یہ سب نہ کرتی تو کیا تم پھر ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ بھوکی مرتیں؟"

"میرے شوہر کرتے۔۔۔ ورنہ میں فلوریڈا سے اپنی بیٹی اور داماد کو بلا لیتی۔۔۔ اگر بہو نہیں کرنا چاہتی تو کیا ہوا۔۔۔ غصہ کیسا؟"

"بڑے بوڑھوں کی خدمت کرنا ہمارے چھوٹوں پر فرض ہے۔۔۔ ہم نہیں چھوڑتے اپنے بوڑھوں کو لاوارث۔۔۔ احسان سمجھ کر نہیں فرض سمجھ کر کرتے اور کرواتے ہیں۔"

"اگر چھوٹوں پر خدمت فرض ہے تو کچھ بڑوں پر بھی فرض ہو گا کہ جہاں تک وہ اپنی دیکھ بھال آسانی سے کر سکتے ہیں کریں۔۔۔ ایک اکیلی لڑکی اتنے بڑے کنبے کو کیوں سنبھالے۔۔۔ اسے مددگار دیے جائیں۔۔۔ آرام دیا جائے۔۔۔ اسے اس کے کاموں پر انعام بھی دیا جائے۔۔۔ ٹھیک ہے وہ کام کرے گھر سنبھالے' پھر اسے

وہ مقام بھی دیا جائے... کیا ہوتا ہے تمہارے یہاں ایسی سب بہوؤں کے ساتھ... گھر تو سارا بہو نے سنبھالا ہوا ہے... کام کاج وہ ہی کرتی ہے... لیکن روپے پیسے کا سارا احساب کتاب ساس سسر یا بیٹے کے پاس ہوتا ہے... اگر اس سے واقعی گھر سنبھلوانا مقصد ہے تو پھر اسے گھر کا سربراہ کیوں نہیں بنا دیتے۔"

یہ بات جمیلہ کو کافی محسوس ہوئی تھی۔ وہ آگے سے کچھ نہ بول سکی' ہارتھا ہی بولی۔

"اگر میں نے اپنی بہو سے اپنی خدمت کروانے کو فرض سمجھ لیا تو اس کی اپنی لائف تو بہت ڈسٹرب ہو جائے گی... وہ ایک صحافی ہے۔ صبح جلدی اٹھ کر گھر کے کام کرتی ہے... پھر میرے پوتے کو نہلا دھلا کر مجھے دے جاتی ہے۔ رات گئے گھر آتی ہے... میرا بیٹا رات کا کھانا بناتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو ہی گھر آجاتا ہے برتن بھی دھوتا ہے۔ صفائی بھی کرتا ہے... شام کو مجھ سے لے جاتا ہے... اسے فیڈر دیتا ہے... بہلاتا ہے سلاتا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے نہیں کہتی کہ وہ عورتوں والے کام کیوں کر رہا ہے۔ یا وہ اپنی بیوی کا غلام ہو گیا ہے... یہ سب کام میرے داماد بھی کرتے ہیں... یوں ہماری زندگیاں آسان ہو گئیں... میری بہو کی پے میرے بیٹے سے زیادہ ہے... میرا بیٹا اس کا احسان مند ہے کہ گھر کے بہت سے بلز اس کی پے سے ادا ہوتے ہیں۔ میری بہو کے مقابلے میں میرا بیٹا تو بہت کم کماتا ہے۔ ایک کا مددگار دوسرا نہیں ہو گا تو کیسے چلے گا سب؟ بیوی کا مددگار شوہر نہیں ہو گا تو اور کون ہو گا؟ میرے شوہر بھی میرے مددگار رہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو بھی یہی سکھایا۔ خدمت فرض نہیں ہوتی۔ احساس فرض ہوتا ہے۔ سہولت اور آسانی فرض ہوتی ہے۔ رشتہ وہی خالص جو گلے کا پھندا نہ بنے' الٹا پھولوں کا ہار بن جائے۔"

"تو کیا ہم نے اپنے وقتوں میں نہیں کیا؟" جمیلہ شرمندگی سے سر اٹھا کر بولی۔

"اپنے وقتوں کو کب تک روؤ گے؟... بدل بھی دو وقت... بدل بھی دو روایت۔ بس بھی کر دو یہ سب سکون حاصل کرو کچھ... اپنی بیٹیاں بوجھ لگتی ہیں تو پہلے دوسروں کے بوجھوں کو سہل کرو... انہیں اپنی سر آنکھوں پر بٹھاؤ' پہلے انہیں یہ احساس دلاؤ کہ تمہارے گھر چھوٹے ہیں تو کیا ہوا' تمہارے گھر کی بڑی عزتوں کو ہم اپناتے ہیں... یہ گائے نہیں' بکریاں نہیں کہ ان کے کان ناک دانت چیک کریں... ہم انہیں انسان سمجھ کر عزت دیتے ہوئے گھروں کو لے جاتے ہیں... کالے رنگ کو چھوٹی ناک کو چھوٹے قد کو لمبی ناک کو چھوٹی آنکھ کو رد کرتے ہو' جاؤ جا کر پہلے خدا سے لڑو کہ اس نے انہیں ایسا کیوں بنایا ہے۔ سکون کی نیندیں تو تم نے خود خود پر حرام کی ہیں۔

جہیز جیسی لت تم نے خود پال رکھی ہے۔ عمروں کے کم زیادہ کا پیمانہ تم نے خود ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے۔ بہوؤں کی ایک ایک جنبش پر تو تم نظریں ٹکائے بیٹھے ہو۔ پھر سکون کیسے ملے' نیندیں حرام کیوں نہ ہوں۔ تم وقت سے پہلے بوڑھے کیوں نہ ہو۔ نہ خود بدلتے ہو نہ اپنی نسل کو... نسل در نسل ایسی عجیب باتیں منتقل کیے جا رہے ہو۔ وحشت نہیں ہوتی تمہیں اس سب سے... جی نہیں اوبھتا تمہارا... کب تک جھیلو گے یہ سب... اب بس بھی کر دو... اور یہ... یہ تم کہاں ایک دم سے اٹھ کر چل دیں۔"

"سچ بتاؤں تو تمہاری باتوں نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ نیچا کر دیا ہے تم سے..."

"تم ابھرنا چاہتی ہو؟" جمیلہ نے سر ہلا دیا۔

"پھر ایک وعدہ کرلو خود سے... جو چھوٹا بیٹا رہ گیا ہے... اس کے لیے ایسا نہیں کرو گی۔"

"تو کیسا کروں؟"

"جو بھی لڑکی نیک سیرت' سلیقہ شعار ہو اسے اپنے گھر کی بہو بنا لو گی۔ خواہ وہ تمہارے بیٹے کی ہم عمر ہو یا اس سے بڑی... وہ چھوٹے گھر میں رہتے ہوں یا ٹوٹے پھوٹے گھر میں... اور اس کے باپ بھائی وغیرہ کا حسب نسب نہیں دیکھو گی... تم ایسا کرنا... پھر کوئی تمہاری بیٹیوں کے لیے بھی ایسا ہی کرے گا۔"

"ان شاء اللہ" جمیلہ نے کہتے ہوئے خود سے وعدہ کر لیا۔

☼

ثمرہ عاشق

کچھ اصول اس دنیا کے بھی

"ارے ننھی! یہ دیکھو۔ تم نے میری قمیص کتنی ڈھیلی سی ہے اور ادھر کاندھے کے پاس سے بھی دیکھو' کتنی لٹکی ہوئی لگ رہی ہے۔" مریم نے اپنے کپڑے ننھی کے سامنے پھیلاتے ہوئے اعتراض پیش کیا' جس کے جواب میں ننھی نے گھور کر مریم کے سراپے پہ ناقدانہ نظر ڈالی۔

"ارے نہیں' نہیں ننھی! اب میں اتنی بھی موٹی نہیں ہوں کہ تم میری قمیص کی جگہ یہ تھیلا سی کر دے دو۔" مریم فوراً" اپنے پھیلے ہوئے موٹے تازے وجود سے نظریں چرا کر اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

"یہ بات جا کر اپنی ماں کو سمجھاؤ' جس نے تمہاری ناپ دیتے وقت خود کہا تھا کہ اس ناپ والی قمیص سے دو انچ ڈھیلی سینا۔" ننھی سے مزید خاموش نہ رہا گیا۔ وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

"بس ننھی غلطی ہو گئی مجھ سے' جو اپنے کپڑے اپنی مما کے ہاتھ تمہارے پاس بھجوا دیے۔ اب تم ان کو ٹھیک کر دو۔ بے شک تم اس سوٹ کے تھوڑے زیادہ پیسے لے لینا۔" مریم جانتی تھی غلطی خود اس کی اپنی ہے۔ اس لیے ننھی کا مزاج بھانپتے ہوئے فوراً" صلح جو انداز میں تجویز پیش کی۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں فٹنگ کر دوں گی۔ اب جاؤ شام چار یا پانچ بجے تک لے جانا۔" ننھی جانتی تھی کہ جب پیسے لے کر کسی کا کوئی کام کیا جاتا ہے تو پھر اس کے نخرے بھی سہنے پڑتے ہیں۔ اس لیے اب مریم کو مزید اکڑ دکھانے کے بجائے اس کا کام ہو جانے کا اشارہ دے کر باہر دروازے کا راستہ دکھایا۔

اب ننھی کو مریم کے کپڑوں سے زیادہ اس گھر میں شروع ہونے والی نصیحتوں کی فکر تھی' جو اسے اب کئی گھنٹے برداشت کرنی تھیں۔ اور وہی ہوا' جیسے ہی مریم کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹی' دو طنز بھری نظریں اس کی منتظر تھیں' جنہوں نے اب رات تک اس کا موڈ خراب رکھنا تھا۔

"میں نے کتنی بار سمجھایا ہے ننھی! جب بھی کسی کے کپڑے سیتی ہے' اچھی طرح ناپ لینے کے بعد سیا کر' اب اچھا لگتا ہے کیا روز کوئی نہ کوئی اپنے کپڑے شکایات کے ساتھ واپس لے کر آ جاتا ہے' جسے ٹھیک کرنے میں تمہارا سارا ٹائم بھی ضائع ہوتا ہے اور محنت بھی ڈبل کرنی پڑتی ہے۔ اب دیکھو تم نے مریم کی قمیص کتنی ڈھیلی سی دی ہے؟ ٹھیک ہے وہ تھوڑی موٹی ہے' پر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے نا کہ جو انسان 22 انچ کی قمیص میں پورا آ سکتا ہے' اس کے لیے 25 انچ کی قمیص۔۔۔"

"بس کرو اماں! ابھی وہ مریم میرا دماغ چاٹ کر گئی ہے۔ اب آپ مت شروع ہو جاؤ۔ اس کی ماں ناپ دیتے وقت خود کہہ کر گئی تھی کہ "میں مریم کے دن بدن پھیلتے ہوئے وجود سے فکر مند ہوں' تم اس ناپ والی قمیص سے تھوڑی کھلی سی دینا تاکہ وہ ایک سیزن تو آرام سے پہن سکے۔" ننھی جھنجلاتے ہوئے اصل وجہ ماں کو سمجھانے لگی۔

"دیکھو ننھی! تم اتنے سارے کپڑے سلائی کرتی ہو' تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ مریم جیسی فیشن ایبل لڑکیاں کھلے کپڑے پہننا پسند نہیں کرتیں' کوئی کچھ بھی کہے' تم جس کے کپڑے سیتی کرتی ہو اسی کے مزاج کے مطابق سیا کرو۔" ننھی ابھی ماں کو ہی

مشکل تو کل کر رہی تھی کہ ان سے ترا ایک اور بجز
بھالی ہی بولی تو بڑی ہو اور آج انداز بھی بہت ہی
رہیے گھر ہی گی
اس ایک وقت میں بابا کی بس ہی بڑی کسی تھی
سے بہت تنگ اور صاحب ان کا [illegible] سمجھا دیے گئے ہیں
ان کی بابا سب سے وقت خود تکلیف ہے آگے گئی تھی
آخر میں ہیے تنگ ہی بھی تھی جب گھر میں تنگ ہی

رہی تو بھی اس میں بھی نے کسی اور اداس میں بچی جھانا
تھا کر "بچا [illegible] کہیں کیا" سے
بیٹی ماما قسمت کرتی ان کی تھی کے ہاں آ گئی تھی
گئی تو [illegible]
بڑی کی قسمت [illegible] نہیں گی



" کسی لڑکی سے اٹھ کر تمہارا پانی لے کر آ رہی ہو

بہن کیسی تھکی ہاری گھر لوٹی ہے۔" ننھی برآمدے میں بیٹھی کپڑے سلائی کر رہی تھی' جب ماں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی' جو کافی دیر سے تارا کے انتظار میں گیٹ کے چکر لگا لگا کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ ننھی کا دھیان بھی سلائی سے زیادہ ماں کی طرف ہی تھا' وہ جانتی تھی اب رات کو ماں کی دکھتی ہوئی ٹانگیں بھی اسی کو دبانی تھیں۔

"ننھی پانی پلانے کے بعد گرما گرم چائے بھی بنا دینا۔ سچ آج تو آفس میں بہت کام تھا۔ سر درد سے پھٹنے والا ہے۔" تارا کمرے میں جانے کے لیے برآمدے سے گزرتے گزرتے ایک اور حکم جاری کر گئی۔ ننھی نے بے زاری سے نظریں اٹھا کر دیکھا جہاں ماں بیٹی آگے پیچھے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

"کیا مصیبت ہے' اماں کو بھی بس اپنی یہ ایک ہی بیٹی نظر آتی ہے۔ اپنی اس پڑھی لکھی بیٹی کو تو کبھی نہیں کہا کہ اٹھ تارا! بہن کو چائے' پانی پلا دے' کتنی دیر سے مشین پہ کپڑے سلائی کر رہی ہے۔ اس کی کمر اکڑ گئی ہوگی۔" لیکن نہ جی ان کو میری فکر کیوں ہونے لگی۔ میں کون سا تارا کی طرح ہر ماہ تنخواہ کی رقم ان کے ہاتھ پہ لا کر رکھ سکتی ہوں' وہ کیوں میری فکر کریں گی۔ ننھی یہ سب اپنی ماں کو نہیں کہہ سکتی تھی اور نہ ہی ماں کی نافرمانی کرنے کا سوچ سکتی تھی' بس دل ہی دل میں کلستی کچن کا رخ کر چکی تھی۔



"یہ کون سا وقت ہے تمہارا ناشتا کرنے کا؟ دیکھو تو کتنے گھنٹے ہو گئے ہیں تارا کو دفتر گئے ہوئے اور بھائی بھی صبح آٹھ بجے کا اسکول گیا ہوا ہے اور ایک تم ہو جو بارہ بجے تک پڑی سوتی رہی ہو۔" نفیسہ بیگم برآمدے میں بیٹھی سبزی کاٹتے ہوئے ننھی کو سمجھاتے ہوئے بولیں' جو ان کے سامنے بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔

"بس کرو اماں! اب صبح صبح میرا موڈ مت خراب کرو! میرے پاس بھی یہ چند دن ہی رہ گئے ہیں' پھر میں بھی اٹھ جایا کروں گی۔ آپ کی اس لاڈلی تارا کی طرح' ویسے بھی آج میرے پاس بہت زیادہ کام ہے۔ تنگ مت کرو مجھے' اپنے یہ لیکچر سنا کے۔" ننھی اپنے ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے تنک کر بولی۔

"ننھی ادھر آؤ بیٹا! میری بات سنو!" وہ جیسے ہی برتن دھونے کے بعد کچن سے نکلی' نفیسہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے پاس بلایا۔

"جی بولیں اماں! کیا بات ہے؟" ماں کو سنجیدہ دیکھ کر موڈ خراب ہونے کے باوجود خاموشی سے ان کے پاس آ بیٹھی۔

"بیٹا! صبح تارا کہہ کر گئی تھی کہ آج دفتر سے تنخواہ ملنی ہے' تو وہ دفتر سے واپسی پہ اپنی وہیں کی کسی سہیلی کے ساتھ کچھ ضروری سامان لینے کے لیے بازار جائے گی۔"

"اف اماں! آپ نے مجھے یہ بتانے کے لیے بلایا ہے؟ ابھی میں نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ مجھے بہت زیادہ کام کرنا ہے آج' کچھ شادی کے ضروری کپڑے سینے ہیں میں نے۔" نفیسہ بیگم سانس لینے کے لیے رکی ہی تھیں کہ ننھی ان کی بات کاٹتے ہوئے درمیان میں ہی بول پڑی۔

"ننھی! میں تم سے یہ کہہ رہی تھی کہ وہ تمہارے لیے کچھ لے کر آئے یا نہ لے کر آئے' تم اپنا دل برا مت کرنا! دیکھو وہ دفتر میں پورا پورا دن اتنی محنت کرتی ہے۔ جو بھی تنخواہ ملتی ہے وہ لا کر میرے ہاتھ پہ رکھ دیتی ہے۔ گھر کا آدھا خرچا اسی کی تنخواہ سے تو پورا ہوتا ہے' ورنہ تمہارے ابا کی پنشن میں بھلا اس گھر کا خرچا کہاں پورا ہونا تھا؟" نفیسہ بیگم نے اپنی بات دوبارہ وہیں سے جوڑی جہاں سے درمیان میں ننھی بول پڑی تھی۔

"اماں! آپ جانتی ہو آپ کی یہ ننھی بہت نکمی اور بے وقوف سہی' پر اس معاملے میں آپ کو تنگ نہیں کرتی' میں نے تو ابا کے بعد سے فرمائشیں بھی کرنا چھوڑ دی ہیں۔ جب میں اس گھر میں کوئی چیز لے کر نہیں آسکتی تو پھر آپ کا یہ خدشہ کیسا کہ میں اس گھر میں آئی ہوئی کسی چیز پہ اعتراض کروں گی؟" ماں کے

آنسو پونچھتے ہوئے ننھی دھیمی آواز میں بولی۔
"میں جانتی ہوں بیٹا! میری یہ ننھی اس معاملے میں مجھے کبھی تنگ نہیں کرتی' پر بیٹا میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری اس ننھی کو دل ہی دل میں اپنی ماں سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ اکثر بے دھیانی میں تارا کی فکر کرتے ہوئے میں اپنی ننھی کو نظرانداز کر جاتی ہوں' پر بیٹا ایک ماں کبھی اپنے بچوں میں فرق نہیں کر سکتی۔ اس لیے تم بھی کبھی ایسا خیال اپنے ذہن میں مت لانا' میں کبھی اپنی بیٹیوں کے درمیان فرق نہیں کر سکتی۔" نفیسہ بیگم دوبارہ بولیں' تو بے بسی ان کے لہجے سے برسنے لگی۔
"ارے اماں! آپ کیوں فکر کرتی ہو؟ میں جانتی ہوں میری اماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بس میں ہی کام سے گھبرا کر ذرا جلدی جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتی ہوں اور آپ کے ساتھ بدلحاظی کر جاتی ہوں' پر اماں میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں آپ کی نافرمانی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" معمول سے ہٹ کر جھنجلاہٹ کا شکار ہونے کے بجائے ننھی نے نرمی سے جواب دے کر ماں کے سارے خدشے دور کر دیے۔
ماں کی شاید ان ہی باتوں کا اثر تھا کہ شام کو جب تارا اپنا قیمتی نفیس سا سوٹ دکھانے کے بعد لان کا سستا سا سوٹ ننھی کو تھما کر اپنا سوٹ جلدی سی دینے کا آرڈر دے کر ہٹی تو وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر تارا کا سوٹ پانی میں بھگونے کے لیے چل دی۔
"میرے پاس بھی بس یہ دو تین سال ہی رہ گئے ہیں۔ پڑھائی مکمل کر کے میں بھی اچھی سی نوکری کروں گی' پر تارا کی طرح یہ ناانصافی نہیں کروں گی۔ سب کے لیے ایک سی چیز لے کر آؤں گی۔" ننھی گویا اپنے آپ سے وعدہ کرنے لگی۔
آج صبح سے ہی وہ ماں کی باتیں سن کر اداسی کا شکار ہو گئی تھی۔ ماں کو تو وہ تسلی دے چکی تھی' پر آج ٹوٹ کر باپ کی یاد ستا رہی تھی۔ ماں سے چھپ کر دو بار کمرے میں جا کر رو بھی چکی تھی' پر اداسی تھی کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور آج بہن کی اس حرکت سے تو کچھ زیادہ ہی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔
دو سال پہلے اچانک دل کے دورے کی وجہ سے باپ کی وفات نے ان ماں بیٹیوں کو معاشی مشکلات کا سامنا کروایا تھا' تارا ان ہی دنوں ایم ایس سی کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ گو ابھی رزلٹ نہیں آیا تھا' پر بہترین اکیڈمک ریکارڈ نے ایک پرائیویٹ آفس میں کمپیوٹر آپریٹر کی اچھی سی پوسٹ پہ نوکری ملنے میں مدد دے دی تھی' ننھی تھرڈ ایئر کے پیپر دے کر فی الحال چھٹیوں کی وجہ سے گھر پر ہی تھی۔ میٹرک کے بعد کی چھٹیوں میں شوقیہ طور پر سیکھی گئی سلائی اس کے لیے کافی مددگار ثابت ہوئی تھی' گو وہ گھر کا خرچ چلانے میں تو ماں کا ہاتھ نہیں بٹا پا رہی تھی' پر کالج کی فیس' کتابیں اور کرائے وغیرہ کے لیے وہ ماں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی تھی اور سب سے چھوٹا حماد ابھی میٹرک میں ہی تھا جسے تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوکری کے لیے باپ کی پوسٹ پر ہی لگنا تھا۔
"ماں میں ننھی کے لیے یہ یونیفارم کا کپڑا بھی لے کر آئی تھی۔" تارا نفیسہ بیگم کو ان کا اور حماد کا سوٹ دکھانے کے بعد ایک شاپر ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
"اصل میں اماں مجھے اپنے لیے یہ سوٹ پسند آیا تھا تو میں نے لے لیا اور جتنے پیسوں کا میں نے اپنا یہ ایک سوٹ لیا ہے اتنے ہی پیسوں میں ننھی کے لیے یہ دو سوٹ لے لیے ہیں۔ ایک وہ لان کا جو اس کو دے دیا ہے اور ایک یہ یونیفارم' پر اماں آپ ابھی یہ یونیفارم چھپا دو۔ کچھ دنوں میں اس کا کالج کھلنے والا ہے' تب دے دینا' وہ بہت خوش ہو گی۔" تارا چہرے پہ ہلکی سی مسکان سجائے گویا ماں کو وضاحت دینے لگی۔
نفیسہ بیگم تارا کے سر پر ہاتھ پھیر کر کپڑوں کے شاپر اٹھا کر اندر رکھنے چل دیں' پر یہ سب دیکھنے اور سننے کے لیے ننھی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ تو کہیں اور ہی کھوئی ہوئی تھی۔ پانی کب کا ٹب کو بھرنے کے بعد نیچے گرنا شروع ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"یہ کیا کررہی ہو ننھی؟" نفیسہ بیگم تارا کے ساتھ صحن میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ جب انہوں نے برآمدے میں مشین کے پاس بیٹھی ننھی کو عجیب و غریب شکلیں بنا کر کسی پرانے کپڑے کی ادھیڑبن میں مصروف دیکھ کر سوال کیا۔

"اماں! کل جب آپ تارا کے ساتھ خالہ کے گھر گئی تھیں نا' تب وہ سامنے والی طاہرہ آنٹی اپنی یہ دو پرانی شلواریں دے کر گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ یہ شلواریں مجھے گھیر کے پاس سے تنگ ہورہی ہیں۔ تم ان کی بیلٹ ادھیڑ کر گھیر میں ڈال دو اور اوپر بیلٹ کی جگہ پہ پرانا کپڑا لگادو' تاکہ نظر نہ آئے۔" ننھی مصروف سے انداز میں نظریں اٹھائے بغیر ماں کو تفصیلی جواب دینے لگی کیونکہ ذرا سی بے دھیانی سے کپڑا پرانا ہونے کی وجہ سے سلائی کے پاس سے پھٹ رہا تھا۔

ننھی کی بات سنتے ہی نفیسہ بیگم ایک جھٹکے میں صحن پار کرکے ننھی کے سر پر پہنچیں اور اس سے وہ کپڑے جھپٹ کر ایک طرف پھینکے۔

"خبردار! جو تم نے ان کپڑوں کو ہاتھ بھی لگایا تو' کس نے کہا ہے تمہیں یہ سب کرنے کے لیے؟ ضرورت کیا ہے تمہیں ایسا کام کرنے کی؟" نفیسہ بیگم ہذیانی انداز میں ننھی سے سوال کرنے لگیں۔

ننھی ماں کی اس حالت سے بے خبر گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور ناسمجھی کے عالم میں ماں کا چہرہ تکنے لگی۔ نفیسہ بیگم اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے ننھی کو پکڑ کر صحن میں تارا کے برابر بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! کبھی اپنی عزت نفس کا سودا مت کرنا' ہر انسان کا ایک معیار' ایک عزت اور مقام ہوتا ہے' تم بھی اس معیار سے گر کر کبھی کسی کا کوئی ایسا کام مت کرنا کہ تم اگلی بار اس شخص سے نظریں ملانے میں کسی بھی قسم کی جھجک محسوس کرو۔" "تم ان کے یہ کپڑے واپس کردو۔ ان کو صاف صاف کہہ دو کہ میں پرانے کپڑے مرمت کرنے کا کام نہیں کرتی۔ عزت سے صاف ستھرا نیا سوٹ سلائی کرتی ہوں اور اسی محنت کے پیسے وصول کرتی ہوں' جو کوئی آپ کے پیسوں سے مرعوب ہو' جاکر اسی سے یہ کام کروالیں۔ مجھے ایسے پیسے کی ضرورت ہی نہیں ہے جس میں کوئی عزت ہی نہ ہو' کل میں گھر پر نہیں تھی' ورنہ میں تمہیں ان سے یہ کپڑے لینے ہی نہ دیتی' اسی وقت ان کے منہ پر مار دیتی۔" اونچا اونچا اور مسلسل بولنے کی وجہ سے نفیسہ بیگم کا سانس پھولنے لگا۔ تارا نے خاموشی سے اٹھ کر پانی کا گلاس لاکے ماں کو تھمایا۔

"ننھی! اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں' تمہیں ان سے یہ کپڑے لینے ہی نہیں چاہیے تھے۔ سیلف ریسپکٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں تم ابھی چھوٹی ہو۔ تم تو ہماری ننھی ہو۔ تمہیں شاید ابھی یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ تمہاری یہ ماں اور بہن کیوں تمہیں ہر وقت ٹوکتی رہتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بہن کو محبت سے سمجھاتے ہوئے تارا کی آنکھوں میں بھی ماں کی طرح بوندیں جھلملانے لگیں۔

اپنی غلطی سمجھ میں آتے ہی ننھی کے ذہن سے جھٹ سے اپنی بہن کے بارے میں پچھلے دو سالوں سے چھائی دھند چھٹ گئی۔ پورے دو سال بعد اس کو اپنی کھوئی ہوئی بہن واپس مل گئی تھی جس نے شاید باپ کی وفات کے بعد اپنے اوپر مصروفیت کا خول چڑھا لیا تھا اور جس کو ننھی کبھی سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔

ننھی کو آج اپنی زندگی کا بہت بڑا سبق مل چکا تھا۔

"اس دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے لیے انسان کو خود ہی اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی یہ کہ خون کے رشتے اتنے بھی کمزور نہیں ہوتے کہ انسان ان رشتوں سے زیادہ عرصہ تک بدگمان رہ سکے' بس ان رشتوں کو سنبھال کر رکھنے کا ہنر آنا چاہیے۔

ذہن میں یہ نئی سوچ آتے ہی ننھی ماں اور بہن کے گلے جا لگی جہاں نم آنکھیں' مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اس ہی کی منتظر تھیں۔



نعیمہ ناز

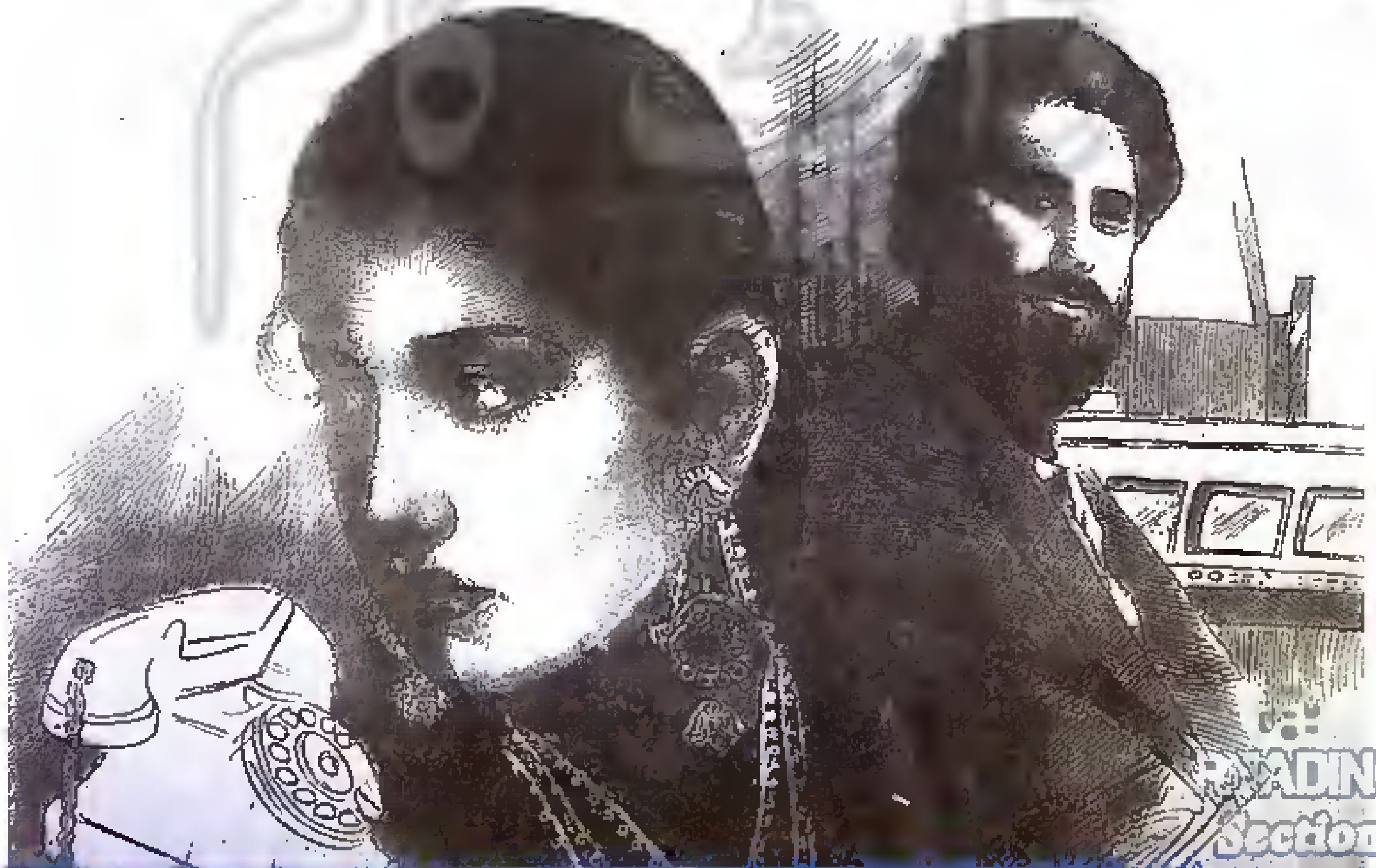
دل و نظر کی بات ہے

نانی بی سو کر اٹھ چکی تھیں اور اب منتظر نگاہوں سے حریم کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ بیدار ہو کر اپنی نیند بھری آنکھوں کو مسل رہی تھی۔ رات بجلی کی آنکھ مچولی نے بہت تنگ کیا تھا۔ تقریباً" پوری رات ہی جاگتے گزری تھی۔

حریم نے پہلے پانی کے دو چار چھپاکے منہ پر مارے تو نیند غائب ہوئی اور مندی مندی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ تولیے سے اپنا چہرہ اور ہاتھ خشک کر کے وہ نانی بی کے پاس آگئی۔ سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور اسی طرح سہارے سے چلاتی ہوئی باتھ روم لے گئی۔

شیمپو کھول کر انہیں نہلایا۔ موسم گرما تھا اس لیے روزانہ ہی انہیں نہلا دیتی تھی' ایک ماہ پیشتر تو وہ اتنی محتاج نہیں تھیں' کمزوری تو تھی مگر غسل وغیرہ خود کر لیتی تھیں۔ حریم مدد کروا دیتی تھی۔ شیمپو اور صابن لگا دیتی۔ کمر مل دیتی اور وہ نہا لیتیں' مگر پچھلے ایک ماہ سے ان کی کمزوری بڑھتی جا رہی تھی' پھر ایک نیا مسئلہ اور ہو گیا' بیٹھے بٹھائے ان کا پیشاب نکل جاتا۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مثانہ کمزور ہو گیا ہے۔ دوائیاں دے دیں۔ تھوڑا بہت فرق پڑا مگر زیادہ نہیں' حریم نے انہیں پیمپر لگانا شروع کر دیا۔

مکمل ناول



✿ ✿ ✿

نہلا دھلا کر حریم انہیں کمرے میں لے آئی۔ پشت پر تولیہ پھیلا کر بال تھوڑی دیر کو یوں ہی کھلے چھوڑ دیے' انہیں پاؤڈر لگایا اور خود کچن میں ناشتا بنانے لگی۔ سیب کا تازہ جوس نکال کر لائی' انہیں پینے کو دیا' پھر اپنے کپڑے نکال کر خود نہانے گھس گئی۔ نانی بی کو جوس دینے کے آدھے گھنٹے بعد انہیں پورج بنا کر دیتی' کبھی سلائس انڈے' جیم یا بٹر کے ساتھ' ان کے ساتھ ساتھ خود بھی ناشتا کر لیتی۔

احتشام اگر آیا ہوا ہوتا تو اسے بھی ناشتا بنا دیتی۔ سائٹ کے علاقے میں اس نے اپنی نئی فیکٹری بنائی تھی۔ وہ اسی میں مصروف اور مگن رہتا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے اس کا معمول تھا کہ وہ فیکٹری کے قریبی علاقے میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگا تھا' وہاں سے دس پندرہ منٹ لگتے تھے علی الصبح فیکٹری پہنچ جاتا اور رات گئے تک واپس آتا' فیکٹری کی تعمیر کے پہلے دن سے لے کر آج تک وہ دن رات گدھوں کی طرح محنت کر رہا تھا۔ یہاں گھر پر بھی مہینے میں ایک بار ویک اینڈ پر آتا اور دو دن بعد چلا جاتا۔ یہاں سے سائٹ کے علاقے میں آنے جانے میں چار گھنٹے آنے میں لگتے' دو جانے میں وہ آنے میں' پھر شہر کے غیر متوقع اور غیر معمولی حالات' لہٰذا اس نے وہیں قریب میں ہی فلیٹ میں رہنے کو ترجیح دی۔

اس کی تمام تر فوکس اور توجہ اپنی نئی نویلی فیکٹری اور نوزائیدہ بزنس پر تھی' جسے وہ جلد از جلد مضبوطی سے نہ صرف اپنے پیروں پہ کھڑا کرنا چاہتا تھا بلکہ اس قابل کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندگی کی ریس میں یوں بھاگے کہ وننگ لائن کو چھو کر ہی دم لے۔ اس کے خواب اور عزائم بہت اونچے تھے' دن رات کے چوبیس گھنٹے بھی اسے محنت کے لیے کم لگتے تھے۔ کم کھانا' کم سونا' زیادہ جاگنا اور بہت زیادہ محنت کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اس ہفتے وہ گھر آیا ہوا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق صبح اٹھ کر وہ جاگنگ پر گیا ہوا تھا۔ اب دو گھنٹے بعد آیا تھا۔ حریم نے جوس کا گلاس اس کے سامنے میز پر رکھا۔ "دادی امی نے ناشتا کر لیا؟"

اس نے گلاس لبوں سے لگایا "جی" حریم ویسے ہی کم گو تھی۔ احتشام کے سامنے اس کی بولتی اور بھی بند ہو جاتی۔ حالانکہ وہ بہت نرم اور شائستہ مزاج تھا۔ شاذ ہی بد خلقی یا تند خوئی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ پھر بھی حریم زیادہ بات نہیں کر سکتی تھی اس سے' پتا نہیں کیوں؟

"تمہارا رزلٹ کیا آیا؟" یعنی انہیں معلوم ہے کہ رزلٹ آ گیا۔ حریم نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے "جی" کہا۔

"کیا آیا؟"

"ایک پیپر رہ گیا ہے۔" حریم کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ احتشام کی ساری نصیحتیں' تاکیدیں بھاپ بن کر ہوا میں اڑ گئی تھیں۔

"انگلش؟" احتشام نے جوس کا گلاس میز پر رکھا۔

"نہیں۔ اکنامکس ہے" (انگلش میں رٹا کام آ گیا۔ شکر ہے کہ پاسنگ مارکس آ گئے۔) حریم نے دل ہی دل میں سوچا' مگر یہ کم بخت اکنامکس۔

"اب کیا کرو گی؟" احتشام نے بغور اس کا جائزہ لیا جو شرمندگی اور ندامت میں پور پور بھیگ رہی تھی۔

"سپلی دوں گی۔"

"اب سپلی میں محنت کرو گی تو یہی محنت پہلے ہی کر لیتیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حریم نے کچھ نہ کہنے میں ہی عافیت جانی۔ شکر ہے کہ خلاف توقع اس نے کوئی لمبا چوڑا لیکچر نہیں دیا۔ حریم تو شکر ادا کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

احتشام دادی امی کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کیں۔ پھر اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔ مہینے میں جو ایک دو دن وہ گھر پر گزارتا تھا' اس میں بھی اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ ایک تو سیل فون سے جان نہیں چھوٹتی تھی۔ اتنی کالز آتی تھیں اسے' جو وقت بچتا اس میں لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا

رہتا۔ دوست احباب' رشتے دار' محلے دار کوئی آجاتا تو انہیں کچھ وقت دیتا۔ اپنی ای میلز چیک کر کے باری باری ان کے جواب دے رہا تھا۔ جب حریم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"یس۔" اس کی انگلیاں برق رفتاری سے اپنا کام کرتی رہیں اور آنکھیں اسکرین پر ہی رہیں۔

"ناشتا؟" حریم خجالت کے مارے سوال بھی ادھورے کر رہی تھی۔

"ریڈی ہے؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے' میں آرہا ہوں۔" احتشام نے جلدی جلدی اپنا کام مکمل کیا اور ٹیبل پر آگیا۔

"ہاجرہ نہیں آئی؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ملازمہ کے بارے میں سوال کیا۔

"نہیں۔"

"ویسے مہینے میں کتنے ہفتوں کی چھٹیاں کر لیتی ہیں محترمہ۔" احتشام نے توس کا ٹکڑا توڑا۔

"کبھی حساب نہیں رکھا۔" حریم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"رکھا کرو' اپنے کام کی تنخواہ لیتی ہے وہ' چھٹیوں کا حساب کر کے تنخواہ کا حساب کیا کرو۔" احتشام ناشتا کرتا جارہا تھا اور ساتھ ساتھ حسب معمول نصیحتیں بھی۔ "نرمی اور درگزر اچھی کوالٹیز ہیں مگر ایک حد سے زیادہ نہیں' ورنہ اگلا شخص لاپروا اور غیر ذمے دار بن جاتا ہے اور اپنے لیے ہر رعایت کو فار گرانٹڈ لیتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو' میں کیا کہہ رہا ہوں۔" احتشام نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

"جی۔ جی۔" حریم گڑبڑا گئی۔

"میں سوچ رہا ہوں دادی امی کے لیے کوئی نرس ہائر کر لوں' ٹوئنٹی فور آورز کی مل جائے تو بہت اچھی بات ہے' ورنہ پورے دن کے لیے ہی سہی۔" وہ آدھا ناشتا ختم کر چکا تھا' جب اس نے یہ نیا موضوع اٹھایا۔

"نانی بی کے لیے؟" حریم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "گھر میں رکھتی تو ہوں ان کا خیال۔ پھر نرس کی کیا ضرورت۔"

"تمہیں اور بھی کام ہوتے ہیں' اس ذمہ داری کے ساتھ۔" حریم نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "اور تو کوئی خاص کام نہیں ہوتے' ہر کام کے لیے تو میڈ آتی ہے' میں تو بس نانی کا خیال رکھتی ہوں اور ان ہی کے کام کرتی ہوں۔" حریم نے جلدی جلدی وضاحت کی۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے مگر پھر بھی یہ تمہاری ذمے داری نہیں ہے' کسی نرس کا بندوبست تو بہرحال کرنا ہی ہے۔"

"ذمہ داری نہیں' یہ میرا فرض ہے' بزرگوں کی خدمت تو سعادت کی بات ہے' میرا گڈ لک ہے کہ مجھے نیکیاں کمانے کا موقع مل رہا ہے۔" جوش میں بولتے ہوئے حریم کا لہجہ کچھ تقریری سا ہو گیا تھا۔ (بعد میں اسے خود بھی حیرانی ہوئی کہ اس نے احتشام کے سامنے اتنے لمبے لمبے ڈائیلاگز کیسے بول لیے۔ بہرحال مکالمے اچھے تھے پراثر۔ حریم نے خود کو شاباش دی۔

"میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں کسی قسم کی پریشانی یا مشکل نہ ہو۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے' میں یہاں بہت آرام سے ہوں اور بہت خوش بھی۔" حریم نے آخر میں خوشی کا بھی اضافہ کر دیا۔

"ہوں۔" احتشام نے سر ہلایا۔ اس کا ناشتا ختم ہو چکا تھا۔ کھڑے ہو کر اس نے کرسی پیچھے کھسکائی اور حریم سے مخاطب ہوا۔

"اپنی اسٹڈیز پر دھیان دینا' گھر کے معاملات اور پریشانیاں سر پر سوار مت کرنا' ان سب کے لیے میں ہوں' سمجھ گئیں؟"

"جی۔" حریم نے بڑی تابعداری سے سر ہلایا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہر بار اسٹڈیز کے معاملے میں احتشام کے سمجھانے پر ہلایا کرتی تھی۔



وہ فربہی مائل گوری چٹی خاتون تھیں' بالوں میں' ہاتھوں میں' ناخنوں پر مہندی ہمہ وقت رچائے رکھتی تھیں۔ اونچی کھڑی ناک میں پتنی سونے کی لونگ کو اتنا عرصہ ہوچکا تھا کہ اس کے سنہری رنگ پر اب میل کی سیاہی غالب آگئی تھی۔ چہرے کے نقوش جاذب نظر تھے' نوجوانی میں بلاشبہ خوب صورتوں میں شمار تھا۔ اب گوشت کی تہوں اور چہرے کی ہلکی ہلکی جھریوں میں اس حسن گمشدہ کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی تھی۔ زمانہ ساز اور عیار اپنی فطرت میں پہلے ہی سے تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان خصوصیات میں اضافہ ہی ہوا تھا' کمی نہیں آئی تھی' سگے بھتیجے کے ساتھ غضب کی مشابہت تھی' کوئی اجنبی دونوں کو ایک ساتھ دیکھتا تو ماں بیٹا ہی سمجھتا' خیر دوسرے تو جو سمجھیں وہ سمجھیں وہ بہرحال اپنے عزیز اکلوتے بھتیجے کو سگے بیٹے سے کچھ کم عزیز نہیں سمجھتی تھیں۔

پھر اس گھر میں ان کی سگی ماں موجود تھیں۔ جن کی بیماری نے انہیں لاچار بنادیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے حفیظہ خاتون نے اپنی بیٹی حریم کو یہاں چھوڑ دیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ یہاں تھی۔ نانی کی خدمت کے لیے اور احتشام کی دیکھ بھال کے لیے گوکہ احتشام کو اس کی خدمات کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی مگر اس کی دادی امی کے لیے یہ بڑی سہولت تھی۔ حریم بچپن سے ہی نانی کے پاس زیادہ رہی تھی' اس لیے وہ اسی سے مانوس تھیں۔ احتشام خود کو اسٹیبلش کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حریم کی وجہ سے بہرحال اسے گھر اور گھریلو امور کے کچھ جھنجھٹوں سے فراغت ضرور مل گئی تھی۔

حفیظہ خاتون نے حریم کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر یہاں چھوڑا تھا اور گاہے بہ گاہے اسے سمجھاتی ہی رہتی تھیں مگر ان کی دانست میں ان کی یہ بیٹی انتہائی کوڑھ مغز اور بے وقوف تھی۔ کسی حد تک وہ ٹھیک بھی تھیں۔ کہتے ہیں خوب صورتی اور ذہانت بہت کم یکجا ہوتی ہیں۔ حریم خوب صورت تھی' اپنا دماغ زیادہ استعمال کرنے اور کھپانے کی قائل نہیں تھی۔ اس کے خیال میں صنف مخالف کو تسخیر کرنے کے لیے حسن کا جادو کافی ہے۔ بے شک حسن و خوب صورتی کی اپنی ایک کشش اور اہمیت ہے مگر احتشام کو وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پائی تھی ابھی' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے اپنی عادت کے مطابق اپنے دماغ کو زیادہ زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور احتشام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اب تک اندازہ نہیں ہوا تھا کہ احتشام کے نزدیک خوب صورتی ثانوی اہمیت رکھتی ہے' اولیت وہ کسی اور شے کو دیتا تھا۔

حفیظہ خاتون کو آئے ہوئے "قریباً" ایک گھنٹہ تو ہوچکا تھا۔ جو شربت پیا تھا اس کا ذائقہ بھی زبان سے ختم ہوچکا تھا۔ ڈکاریں آنی بھی بند ہوگئی تھیں۔ صوفے پر لیٹے لیٹے انہوں نے ایک زوردار جمائی لی۔

"ارے کب آئے گا یہ لڑکا۔"

"کون؟ شامی بھائی؟" قریب بیٹھی آم کاٹتی ہوئی حریم چونک اٹھی۔

"ہاں۔ اس کا ہی پوچھ رہی ہوں۔" حریم کے شامی بھائی کہنے پر انہوں نے برا سامنہ بنایا۔

"کہیں کام سے گئے ہوں گے' گھر میں وہ ٹکتے ہی کب ہیں۔"

"بتاکر نہیں جاتا۔"

"کسے۔ مجھے۔؟" حریم نے بے حد حیرانی سے ماں کو دیکھا۔ "وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں مجھے کیوں بتائیں گے' کہاں جارہے ہیں' کب آئیں گے' مجھ سے یہ سب باتیں نہیں کرتے وہ۔" حریم رسان سے بولتی ہوئی آم کاٹتی رہی۔

"کبھی کوئی تو بات کرتا ہوگا یا گونگا بنا رہتا ہے گھر میں۔" انہیں حریم کی بات پر غصہ سا آگیا۔

"کام کی بات کرتے ہیں' زیادہ فالتو باتیں نہیں بناتے' میری پڑھائی کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔"

"اچھا۔" بے زار ہوکر انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ "لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر کون سا کمشنر گورنر بننا ہے' کرنی تو

وہی ہانڈی روٹی ہے' چولہا چکی ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔"

"جی۔۔۔" حریم کی صلح جو اور امن پسند فطرت' فوراً" سر تسلیم خم کرنے کی عادی تھی۔ احتشام کی تقریر امی کے خیالات کے بالکل برعکس ہوتی تھی۔ حریم اس پر بھی بڑی تابعداری سے جی حضوری میں سر ہلاتی رہتی تھی۔

"شامی کا کاروبار کچھ جمایا نہیں۔" انہوں نے لیٹے لیٹے ایک اور سوال داغ دیا۔

"پتا نہیں۔" حریم کے جواب پر ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔ اپنا نہیں بیٹی کا۔

"وہ کچھ نہیں بتاتا تو۔۔۔ تو ہی پوچھ لیا کر۔"

"کیا؟" حریم کا بے ساختہ رد عمل احمقانہ ہی تھا۔ دراصل اس کا دھیان آموں کی طرف لگا ہوا تھا کہ انہیں ایسے ہی کھالے یا شیک بنالے۔

"ندیم بتا رہا تھا کہ شامی کا کاروبار بڑا اچھا چل نکلا ہے۔" حریم سے مایوس ہو کر امی نے خود ہی اطلاع دی۔

"بھائی جان کو کیسے پتا چلا۔" حریم چونکی۔

"ندیم کا دوست ہے نا ارمان' جس کی شادی اب ہوئی ہے ادھیڑ عمری میں آکر' اس کا چھوٹا بھائی شامی کے ہاں اکاؤنٹنٹ ہے۔" امی نے سیاق و سباق کے حوالے دے کر درست خبر سنائی تھی۔ "اسی سے ندیم خبریں لیتا رہتا ہے۔ شامی کی بھی اور اس کے بزنس کی بھی۔۔۔"

"اگر شامی بھائی کو پتا چل گیا کہ بھائی جان ان کی جاسوسی کر رہے ہیں تو وہ بہت برا مانیں گے۔" حریم نے ان کے "سورس آف انفارمیشن" کے انکشاف پر گھبرا کر انہیں آگاہ کیا۔

"کیوں برا ماننے لگا؟ ہم کوئی جاسوسی ۔۔۔ تو نہیں کر رہے' خبر گیری کرنا تو ہمارا فرض ہے۔ بن ماں باپ کا بچہ ہے' ہم خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟ پھر آج کل کا دور اور آج کل کی لڑکیاں؟ توبہ توبہ دور بھی فتنہ ہے اور لڑکیاں بھی۔۔۔ کسی ایسی ویسی نے اپنے جال میں پھنسا لیا تو؟ ہر لڑکی تمہاری طرح احمق اور بے وقوف تھوڑی ہوتی ہے اور یہ جو نوکری کے لیے نکلتی ہیں' اللہ معاف کرے (انہوں نے اپنے دونوں کان پکڑ کر ایڈوانس توبہ کی) یہ تو شکار پھانسنے نکلتی ہیں کہ کوئی موٹا مرغا ملے اور ہم لے دوچیں' کسی چلتر نے اپنے بس میں کر لیا تو ہم کیا دیکھتے رہ جائیں گے یا بھنگڑا ڈال کر دلہن کا استقبال کریں گے۔۔۔ ہیں۔۔۔" آخری لفظ خاصا ڈپٹ کر کہا گیا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔" حریم ان کی باتوں سے بے زار سی ہونے لگی تھی۔ آم کی ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"اس لڑکی کی عقل تو خدا جانے کہاں گھاس چرنے گئی ہے۔" امی نے اسے کچن کی طرف جاتے ہوئے کوفت سے دیکھا۔



"اف توبہ! کراچی کا ٹریفک' ملک اور عوام کی طرح غیر منظم اور بے ہنگم' بس اللہ توکل پہ رواں دواں۔۔۔" احتشام کو تقریباً" آدھ گھنٹہ تو ہو ہی گیا تھا۔ ٹریفک جام میں چیونٹی کی رفتار سے رینگتے رینگتے اور ابھی تک کوئی

آثار نظر نہیں آرہے تھے کہ یہ ٹریفک جام ختم ہوگا یا نہیں۔ بے زاری' کوفت اور شدید غصہ' تینوں مل کر بری طرح اس پر حملہ آور تھے' جب اس کا موبائل بجا۔ پانچ چھ گھنٹیوں تک تو اس نے موبائل کو ہاتھ ہی نہیں لگایا مگر دوسری طرف کوئی مستقل مزاج تھا۔ بڑی فرصت اور دل جمعی سے کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کررہا تھا۔ بارہویں گھنٹی پر احتشام نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے موبائل اٹھا ہی لیا۔ نمبر دیکھا تو اس کی توقع کے عین مطابق فرہاد ہی تھا۔ اس کے پورے سرکل میں اتنا ڈھیٹ ایک وہی تھا۔

"کہاں ہے یار۔۔۔؟" احتشام کی "ہیلو" کے جواب میں نہ سلام' نہ خیر خیریت پوچھنے کا تکلف' بس ڈائریکٹ سوال کا پتھر کھینچ مارا۔

"تناور پر ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"گاڑی میں؟ روڈ پر؟"

"نہیں۔۔۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر تناور پر چڑھا بیٹھا ہوں۔" ٹریفک جام سے بھنائے احتشام نے اپنا غصہ اس پر اتارا۔

"ٹریفک جام میں پھنسا ہوا ہے؟" فرہاد کا اندازہ درست تھا۔

"کیا ٹی وی میں بریکنگ نیوز آگئی۔" احتشام کا لہجہ استہزائیہ ہوا۔

"ہاں۔۔۔ ابھی دس منٹ پہلے ہیں کی فوٹیج دکھائی تھیں' نیوز چینل نے کہ ایک گھنٹے سے ٹریفک جام میں بے چارے معصوم عوام پھنسے ہوئے ہیں۔"

"اب مجھے نیوز بلیٹن مت سنا۔ کام کی بات کر' فون کیوں کیا ہے؟" احتشام کی بے زاری اس وقت اپنی حدوں کو چھو رہی تھی۔

"نبیل کا فون آیا تھا' یاددہانی کروائی ہے کہ آج اس کی مہندی کے فنکشن میں ضرور آنا ہے۔ ورنہ وہ انتقاماً" چھ ماہ کے اندر اندر ہم سب کو بھی سہرا بند ھوا دے گا۔" نبیل نے تو جو کہا ہوگا' سو کہا ہوگا مگر فرہاد کو چلبلی طبیعت ہمیشہ کی طرح شوخی پر آمادہ تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ نہ جاؤں' کیا پتا' اگلے چھ ماہ میں وہ انتقاماً" میرے سہرا بند ھوا دے' تو جائے گا؟" اچانک سوال پر احتشام نے اپنے ٹھنڈے مزاج کے مطابق تحمل سے سوچ کر جواب دیا جو نفی میں تھا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"فیکٹری کے کچھ مسئلے مسائل ہیں' انہیں دیکھنا ہے۔ میری طرف سے ایکسکیوز کرلینا' شادی پر ان شاء اللہ جاؤں گا۔"

"اچھا بھلا پروگرام مس کررہا ہے یار۔۔۔ اپنی ساری گیدرنگ ہوگی۔ اس کے فنکشن میں۔" فرہاد نے جیسے اس کا دل للچایا۔

"یار سچ بتاؤں۔۔۔ اس وقت میں انتہائی کوفت اور بے بسی کی حالت میں ہوں' آدھ گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے ٹریفک جام میں پھنسے ہوئے' رات میں کچھ موڈ بنا تو بتادوں گا' اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے' پھر رات میں بات کرتے ہیں' اوکے خدا حافظ۔" فرہاد کو شاید اس کی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا' اس لیے شرافت سے فون بند کردیا۔

اپنا سیل فون جیب میں رکھ کر' احتشام لب بھینچے سامنے آنے والی گاڑی کو گھورتا رہا۔ وہ وقت اچھا تھا جب میں موٹر سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ بے اختیار اس نے سوچا اور اگلے ہی لمحے وہ مسکرا اٹھا۔ انسان کو کسی حال میں چین نہیں ہے۔ گاڑیوں کی رفتار میں نسبتاً کچھ تیزی آئی تھی۔ اس نے بھی اپنی کار آگے بڑھانی شروع کردی۔ خدا خدا کرکے وہ فلیٹ پہنچا۔ شاور لے کر فریش ہوا تو ساری تھکن بے زاری اور کوفت زائل ہوگئی۔ مزے دار چائے کے بڑے سے مگ سے چسکیاں لیتے ہوئے وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا' نبیل کی مہندی میں جانے کے لیے' اسے واقعی بہت عرصہ ہوگیا تھا اپنے قریبی اور مخصوص دوستوں کی گیدرنگ انجوائے کیے ہوئے' میرا خیال ہے مجھے چلے ہی جانا چاہیے' ورنہ کیا بھروسا' چھ ماہ کے اندر اندر وہ میرا بھی سہرا بند ھوا دے' خاصے خوش گوار موڈ میں سوچتے ہوئے وہ بے ساختہ مسکرادیا۔



اس کا رنگ سانولے سے کسی قدر صاف اور گوری رنگت سے کچھ کم تھا۔ ناک نقشہ سجل' درمیانے قد پر تھوڑا گدازبدن' بے تکلف انداز' بے ساختہ ہنسی گویا اس کا ٹریڈ مارک تھا' یہ جویریہ تھی۔ احتشام کی چچازاد' جو اپنے والدین کے ساتھ کراچی آئی تھی' اپنی دادی کے گھر' ان لوگوں کی اپنی رہائش سکھر میں تھی' سال دو سال میں ایک آدھ بار آنا ہوتا وہ بھی زیادہ تر جویریہ کے والد ہی آکر سب سے مل جاتے تھے۔ اس بار کئی سالوں بعد اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ آئے تھے۔ جویریہ نے گریجویشن کیا تھا۔ اب وہ کراچی یونی ورسٹی سے ماسٹرز کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی۔

"ہم نے بھی کہا کہ چلو دادی کا گھر ہے' رہنے کا ٹھکانہ تو موجود ہے۔ دو سال میں پڑھائی مکمل ہو جائے گی تو واپس لے جائیں گے یا یہیں کہیں کوئی مناسب رشتہ ملا تو شادی کر دیں گے۔" جویریہ کے والد' اپنی اماں کے آگے وضاحت پیش کر رہے تھے۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے' حریم کے ساتھ رہ لے گی' اچھا ہے' بے چاری کو بھی دو سراہٹ مل جائے گی' اکیلی پڑی پڑی گھبرا جاتی ہو گی۔" انہوں نے سادگی سے سر ہلایا۔

"آپ کی بھی خدمت کر لے گی' اب ہم تو اتنی دور پڑے ہیں' پھر اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی' دوسرے کی خدمت کیا خاک کریں گے۔" بہو صاحبہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ سیدھی سادی بڑی بی سب کی سنتے ہوئے بس اثبات میں ہی سر ہلاتی رہیں۔

جویریہ کچن میں پہنچی ہوئی تھی' جہاں حریم مہمانوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر رہی تھی۔ دونوں کزنز تھیں مگر آنا جانا کم ہونے کی بنا پر ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں اور ہوتیں بھی تو سرسری' مگر جویریہ اپنی بے تکلف طبیعت اور ہنسوڑ مزاج کے ساتھ سارے فاصلوں' اجنبیت اور سرد مہری کو بالائے طاق رکھ کر باتیں کرنے میں مگن تھی۔

"تم تو بڑی ہو کر خاصی خوب صورت نکلی ہو۔" اس نے بغور حریم کا جائزہ لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"اچھا..." حریم کی رنگت مزید گلابی ہو گئی' کیبنٹ سے گلاس نکال کر اس نے ٹرے میں رکھے۔

"ایسے شرما رہی ہو جیسے میرے بجائے کسی لڑکے نے تمہاری تعریف کی ہو۔" جویریہ نے فقرہ اچھالا۔ حریم سے کوئی جواب نہ بن پڑا' وہ محض مسکرا کر رہ گئی اور جلدی جلدی ٹرالی میں لوازمات سجانے لگی۔

پائن ایپل کیک' کباب' نمکو' گلاب جامن' نگٹس' حریم نے سب کچھ ترتیب سے ٹرالی میں رکھ دیا تھا۔

"تم نے بلاوجہ ہی اتنا اہتمام کیا۔ امی' ابو ابھی تو دو تین دن رکیں گے' آرام سے کرتی رہتیں خاطر تواضع..." جویریہ نے ٹرالی کا بھرپور جائزہ لے کر اعتراض جڑا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو' اتنی دور سے آئے ہو آپ لوگ۔ ایسے ہی ٹرخا دیتی تو شامی بھائی میری کلاس لے لیتے' وہ مہمانوں کی خاطر داری بہت کرتے ہیں اور مجھے بھی سختی سے یہی آرڈر دیا ہوا ہے۔" حریم نے وضاحت کرتے ہوئے ٹرالی دھکیلنا شروع کر دی۔

"شامی بھائی نے اپنے گھر کا چارج تمہیں سونپا ہوا ہے؟" جویریہ کی مسکراہٹ اور لہجہ غیر معمولی تھا مگر حریم نے اپنے ازلی لاپروائی پن میں کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔

"ظاہر ہے میں یہاں رہتی ہوں تو سب کچھ مجھے ہی دیکھنا ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے بھی یہاں رہنا ہے تو کچھ ذمہ داریاں مجھے بھی سنبھالنی ہوں گی۔" جویریہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"تم تو مہمان ہو' ڈگری لے کر چلی جاؤ گی۔"

"اور تم... کیا مستقل مکین ہو یہاں کی؟" جویریہ نے عادتاً" فقرہ اچھالا اور ہنس پڑی' حریم کنفیوز ہو گئی۔ وہ خاموشی سے مہمانوں کو چیزیں سرو کرتی رہی۔ جویریہ معنی خیز انداز میں مسکراتی رہی۔ حریم کو اس کے انداز سے الجھن ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جویریہ بہت جلد اس کے ساتھ اس گھر میں یوں گھل مل گئی جیسے برسوں سے یہیں رہتی چلی آئی ہو اور تو اور وہ احتشام سے بھی بہت دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتی رہی' جیسے وہ بہت سالوں بعد نہیں بلکہ کچھ دنوں یا ہفتوں بعد ملنے والے کزنز ہوں۔ حریم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہی' سنتی رہی اور رشک کرتی رہی۔

"تم بہت بولڈ اور کانفیڈنٹ ہو' کاش میں بھی تمہاری جیسی ہوتی۔" ایک روز باتوں باتوں میں اس نے سادگی سے جویریہ سے کہا۔

"اوہ۔ سو سوئٹ! تم بہت کیوٹ ہو' کاش میں بھی تمہاری جیسی ہوتی۔" جویریہ نے اسی کے انداز میں بولتے ہوئے اس کے رخسار پر چٹکی بھری۔

"خالی خوب صورت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ شاہی بھائی کہتے ہیں بندے کے سر میں دماغ ہونا چاہیے اور انسان کو اس سے کام لینا آنا چاہیے۔" حریم نے منہ لٹکایا۔

"صرف دماغ؟ اور سینے میں دل ہونے نہ ہونے کے بارے میں محترم کے خیالات کیا ہیں' کچھ معلوم ہیں؟"

"پتا نہیں' ایسی باتیں تو کبھی کرتے ہی نہیں۔"

"کیسی باتیں' دل کی باتیں' کیا ساری باتیں بس دماغ کی کرتے ہیں۔" جویریہ کی مسکراہٹ مستقل اس کے ہونٹوں پہ چپکی ہوئی تھی جیسے کسی معصوم بچے کی طفلانہ باتوں کو انجوائے کر رہی ہو۔

"شاہی بھائی یا تو پڑھائی کی باتیں کرتے ہیں یا نانی کے متعلق ان کی طبیعت اور صحت سے متعلق باتیں' نصیحتیں بہت کرتے ہیں' ہر وقت سمجھاتے رہتے ہیں' پڑھائی میں دل لگاؤ' محنت کرو' اعلا ڈگری لو' یہ کرو' وہ کرو۔" حریم کو اب کہیں جاکر کوئی سامع ملا تھا جس سے وہ اپنے دل کی باتیں کرسکتی' جویریہ سے کزن کا رشتہ تو تھا ہی' اسے بہت جلد اپنی سب سے اچھی دوست مان کر اس نے اعتبار کا رشتہ قائم کرلیا تھا۔

"ہوں۔ تو ناصح بننے کا شوق ہے موصوف کو۔"

"نہیں ایک شوق اور بھی ہے' بلکہ جنون۔"

"کیا۔" جویریہ چونک گئی۔

"اپنے بزنس کو آگے سے آگے بڑھانے کا جنون' اسی چکر میں تو یہاں نہیں رہتے' فیکٹری سے قریب ہی ایک فلیٹ لیا ہوا ہے۔ یہاں تو بس ایسے ہی آتے ہیں کبھی ہفتے میں' کبھی دو ہفتے میں۔"

"آر یو شیور کہ بزنس کے ہی چکر میں وہاں رہتے ہیں؟ آئی مین کوئی اور معاملہ تو نہیں ہے؟" جویریہ نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ بڑے بھائی جان کو ایک ایک بات کی رپورٹ رہتی ہے وہاں کی' کسی لڑکی وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔" حریم بہرحال اتنی بھی عقل سے پیدل نہیں تھی۔ اس کا مدعا سمجھ گئی۔

"بڑے بھائی جان بھلا کس خوشی میں ایک ایک بات کی رپورٹ رکھتے ہیں وہاں کی؟" جویریہ سامع سے بڑھ کر اب وکیل بن گئی اور جرح کرنے لگی۔

"وہ۔ ان کے دوست شاہی بھائی کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں ناتو ان سے پتا چل جاتا ہے۔" حریم ایک لمحے کو جھجکی۔

"اچھا۔" جویریہ کا اچھا خاصا طویل اور معنی خیز تھا۔ "دوست کے ذریعے کزن برادر کی جاسوسی۔" وہ ایک لمحے میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔

"نن۔ نہیں۔ جاسوسی تو نہیں۔ امی کہتی ہیں کہ باخبر رہنا چاہیے۔ شاہی بھائی کسی غلط چنگل میں نہ پھنس جائیں۔" گھبراہٹ میں وہ راز پہ راز فاش کیے جارہی تھی اور جویریہ کا قہقہہ چھت توڑنے کو بے تاب۔۔۔

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔" اس نے ہونٹ سکوڑے' بڑے آرام سے کشن اٹھا کر گود میں جمایا اور اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"ویسے شاہی بھائی کی تو فکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے' میرا خیال ہے کہ ان میں ٹھیک ٹھاک عقل موجود ہے' اپنا اچھا برا پہچاننے کی' مگر تمہاری امی جان کے ارادے کچھ نیک نہیں لگ رہے

ہیں مجھے...."

"پتا نہیں۔" حریم سر جھکا کر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

"تمہیں نہیں پتا تو پھر کسے پتا ہے؟" جویریہ نے اسے اکسایا۔

"تم یہ سب باتیں کسی سے کہنا نہیں پلیز...." حریم کو رازداری برتنے سے متعلق ماں کی ہدایتیں اور سختی بھرا لب ولہجہ یاد آئے تو اس کا خون خشک ہونے لگا۔

"کون سی باتیں؟" جویریہ نے معصومیت کی انتہا کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ حریم اس کے انداز پہ مسکرادی۔ کچھ اطمینان اور کچھ تشکر کے ساتھ۔



بلو جینز کے ساتھ گرے ٹی شرٹ' بال ماتھے پر بکھرے ہوئے' گھریلو سے حلیے میں وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ نظریں اسکرین پر اور انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں' کتنی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر گردن پیچھے کو گرائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ ناک میں کافی کی خوشبو پہلے آئی اور قدموں کی آہٹ بعد میں' اس کے آنکھیں کھولنے سے پیشتر آواز کانوں میں آئی۔

"کافی حاضر ہے جناب۔"

"اوہ... تھینک یو... ویری مچ۔" وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہوں... اچھی بنی ہے۔" اس نے پہلا گھونٹ لیتے ہی بے ساختہ تعریف کی۔

"شکریہ...." سنجیدہ اور نپی تلی مسکراہٹ لبوں پہ آگئی۔

"حریم کہاں ہے؟"

"ٹی وی دیکھ رہی ہے۔ اس کے فیورٹ ڈراموں میں سے کوئی ایک آرہا ہے اس وقت...."

"اچھا...." احتشام کی پیشانی پہ ناگواری کی شکن آگئی۔

"دیکھنے دیں' ابھی تک بچوں والا دماغ ہے اس کا' لاابالی پن اور لاپروائی نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا حریم کا اور آپ اپنی عمر سے اور ضرورت سے زیادہ ہی میچور ہوگئے ہیں۔" جویریہ نے سادہ سے لہجے میں بے ضرر سا تبصرہ کیا تھا۔

"زندگی اور وقت بہت قیمتی ہیں' انہیں یوں ضائع کرنا میری سمجھ سے توباہر ہے۔" احتشام نے لب بھینچے اور گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگا۔

"ہوسکتا ہے وہ اپنی دانست میں اپنی زندگی اور اپنے اس وقت کو انجوائے کررہی ہو' یادگار انداز میں گزار رہی ہو' ہر ایک کا زاویہ نظر الگ الگ ہوتا ہے نا۔" جویریہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ پرکشش پراعتماد اور باصلاحیت.... احتشام اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"حریم کا اور تمہارا ایج ڈیفرنس کوئی خاص نہیں ہے مگر تم تو خاصی میچورڈ ہو۔" احتشام نے غیر شعوری طور پر دونوں کا موازنہ کیا تھا۔

"ہر شخص دوسرے سے تھوڑا یا زیادہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں' نہ ہی اس میں کوئی ایج فیکٹر اہم ہوتا ہے۔ حریم میں ایسی خوبیاں ہیں جو شاید مجھ میں نہیں۔ وہ بہت تابعدار اور خدمت گزار ہے۔ خاص طور پر آپ کی تابعدار اور ہماری دادی جان کی خدمت گزار۔ ان کی جو خدمت اور کام حریم کرتی ہے۔ میں اس سے بہت امپریس ہوتی ہوں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اس معاملے میں وہ بہت کائنڈ اور پیشنٹ ہے۔" احتشام نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" جویریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا؟" احتشام نے اس کے یوں کھڑے ہوجانے پر اچنبھے سے اسے دیکھا' ابھی اس کی بات مکمل تو نہیں ہوئی تھی۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ ہماری دریا دل پھپھو جان نے اپنی مہربان بیٹی کو اس کی نانی جان کی خدمت کے لیے چھوڑا ہوا ہے جو کہ وہ دل وجان سے کررہی ہے اور اس کی اپنی دادی جان' سگی دادی'

ایدھی ہوم میں پڑی ہوئی ہیں۔" جویریہ کے لبوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

احتشام چند لمحے اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا' پھر اسی سنجیدگی سے گویا ہوا۔ "میری آنکھیں بھی ہیں اور دماغ بھی۔۔۔ میں دونوں کو استعمال کرتا ہوں۔ میں کسی کے خیالات اور معاملات میں انٹرفیر نہیں کرتا اور اپنے معاملات میں کسی کو انٹرفیر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ سب سے قطع نظر میرا اپنا ایک وے آف **تھنکنگ** اور وے آف لائف ہے' مجھے جو کرنا ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور جو کرنا ہوگا وہی کروں گا۔ حالات و واقعات ہو یا افراد مجھ پہ کوئی اثرانداز نہیں ہو سکتا۔"

احتشام کے قطعیت سے بھرپور لہجے پر وہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اتنا اعتماد' کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو جیسے' خود پر اتنا بھروسا' اللہ اللہ' یہ وہ نرم خو شائستہ اور مہربان احتشام نہیں تھا' جسے وہ پچھلے دو مہینے سے دیکھ اور سمجھ رہی تھی مگر بس وہ ایک لمحے کا تاثر تھا جو اگلے ہی لمحے زائل ہو گیا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پہ لاتے ہوئے وہ اسی نرم لہجے میں جویریہ سے مخاطب تھا۔

"تم نے کافی بہت اچھی بنائی تھی' اگلے ہفتے بھی بنا کر پلاؤ گی؟"

"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔" وہ بھی مسکرا دی۔



ان دو ماہ کے دوران حفیظہ خاتون کے اتنے چکر لگ گئے تھے میکے کے جو پہلے سال چھ ماہ میں ہی لگتے تھے' ابھی بھی وہ کل شام سے آئی ہوئی تھیں۔ رات بڑی مشکل سے کاٹی' صبح جویریہ کے یونی ورسٹی جانے کے بعد وہ حریم کو لے کر بیٹھ گئیں۔

"کچھ پتا تو چلے آخر۔۔۔ شاہد اور عظمی اپنی جوان جہان بیٹی کو یہاں اس طرح کیوں چھوڑ گئے ہیں۔" وہ بری طرح بلبلائی ہوئی تھیں اور ان سے زیادہ اب حریم بلبلا گئی تھی' ان کی آئے دن کی تفتیش سے۔

"کتنی بار بتا چکی ہوں امی کہ وہ یونی ورسٹی میں پڑھنے آئی ہے یہاں' ماسٹرز کرنے کے لیے۔" حریم بری طرح زچ ہو گئی تھی۔

"ارے تو کیا وہاں یونی ورسٹی نہیں ہے' جہاں سے آئی ہے۔"

"مجھے کیا پتا۔" حریم نے اپنا مخصوص اور دل پسند فقرہ دہرایا' جو دن میں چند ایک بار تو ضرور ہی استعمال ہوتا تھا۔ مجھے کیا پتا' یا پتا نہیں۔

"نہیں پتا تو معلوم کرونا' اسے ٹٹولو' دل کا بھید لو' آخر کس ارادے سے آئی ہے یہاں یا بھیجی گئی ہے۔ پہلے تو کبھی ہمارے بھائی' بھاوج کو اپنی ماں کا خیال نہیں آیا۔ کبھی جھانکتے بھی نہیں تھے' سال دو سال گزر جاتے تھے' اب یکایک جوان جہان پلی پلائی بیٹی یہاں چھوڑ دی۔ پڑھائی وڑھائی کا تو بہانا ہے' ورنہ اصل بات کچھ اور ہے' میں سب جانتی ہوں ان مطلبی لوگوں کی خصلت کو۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولیں۔

"مجھ سے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ اب مجھے کیا پتا اس کے ارادے یا ماموں' ممانی کے عزائم کیا ہیں۔" حریم خائف ہو کر ناخن چبانے لگی۔

"تمہاری طرح بے وقوف تھوڑی ہے' گھنی ہے اپنی ماں کی طرح' ایسے ہی تھوڑی منہ کھول کر سب بتا دے گی جیسے تم ہر بات اگل دیتی ہو اور ہاں۔۔۔" اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے چند لمحوں تک بغور بیٹی کا چہرہ دیکھا' پھر گویا ہوئیں۔ "تم نے تو کچھ نہیں بک دیا اس کے آگے اپنے بارے میں۔۔۔" وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ ٹٹول رہی تھیں۔ اندر تک ان کی نگاہیں حریم کا ایکسرے کر رہی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا اس سے۔"

حریم صاف مکر گئی۔ گو کہ اس کی ہتھیلیاں بھیگ رہی تھیں۔ ماں کے آگے جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں تھا مگر سچ بولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

"لڑکی ہوشیار بہت ہے' بچ کر رہنا اس سے' کبھی اس کی میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں میں آکر کچھ اگل دو۔" چہرے پہ سختی اور آنکھوں میں خشونت لا کر

انہوں نے بیٹی کو تنبیہہ کی۔
"جی۔" حریم نے سر جھکا کر مختصر جواب میں ہی عافیت جانی۔



جویریہ یونی ورسٹی سے آئی' تھکی ہاری' کپڑے تبدیل کر کے' وہ سیدھی کچن میں گھسی' بھوک کے مارے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں' اسے اکثر ہی دیر ہو جاتی تھی آتے آتے' اس نے حریم سے کہا ہوا تھا کہ وہ اس کے آنے کا انتظار نہ کیا کرے' کھانا کھا لیا کرے' حریم کبھی کھا لیتی تھی' کبھی انتظار کر کے اس کے ساتھ کھاتی تھی۔ جویریہ کھانا ٹرے میں لے کر ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ ٹی وی کھولنے کے لیے ریموٹ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ کسی بوتل کے جن کی طرح حفیظہ خاتون وہاں نازل ہو گئیں۔

"کھانا کھا رہی ہو؟ حریم تو تمہارا انتظار کر کر کے بھوکی سو گئی' اتنی دیر میں آئی ہو تم۔" ان کی نظریں اور لہجہ دونوں تنقیدی تھے۔ جویریہ نے ایک گہری سانس لی اور ریموٹ واپس رکھ دیا۔

"میں نے حریم سے کہا ہوا ہے کہ وہ میرا انتظار نہ کیا کرے' کھانا کھا لیا کرے' مجھے تو اکثر دیر ہو جاتی ہے' خاص طور پر پریکٹیکل کے دنوں میں۔" اس نے رسان سے جواب دیتے ہوئے کھانا کھانا شروع کیا۔

"کھانا کھائیے۔"

"نہیں بھئی' میں اتنی دیر بھوکی نہیں رہ سکتی۔ شوگر کی پیشنٹ ہوں۔"

"اوہ۔ کب سے؟" جویریہ نے تشویش سے انہیں دیکھا۔

"سات سال ہو گئے ہیں۔"

"پرہیز کرتی ہوں گی۔"

"ہاں۔ بس پرہیز کر لیتی ہوں' کبھی بدپرہیزی بھی ہو جاتی ہے۔" انہوں نے بےزاری سے جواب دیا۔

وہ جویریہ سے تفتیش کرنے آئی تھیں۔ اس نے الٹا ان ہی کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

"تم اپنی کھو کیا پڑھنے آئی ہو یہاں۔"

"ماسٹر کرنے آئی ہوں۔"

"تو وہاں نہیں ہے کوئی یونی ورسٹی' جو اماں بابا نے دوسرے شہر بھیج دیا۔"

"ڈگری ویلیو ایبل نہیں ہے نا وہاں کی' پھر امی ابو کا خیال ہے کہ یہیں سے ڈگری لے کر کوئی جاب کر لوں' بڑے شہر میں بڑے مواقع ہوتے ہی جاب کے۔"

"اور رشتوں کے بھی۔" پھپھو جان نے لقمہ دیا۔

جویریہ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا' کھانسی آگئی۔ اس نے جلدی سے گلاس اٹھا کر چند گھونٹ پانی پیا۔

"شاباش ہے ہمارے بھائی بھاوج کو' بیٹی کو یوں کسی کے گھر اکیلے چھوڑ دیا۔" انہوں نے پھر طنز کیا۔

"میری دادی کا گھر ہے' کسی غیر کا نہیں۔" جویریہ نے اپنا غصہ پی کر لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"خدمت کے لیے دادی یاد نہیں آئی۔"

"آپ نے چھوڑا ہوا ہے نا اپنی بیٹی کو ان کی خدمت کے لیے' کسی اور کی باری کہاں سے آئے گی۔" جویریہ مسکرائی۔

"وہ تو بچپن سے یہیں زیادہ رہی ہے۔" حفیظہ خاتون تلملائیں۔

"آگے بھی شاید یہی امکان ہے۔" جویریہ اطمینان سے بول کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ شعلہ بار نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ "توبہ توبہ' کتنی زبان دراز' بدتمیز ہے' اتنا پڑھ لکھ کر بھی تمیز تہذیب نہ سیکھی۔"

وہ وہیں بیٹھی کھولتی رہیں۔ اب مجھے جلد از جلد اماں سے بات کر لینی چاہیے شاہی اور حریم کے متعلق' بڑی چلتا پرزہ لڑکی ہے' میری سیدھی سادی حریم سے اس کا کیا مقابلہ' کہیں شاہی کو قابو کر لیا چلتر نے تو میری معصوم بیٹی تو منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے بناتی رہیں۔ جوڑ توڑ کرتی رہیں۔



چھٹی کے دن جویریہ تو اپنی نیند پوری کر کے دیر سے

اٹھتی تھی مگر حریم کی روٹین وہی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر نانی کے سارے کام کرنا' انہیں ناشتا کروانا' احتشام کا ناشتا بنانا' اپنا ناشتا تو بس وہ یوں ہی کبھی چلتے پھرتے کرلیتی' کبھی احتشام کے ساتھ کرلیتی' کوشش تو یہی کرتی تھی اس کے ساتھ زیادہ دیر نہ ہی بیٹھے تو اچھا ہے' اس کے لیکچر سن کر خوامخواہ اپنے بارے میں احساس کمتری ہونے لگتا تھا۔ احتشام ناشتا کرنے بیٹھا تو جویریہ کا پوچھنے لگا۔

"وہ ابھی تو سو رہی ہیں۔"

"پورے ہفتے بہت ٹف روٹین رہتی ہے اس کی۔" احتشام نے تبصرہ کیا تھا یا خود کلامی' حریم سمجھ نہیں پائی' ہاں مگر اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا ضرور تھا۔ امی کے خدشات' ڈراوے اور سمجھاوے' ایک ایک کرکے اس کے ذہن میں آنے لگے۔ عجیب مصیبت میں جان آگئی تھی۔ احتشام اسے اچھا بھی لگتا تھا اور اس سے ڈر بھی لگتا تھا۔ اوپر سے جویریہ آگئی تھی بقول امی کے ویمپ بن کر۔

"کیا ہوا... کیا سوچ رہی ہو۔" اپنی ادھیڑبن میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ احتشام کی بغور جائزہ لیتی نظروں کی زد میں تھی۔

"میں... سوچ رہی تھی کہ دوپہر میں کیا پکاؤں۔" اس نے سوچ سوچ کر بات بنائی۔

"کچھ بھی بنالو۔" لاپروائی سے کہتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا' پھر سوچ کر کہنے لگا۔ "جویریہ سے پوچھ لینا' کیا پسند کرتی ہے کھانے میں' مہمان ہے کچھ عرصے کی۔"

"کچھ عرصے کی؟ دو سال تک رہنے والے مہمان ہوتے ہیں۔" بے اختیار اور بلا ارادہ ہی جانے کیسے اس کی زبان پھسلی۔

"ہوں... یہ بھی ٹھیک ہے کہ دو سال تک رہنے والے مہمان نہیں ہوتے۔" احتشام نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ "تو پھر گھر کا فرد مان لو۔" وہ اچانک بولا۔

"آئی تو اسی ارادے سے ہیں۔" حریم اس کی بات پر کلس کر رہ گئی۔ امی کی باتیں سچ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

احتشام تو ناشتا کرکے حسب معمول باہر نکل گیا۔ وہ ملازمہ کی مدد سے صفائی کروا کے' کچن کا سارا کام نپٹا کر کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ لوڈشیڈنگ کا وقت تھا۔ ورنہ ٹی وی چلا کر ہی اپنی بوریت دور کرنے کا سامان کرلیتی' میگزین اٹھا کر یوں ہی ورق گردانی کرنے لگی۔ تب ہی جویریہ آگئی' جمائیاں لیتی ہوئی۔

"ارے تم تو بڑی فارغ ہو کر بیٹھی ہو۔" اپنی مندی مندی آنکھیں دوبارہ بند کرتے ہوئے وہ اس کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ "اتنی نیند آرہی ہے کیا بتاؤں... روزانہ مشکل سے تین چار گھنٹے سوتی ہوں' دل چاہ رہا ہے رات تک سوتی رہوں۔" جویریہ راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے اسائنمنٹ مکمل کرتی تھی۔ شام میں' وہ فارغ ہوتی تھی مگر لوڈشیڈنگ کی وجہ سے کمپیوٹر پر کام نہیں کرسکتی تھی۔ لائٹ آتی تو رات گئے تک کمپیوٹر پر کام کرتی رہتی۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ' واقعی بے چاری تھک جاتی ہوگی' اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچیں اور کیفیات بھول بھال کر وہ اب ہمدردی سے جویریہ کو دیکھ رہی تھی۔

"ناشتا تو کرلو' پھر سو جانا دوبارہ۔"

"نہیں بھئی' بہت سولی' اب تو جاگنا ہی جاگنا ہے۔" وہ ایک دم چھلانگ مار کر اٹھ بیٹھی اور بالوں کو سمیٹ کر پونی باندھنے لگی۔

"اگلے ہفتے سے میری شام کی مصروفیت بھی شروع۔" جویریہ نے ایک اطلاع دی۔

"کیسی مصروفیت؟" حریم چونکی۔

"کچھ ملاقاتیں' کچھ باتیں' کچھ انوکھی ساعتیں۔" اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔

"کیا مطلب..." حریم بالکل ہونق ہوگئی۔

"کوئی مطلب نہیں جان من' میں نے ایک اکیڈمی جوائن کرلی ہے۔ ٹیچنگ کروں گی تین گھنٹے کا ٹھیک ٹھاک اماؤنٹ مل رہا ہے۔ میرے چھوٹے موٹے خرچے تو نکل ہی جائیں گے۔" جویریہ حسب عادت زور سے ہنس پڑی۔

"تم تو ویسے ہی یونی ورسٹی سے تھکی ہوئی آتی ہو' کیسے مینیج کرو گی؟"

"نو گین ود آوٹ پین' تم نے سنا نہیں ہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اس وقت اپنی نیند اور آرام کی قربانی دیں گے تو فیوچر میں کچھ ملے گا نا۔"

"پھر بھی۔ بہت ہمت اور محنت کا کام ہے یہ' میں تو شاید کبھی نہ کر سکوں" حریم نے ایک جھرجھری لی۔

"ہر شخص الگ الگ انداز اور طریقوں سے محنت کرتا ہے۔ اب مثلاً" تم جو محنت گھر سنبھالنے میں.... دادی جان کی کیئر کرنے میں کرتی ہو' وہ خاصی قابل رشک ہے' بس ایک معاملے میں ذرا نکمی ثابت ہو رہی ہو۔" جوریہ کا انداز معنی خیز ہو گیا۔

"کس معاملے میں؟" حریم نے جلدی سے سوال کیا۔

"کسی کے دل کے اندر تک پہنچنے میں۔ کسی کو اپنا بنانے میں' کسی کی اپنی بن جانے میں۔"

"بہت مشکل مشکل باتیں کرتی ہو۔" حریم کچھ کچھ مطلب سمجھ جانے کے بعد بھی انجان بن گئی۔

"میری بھولی بھالی چڑیا' ایسے ہی معصومیت دکھاتی رہو گی تو کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں۔"

"کون سا مقصد؟" حریم نے نظریں چرائیں۔

"جس مقصد کے لیے پھپھو جان نے تمہیں یہاں چھوڑا ہے۔" جوریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" بے اختیار بولتے ہی حریم نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"تم ہی نے تو بتایا تھا' بے وقوف....!" جوریہ نے اس کے گالوں کو چومتی لٹ کھینچی اور باہر نکل گئی۔

"میں نے کب بتایا تھا؟" حریم حیران پریشانی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

جوریہ ہاتھ منہ دھو کر کچن میں گھس گئی۔ کوئی لمبا چوڑا مینیو تو تھا نہیں اس کے ناشتے کا' چھٹی کے دن بھی وہی عام دنوں والا ناشتا کرتی تھی۔ ایک سلائس پہ بٹر ایک پر جیم لگا کر ایک بڑا مگ دودھ پتی چائے کا اور لاؤنج میں میز پر آ گئی۔ وہ ناشتا کر رہی تھی' جب احتشام واپس آ گیا۔

"ناشتا کیجیے" جوریہ نے اسے آفر کی۔

احتشام نے ایک نظر اس کے ناشتے پر پھر دوسری نظر سامنے دیوار پر آویزاں گھڑی پر ڈالی اور سادگی سے گویا ہوا۔

"ناشتا تو میں نے صبح کر لیا تھا' اب تو میرے لنچ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

"لنچ میں کیا کیا لیں گے؟"

"جو مل جائے۔" لاپروائی سے بولتا ہوا احتشام صوفے پر ٹک گیا۔

"بڑے قناعت پسند ہیں آپ۔" جوریہ نے چائے کا مگ ہونٹوں سے لگایا۔

"ہر وقت نہیں' ہر معاملے میں نہیں' بس تھوڑا بہت۔" وہ مسکرایا۔

"آگے بڑھنے کی لگن میں۔" جوریہ کا لہجہ توصیفی ہوا۔

"لگن نہیں پیشن' مجھے پیشن ہے آگے بڑھنے کا یہ بلکہ آگے سے آگے بڑھنے کا۔"

"کیا کریں گے آگے سے آگے بڑھ کے؟"

"انسان پہاڑ کی چوٹی فتح کر کے کیا کرتا ہے؟" احتشام نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

"پہاڑ کی چوٹی فتح کرنے کے بعد فاتح جھنڈا لگاتا ہے اور واپس نیچے اتر آتا ہے' اور بس؟" جوریہ نے بڑے اطمینان اور سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

احتشام نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ حریم آ گئی۔ "شامی بھائی! لنچ میں کیا بناؤں آپ کے لیے؟"

"کچھ بھی بنا لو' تمہارے شامی بھائی خاصے قناعت پسند ہیں اس معاملے میں۔" احتشام کے بجائے جوریہ نے جواب دیا۔

"تمہارے بھائی؟ اگر امی یہ الفاظ سن لیں تو فی الفور جوریہ کا گلا دبا دیں۔ حریم نے دہل کر اسے دیکھا پھر بے

چارگی سے احتشام کی طرف۔
"بتادیں کیا پکاؤں؟" اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔
"روزانہ کس سے پوچھ کر پکاتی ہو؟"
"کبھی نانی اماں سے پوچھ لیتی ہوں کبھی ماموں جان سے کبھی خود سے کچھ سوچ کر پکا لیتی ہوں۔"
"چلو آج جویریہ سے پوچھ لو' ان کی پسند کا کچھ بنالو۔ کیوں؟" احتشام نے ناشتہ کرتی جویریہ کو بغور دیکھا۔
"تم ہی بتادو۔" حریم کا روئے سخن جویریہ کی طرف ہوا۔
"بھئی مجھے تو ہر وہ چیز پسند ہے جو پکی پکائی' بنی بنائی مل جائے' اس لیے۔" اس نے ایک لمحہ کو ٹھہر کر کندھے اچکائے۔ "کچھ بھی پکالو۔"
"یہ اچھا جواب ہے' جو ہر جگہ سے ملتا ہے' کچھ بھی کون سی ڈش کا نام ہے۔" حریم جانے کیوں بدمزہ سی ہورہی تھی۔ امی نے ہی ہدایت کی تھی کہ جب احتشام گھر پر ہوا کرے تو اسی سے پوچھ کر کھانا پکایا کرو' اور ذرا محنت کرکے' اچھا کرکے پکایا کرو' مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ انہوں نے ایک مقولہ دہرایا تھا گو کہ دنیا اور لوگوں کے بدلے رجحانات اور خیالات کے باعث حریم اس مقولے سے بہت زیادہ اتفاق تو نہیں کرتی تھی مگر پھر بھی امی کی ہدایات پر عمل تو کرنا ہی تھا۔ مگر یہ جویریہ۔ بھی اس سے ہمدردی ہونے لگتی تھی کبھی چڑ۔
"سالن روٹی یا چاول؟" حریم نے کسوٹی کا آغاز کیا۔
"مجھے چاول پسند ہیں۔"
"مجھے روٹی سالن پسند ہے۔" جویریہ اور احتشام تقریباً" ایک ساتھ بولے تھے۔
"ٹھیک ہے پھر مٹر پلاؤ بنالیتی ہوں اور مٹن اسٹو۔" حریم نے کسوٹی کھیلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے جلدی سے مینو فائنل کرلیا۔
"حریم کھانا اچھا بناتی ہے۔ ہے نا۔" جویریہ کا ناشتہ تو ختم ہوچکا تھا مگر وہ شاید گپ شپ کے موڈ میں تھی۔
"ہاں' ہاں۔" احتشام پہلے تو چونکا پھر سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ "ہاں یہ تو ہے۔"
اتنا سوچ کر جواب۔ افسوس کے مارے حریم کا برا حال ہوگیا۔ کبھی کبھار ہی سہی مگر مہینے ڈیڑھ مہینے میں ایک آدھ بار تو میرے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہیں۔ وہ کچن میں چلی گئی' دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے' پیچھے پیچھے جویریہ بھی ناشتے کے برتن لے کر پہنچ گئی۔
"میں کچھ ہیلپ کروادوں۔" اپنے برتن دھوتے ہوئے جویریہ نے آفر کی۔
"نہیں میں کرلوں گی' پہلے بھی تو کرتی تھی۔" حریم نے تکلف کا مظاہرہ کیا۔
"پہلے میں نہیں تھی' تم اکیلی تھیں' اب تو میں ہوں' تھوڑا بہت کام تو کرواہی سکتی ہوں' بولو کیا کرنا ہے' اسٹو بنادوں؟ چاول تم بنالو۔"
"نہیں سالن میں بنالوں گی تم چاول بنالو۔" حریم نے جلدی سے اسے ٹوکا۔
"ایزیو وش۔" جویریہ نے حسب عادت کندھے اچکائے۔
"تم اپنے شامی بھائی سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" جویریہ نے چاول چنتے ہوئے اچانک سوال کیا۔
"ڈرتی تو نہیں ہوں' بس ایسی بے تکلف نہیں ہوں جیسے تم آتے ہی ہوگئی ہو۔"
حریم نے تو رسان سے کہا تھا مگر جویریہ نے حسب عادت فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ "اچھا تو تمہیں طنز کرنا بھی آتا ہے۔"
"میری کیا مجال' میں کسی پر خاص طور پر تم پہ طنز کروں۔"
"کیوں نہیں' تم مجھ پر یا اپنے شامی بھائی پہ یا کسی اور پر بھی' کبھی بھی طنز کرسکتی ہو۔"
"مجھے کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں لگتا۔" حریم فریزر میں سے گوشت کا پیکٹ نکال کر بھگو رہی تھی۔
جویریہ اک دم خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ "تم واقعی بہت اچھی لڑکی ہو' بہت معصوم سی' مگر تم یا پھپھو شامی کے حوالے سے جو کچھ سوچ رہے ہو وہ ہونا مشکل ہے' وہ اپنے آپ کو انتہائی تیز رفتار سپر

سونک اور پلین بنانے پر تلے ہوئے ہیں' ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں' پرواز ہی پرواز' بلندی ہی بلندی' اور تم ٹھہریں ایک معصوم سی ہرنی' کتنی ہی تیز چلانگیں مار لو' سپر سونک کے ساتھ چل سکتی ہو نہ اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔"

"پھر کیا کروں؟" فکر مندی سے کہتے ہوئے حریم کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ' جویریہ کے سامنے اپنا راز اگل رہی ہے۔

"اپنی رفتار چینج کرو' اپنے آپ کو چینج کرو' کم سے کم جیٹ طیارہ تو بنو۔"

"کیسے کروں۔" حریم نے جھنجلا کر بے بسی سے پوچھا۔

"کم سے کم اپنی موجودگی کا تو احساس دلاؤ کہ تم ہو' تم بھی ہو بلکہ تم ہی ہو۔" جویریہ ناصح بن کر اسے سمجھا رہی تھی۔

"مجھے یہ سب نہیں آتا۔ میں تمہاری طرح ان سے باتیں نہیں کر سکتی' میں ہر ٹاپک پر کیا کسی بھی ٹاپک پر زیادہ دیر نہیں بول سکتی' خاص طور پر شاہی بھائی کے ساتھ میں نہ ذہین ہوں نہ بولڈ' امی کہتی ہیں' میں بالکل بدھو ہوں' میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" حریم نے منہ لٹکالیا۔

"بات سنو بے وقوف لڑکی! کسی کی توجہ اور محبت پانے کے لیے تمہارا ڈگری یافتہ ہونا ضروری نہیں۔" جویریہ نے چاول ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں شاہی بھائی کی ڈیٹ آف برتھ معلوم ہے؟"

"نہیں۔" حریم نے نفی میں سرہلایا۔

"بالکل ہی ڈفر ہو' خیر یہ تو معلوم ہو جائے گا' اچھا چلو نیا سال شروع ہونے والا ہے' اچھے سے طریقے سے وش کرنے کی پلاننگ کرتے ہیں' ٹھیک ہے۔" جویریہ کچھ پرجوش سی ہو کر بولی۔

"اچھا۔" حریم کچھ متذبذب سی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کچھ بھی۔ مگر پھر بھی اس نے جویریہ کی باتوں اور مشوروں پر عمل کرنے کے لیے حامی بھرلی۔

☼ ☼ ☼

لنچ کے بعد احتشام کچھ دیر تک بیٹھا دادی جان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ کافی بہتر لگ رہی تھیں' ان کی بہتر کنڈیشن دیکھ کر احتشام ذرا مطمئن ہو گیا تھا۔ پھر انہیں آرام کرنے کی تاکید کر کے کمرے سے باہر آگیا۔ لاؤنج میں حریم بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی' اسے دیکھ کر حریم نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر آواز ہلکی کر دی۔

"دادی جان کی کنڈیشن پہلے سے بہت بہتر ہے' بڑی اچھی خدمت کر رہی ہو تم' ویری ویل' آئی ریئلی امپریس۔" احتشام کے دو تین فقروں نے حریم کے دل کو خوشی سے معمور کر دیا۔

"یہ تو میرا فرض ہے۔"

"جو کام' محبت کے ساتھ کیے جائیں ان میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔" احتشام صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جویریہ کہاں ہے؟"

حریم ابھی اس کے پہلے فقرے کی شیرینی سے لطف اندوز بھی نہ ہونے پائی تھی کہ احتشام کے اگلے سوال نے اس کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

"کمرے میں ہو گی۔" حریم نے آہستہ سے جواب دیا۔ اتنے میں جویریہ آتی ہوئی دکھائی دی۔

"آؤ لڑکی! ابھی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا میں۔" احتشام اسے دیکھ کر خوش گوار موڈ میں گویا ہوا۔

"میں۔ نماز پڑھ رہی تھی۔" جویریہ نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا اس نے ساتھ ہی اگلے سانس میں سوال بھی داغ دیا۔

"خیریت تو ہے' میرے بارے میں پوچھ گچھ کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔"

"بس یونہی' تم حریم کے ساتھ نظر نہیں آئیں تو پوچھ لیا۔" احتشام کا لہجہ لاپروا سا تھا۔

"میں کوئی حریم کی جوڑی دار ہوں جو اس کے ساتھ ساتھ نظر آؤں۔" جویریہ نے حسب عادت زوردار قہقہہ لگایا۔ کوئی ہو نہ ہو وہ اپنی باتوں سے خود ہی لطف

اندوز ہو جاتی تھی۔
"تو؟ کیا ہو رہا ہے آج کل' اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔"
"اسٹڈیز تو بہت اچھی جا رہی ہیں اور ویسے آج کل۔" وہ سوچ کر کہنے لگی۔
"کبھی سوشل میڈیا پر ہوتی ہوں۔ کبھی گوگل پر' کل میں نے اسٹارز کے بارے میں کافی انٹرسٹنگ چیزیں پڑھیں۔"
"ڈو یو بلیو ان اسٹارز؟" اس نے اچانک احتشام سے سوال کیا۔
"زیادہ نہیں' بس تھوڑا بہت۔"
"آپ کا اسٹار کیا ہے؟"
"کیپری کورن۔"
"اوہ' سینگوں والا جنگلی بکرا۔" جوریہ نے لب سکوڑے۔ "دسمبر یا جنوری؟"
"میری ڈیٹ آف برتھ؟" وہ ایک لمحے کو رک کر مسکرایا۔ "نئے سال کا آغاز یکم جنوری۔"
"ویری انٹرسٹنگ' پھر تو ہیپی نیو ایئر اور ہیپی برتھ ڈے آپ ساتھ ساتھ مناتے ہوں گے۔" جوریہ نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"میں دونوں میں سے کچھ بھی سیلیبریٹ نہیں کرتا' بس ہیپی نیو ایئر کہہ کر اپنے دوستوں کو وش کر دیتا ہے' ایک دو کلوز فرینڈز ہیں' وہ مجھے "ہیپی برتھ ڈے" کہہ کر وش کر دیتے ہیں۔"
"ارے بھئی میں تو اپنی برتھ ڈے ایسی سوکھی سوکھی' کبھی نہ مناؤں' ہم تو ہلا گلا کرنے کے شوقین لوگ ہیں' فرینڈز ہوں' گھر والے ہوں کیک کٹے' ہیپی برتھ ڈے کا شور اور گفٹس اف۔" اس نے آنکھیں میچیں۔ "میں تو پورے سال اپنی سالگرہ کے دن کا انتظار کرتی ہوں۔"
"ہوں۔ تو کب آتا ہے وہ روز سعید؟"
"بس آپ کے بعد ہی فروری میں۔"
"کتنے مزے سے بیٹھ کر باتیں بگھار رہی ہے' امی ٹھیک ہی کہتی ہیں اسے مکار' گھنی' چلتر۔" حریم کے اندر جانے کیوں غصہ ابلنے لگا۔
"تمہارا اسٹار کیا ہے حریم۔" دفعتاً جوریہ نے اسے مخاطب کیا۔
"جمنائی۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے جواب دیا۔
"جمنائی' ڈپلومیٹ ہوتے ہیں اندر سے کچھ' باہر سے کچھ۔" جوریہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔
حریم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ احتشام بول پڑا۔
"ارے نہیں' ہماری حریم تو بڑی سوئٹ قسم کی لڑکی ہے۔" حریم کے اندر دور دور تک ٹھنڈک سی پھیل گئی' چند من موہنے الفاظ سر تاپا اسے بارش کی سی بوندوں میں بھگو رہے تھے' اس نے جتانے والی نظروں سے جوریہ کو دیکھا جو اب بھی اپنے مخصوص معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی' چڑا دینے والی مسکراہٹ۔
شاہی کا بہت ضروری فون آگیا تھا اس نے بمشکل اپنی بات ختم کی اور کھڑا ہو گیا۔
"لیڈیز! مجھے ارجنٹ جانا ہے۔ سو خدا حافظ' میں بس ذرا دادی جان سے مل لوں۔"
"خیریت؟" جوریہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا جو بڑی عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔
"ہاں ہاں خیریت ہے' بس فیکٹری کی ہی کچھ پرابلمز ہیں' میرا تو چھٹی کا دن بھی بس ان ہی کاموں میں گزرتا ہے۔" اس نے اپنا والٹ نکال کر چیک کیا' موبائل اور چابیاں اٹھائیں۔
"پھر بھی کچھ چائے' کافی وغیرہ' ایسی بھی کیا جلدی ہے' کیا خدانخواستہ فیکٹری میں آگ واگ لگ گئی۔" باآواز بلند چائے کافی کی آفر کرتے ہوئے آخری بات جوریہ نے دل ہی میں سوچی تھی۔
وہ معذرت کرتا ہوا چلا گیا' جوریہ کا چہرہ مرجھا گیا۔
ایک ماہ میں فقط چند گھنٹوں کے لیے ملاقات؟ اس نے حریم کی طرف دیکھا جو نارمل تھی' اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی' اکثر ایسا ہوتا تھا وہ رات میں آتا اور صبح ناشتہ کر کے چل دیتا' کبھی دوپہر میں چلا جاتا کوئی

خوش نصیب چھٹی کا دن ہوتا کہ وہ ڈنر کرکے یہاں رک جاتا۔ ورنہ تو اس کا بزنس ہی اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اس کے لیے اپنی نیند اپنے آرام کی قربانی دینا اس کے لیے معمولی بات تھی' سلیمان صاحب اکثر اسے ٹوکتے یا سمجھاتے مگر وہ الٹا انہیں سمجھا دیتا۔

"یہ ایسے ہی فرار ہو جاتے ہیں؟" جویریہ کے چہرے پہ اداسی اور مایوسی کے بادل اب تک براجمان تھے۔

"ہمیشہ نہیں مگر اکثر۔" حریم نے جواب دیا۔

"اچھا جناب اب جب آپ آئیں تو میں سمسٹر کی تیاریوں میں مصروف ملوں گی' آپ کو بھی احساس ہونا چاہیے کہ انتظار کرنے اور کروانے میں کیا فرق ہے۔" جویریہ نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔

"تم کیوں اداس ہو رہی ہو؟" حریم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا میں اداس لگ رہی ہوں۔" جویریہ نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"ہاں۔" حریم نے اثبات میں سرہلایا۔

"میں تمہارے لیے اداس ہو رہی ہوں۔"

"میرے لیے کیوں؟" حریم حیران ہوئی۔

"کہیں شادی کے بعد ایسا نہ کہ موصوف آئے دن کی فون کالز پر رسیاں تڑائے بیل کی طرح بھاگتے نظر آئیں ہم تو بس انتظار ہی کرتی رہو گی۔"

"کیا شے ہے یہ لڑکی؟" خود تو شاہی بھائی کے ساتھ لگاوٹ سے باتیں کرتی ہے جیسے ان پہ مری جا رہی ہو اور ادھر مجھے ان کے نام سے چھیڑتی ہے' حریم نے حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا تو مزاج اور عادت ہی یہی ہے' بے تکلفی ہنسی مذاق' میں بلاوجہ میں ہی بدگمان ہو جاتی ہوں' حریم نے خود کو تسلی دی' وہ بہت جلد خوش گمان بھی ہو جاتی تھی۔

"کیا ہوا؟" یوں حیران حیران کیوں دیکھ رہی ہو؟

"کچھ نہیں۔" حریم جھینپ گئی۔

نانی کا کمبل ٹھیک کرکے حریم نے انہیں غور سے دیکھا' سانسوں کے زیروبم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو چکی ہیں۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور سرد ہوائیں کوئٹہ سے سفر کرتی ہوئی کراچی میں داخل ہو چکی تھیں' اہلیان کراچی کے لیے بس اتنی ٹھنڈ بھی بہت تھی کہ وہ بھرپور طریقے سے اپنا مختصر دورانیے کا "موسم سرما" منا سکیں۔ لہٰذا ان سرد ہواؤں کی آمد کے ساتھ ہی بازاروں میں مونگ پھلی' گزک' خشک میووں کی جیسے لہر آگئی تھی ساتھ ساتھ فرائی فش اور سوپ سمیت انواع واقسام کے فوڈ سینٹرز بھی مزید رونق اور پرہجوم ہو گئے تھے۔ حریم کے لیے تو موسموں کا آنا جانا ایک معمول کی اور معمولی سی بات تھی مگر جویریہ تو یوں ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی جیسے کراچی میں ٹھنڈ کی لہر نہ آئی ہو بلکہ اچانک' غیر متوقع برف باری ہو گئی ہو۔ زبردستی وہ حریم کو تقریباً "گھسیٹ کر بازار لے گئی تھی۔

"فرائی فش کھاؤ گی؟" وہ حریم سے ایسے پوچھ رہی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔

"یہاں؟" حریم نے آنکھیں پھیلا کر پہلے اسے پھر اپنے اردگرد دیکھا' پوری قوم جیسے کھانے پینے باہر نکلی ہوئی تھی۔

"پیک کروالو گھر پہ کھالیں گے۔"

"چلو ایسا کرتے ہیں' فنگر فش لے لیتے ہیں' کھانے میں آسانی رہے گی۔" جویریہ شیشے کا دروازہ کھول کر "ریڈزون" نامی اس نئے کھلے ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی' ناچار حریم کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

"جلدی جلدی کھاؤ اور گھر چلو۔ سلیمان ماموں اور نانی انتظار کر رہے ہوں گے۔" حریم کو فکر کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی ہو رہی تھی مگر جویریہ بڑے مطمئن اور مگن انداز میں فنگر فش سے یوں لطف اندوز ہو رہی تھی جیسے خصوصی من وسلویٰ اس کے لیے آسمان سے اترا ہو۔

"چلتے ہیں یار' دادی سو رہی ہیں اور بڑے ابو نے خود دو گھنٹے کی پرمیشن دی ہے۔ تم یہ فش انجوائے کرو'

اچھا ٹیسٹ ہے اس چٹنی کے ساتھ۔" اس نے چٹنی میں فنگر فش ڈبوئی اور غڑاپ سے منہ میں' حریم نے کھائی کسے بھی یہ ذائقہ اچھا لگا۔
"ہے تو اچھی۔" اس نے اعتراف کیا۔
"ہے نا۔" جویریہ نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "سوپ پیئیں۔"
"مجھے نہیں پسند بازار کا سوپ' سوپ تو بس گھر کا بنا اچھا ہوتا ہے۔" حریم نے صاف انکار کیا۔
پسند تو خیر مجھے بھی نہیں ہے۔ بقول ہمارے یوسفی صاحب' مرغی کا غسل میت" جویریہ ہنس پڑی۔
"یوسفی صاحب کون؟ تمہارے ٹیچر ہیں؟"
"اف بدذوق لڑکی بس یہیں خاموش ہو جاؤ ورنہ میرا موڈ خراب ہو جائے گا۔"
"ایسا کیا پوچھ لیا میں نے؟" حریم حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ حیرانی اگلے کئی روز تک قائم رہی' جب وہ جویریہ کو تیاریاں کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔
شاہی کی برتھ ڈے+نیو ایئر۔
"تمہاری کچھ پاکٹ منی جمع ہے۔" جویریہ نے اس سے پوچھا۔
"ہاں ہے۔" حریم نے اثبات میں سر ہلایا۔
"گڈ' کتنی؟"
"امی کو پتا ہوگا' ان ہی کے پاس جمع کرا دیتی ہوں ہر مہینے۔"
"اف۔" جویریہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔
"کیا بنے گا تمہارا۔"
"انہوں نے میرے پیسوں کی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے۔" حریم نے وضاحت کی۔
"تو کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس' خالی جیب' خالی ہاتھ۔" جویریہ نے مایوسی کے عالم میں کہا۔
"بالکل خالی ہاتھ بھی نہیں ہوں میں۔ نانی اماں نے کچھ دن پہلے سردیوں کے کپڑے لانے کے لیے کچھ رقم دی تھی' وہ ابھی میرے پاس رکھی ہے۔" حریم کو بھی رہ رہ کے یاد آتا تھا' جویریہ کی جان میں جان آئی۔
"کتنے ہیں؟"
"پانچ ہزار۔"
"کم ہیں۔ مگر خیر۔ نہ ہونے سے تو بہتر ہیں۔"
"پانچ ہزار کم ہیں کوئی گفٹ لانے کے لیے؟" حریم کی آنکھیں پھیلیں۔
"کوئی گفٹ نہیں' بے وقوف! کوئی اسپیشل گفٹ۔ کسی اسپیشل بندے کے لیے۔" جویریہ نے اس کی تصحیح کی۔
پھر وہ حریم کو اپنے ساتھ بازار لے گئی۔ درجنوں دکانوں پہ پھرنے کے بعد اسے ایک جوڑا پسند آیا شاہی کے لیے۔
"یہ ضرور شاہی کو پسند آئے گا' فنٹاسٹک سوٹ۔" جویریہ کی توصیفی نگاہیں اس ایش گرے رنگ کے گرم سوٹ کا جائزہ لے رہی تھیں' جب حریم نے اس کے کہنی مار کر دبی زبان میں کہا۔
"پرائز ٹیگ تو دیکھ لو آنکھیں کھول کر' آٹھ ہزار کا ہے۔"
"ڈونٹ وری۔ جتنی رقم تمہاری تھی' اتنی ہی میں بھی لائی تھی۔"
"مگر تم کیوں اپنے پیسے خرچ کر رہی ہو؟" حریم نے پریشان مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"بے وقوف۔ چیریٹی نہیں کر رہی۔ ادھار دے رہی ہوں' بعد میں واپس کر دینا۔" جویریہ وہ سوٹ نکلوا کر پیک کروانے لگی۔
گھر واپس آکر بھی حریم' جویریہ کے کان کھاتی رہی۔
"اتنا مہنگا سوٹ لینے کی کیا ضرورت تھی' کوئی نارمل سا لے لیتیں۔"
"محبت ایک غیر معمولی معاملہ ہوتا ہے' تحفہ بھی غیر معمولی ہونا چاہیے اور تم ایسے ری ایکٹ کیوں کر رہی ہو' کیا تم شاہی سے محبت نہیں کرتیں؟"
"تم شاہی بھائی کا نام کیوں لیتی ہو؟" حریم نے اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے الٹا اس سے سوال کیا۔
"وہ میرے کزن ہیں' بھائی نہیں' اس لیے میں شاہی بھائی نہیں بلکہ صرف شاہی کہتی ہوں۔" جویریہ

نے وضاحت کی۔
''بھائی تو میرے بھی نہیں ہیں' میں تو نام نہیں لیتی۔'' حریم نے جرح جاری رکھی۔
''تمہاری مرضی ہے' تم مت کہا کرو شاہ بھائی' فقط نام لے لیا کرو' کون روکتا ہے تمہیں۔'' جویریہ نے کندھے اچکائے۔
''بچپن سے یہی کہتی چلی آئی ہوں' اب نام لوں گی تو عجیب سا لگے گا۔''
''تم بے کار کی بحث میں کیوں الجھ رہی ہو' فالتو باتوں کو چھوڑو' کارڈ کے لیے کوئی اچھی سی وررڈنگ سوچو۔''
''کون سا کارڈ۔'' حریم چونکی۔
''برتھ ڈے کارڈ اور کیا شادی کارڈ؟'' جویریہ نے اسے گھورا۔
''سب کچھ تو تم ہی کر رہی ہو' یہ بھی تم ہی سوچ کر بتا دو۔''
''طنز کر رہی ہو۔'' جویریہ ہلکا سا مسکرائی۔
''نہیں... میں طنز نہیں کر رہی' میں بس ویسے ہی کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں تمہیں میری باتیں طنز کیوں لگتی ہیں۔'' حریم بے چارگی سے بولی۔
''اوہو... سوری بھئی' ایموشنل مت بنو اب۔'' جویریہ نے جلدی سے معذرت کی۔ ''چلو ایسا کرتے ہیں' دونوں مل کر سوچتے ہیں' ٹھیک ہے۔'' جویریہ نے فوراً ہی تجویز پیش کی۔
حریم کچھ کہے بنا فقط مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

ان کے گورے چٹے چہرے پر بڑی سنجیدگی طاری تھی۔ بات کرنے کے لیے انہوں نے خاص طور پر ایسے موقع کا انتخاب کیا تھا جب احتشام گھر پر ہو۔
''اب بتائیں اماں' میں کیا کروں' اپنے داماد کا تو آپ کو معلوم ہی ہے' حریم میٹرک میں ہی تھی' جب سے اس کی شادی کی فکر لگی ہوئی ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی رشتہ لے آتے ہیں' میری بچی بھی ماشاء اللہ شکل کی موہنی ہے' لوگ تصویر دیکھ کر ہی پسند کر جاتے ہیں۔''

انہوں نے جتاتی ہوئی نظروں سے جملہ حاضرین کو دیکھا۔
''اتنی جلدی کیا ہے' ابھی تو اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔'' نانی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ خواہش تو ان کی بھی یہی تھی کہ حریم مستقل اس گھر میں آجائے۔ اتنی خدمت گزار بچی تھی' کتنا آرام تھا انہیں حریم کے اس گھر میں ہونے سے' مگر پوتے کے مزاج کی وجہ سے خاموش تھیں۔ اس نے ایک بار انہیں بتا دیا تھا کہ شادی کا فیصلہ وہ اپنی مرضی سے کرے گا۔ سلیمان صاحب بھی غیر جانب دار تھے۔ اس معاملے میں۔
''کیا کرنا ہے اتنا پڑھ لکھ کر' گھر اور گھر کے کام ہی سنبھالنے ہیں' کبھی کبھی تو مجھے خود بھی فکر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد تین اور ہیں' حریم کی کہیں بات لگے تو ان کے بارے میں بھی سوچوں۔'' انہوں نے کن انکھیوں سے احتشام کو دیکھا' جو بظاہر لاتعلقی سے اپنے موبائل میں لگا ہوا تھا۔
''دیکھ لو۔ کوئی رشتہ اگر جی کو لگے تو دیکھ بھال لو' گھر تو بسانا ہے اس کا اب' ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتی نا میری خدمت گزاری کے لیے۔'' نانی نے دھیمے سے لہجے میں مشورہ دیا۔
''غیروں میں دیتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے' خدا جانے کیسے لوگ ملیں' دوسرے لوگوں کے قصے کہانیاں سن کر اور ہول ہو جاتی ہے۔'' بیٹی نے آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے خدشات ظاہر کیے۔
''اللہ مالک ہے۔ بچی کے اچھے نصیب کی دعا کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔'' سلیمان صاحب نے تسلی دی۔
احتشام ہنوز بے نیازی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اچانک سیدھا ہو بیٹھا' موبائل آف کر کے جیب میں رکھا۔
''پھپھو... آپ کی ساس کیسی ہیں؟''
''ٹھیک ہی ہوں گی' ایدھی ہوم چلی گئی تھیں۔ ناراض ہو کر' بیٹی منا کر لائی ہے' اس کے پاس ہیں۔'' ان کا رنگ لہجہ بے زار سا ہوا۔

"دیکھو میاں... بات صاف کرتی ہوں' لوگوں کو بری لگتی ہے' ہمارے سسر اللہ بخشے پلاٹ چھوڑ کر مرے تھے' وہ تھا ہماری ساس کے نام۔ اللہ کی نیک بندی نے اپنی بیٹی کے نام کردیا' باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں تو سب اولادوں کا حصہ ہوتا ہے نا' ایک کے نام سب کچھ کردو' یہ دوسروں کی حق تلفی نہیں ہے' میرا دیور تو کینیڈا چلا گیا' وہ تو ان قضیوں میں الجھنے کا ہے نہیں' شوہر صاحب' ماں کے آگے منہ کھولتے نہیں' میں تو خوب لڑی' دونوں ماں بیٹی سے' خدمت کے لیے ہم ہیں' جائیداد بیٹی کے نام ہو رہی ہے۔ بڑی بی ناراض ہو کر چلی گئیں' جس کے نام پلاٹ گیا ہے' وہی اپنے گھر لے گئی۔" ایک سوال کے جواب میں پھپھو نے پوری رام کہانی سنادی۔

"ہوں... تصویر کا دوسرا رخ..." احتشام ہولے سے مسکرایا۔

"زبان کی تیز ہوں بیٹا' دلوں کی اچھائی برائی تو اللہ جانتا ہے' اتنے سالوں سے بڑی بی کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب اخیر عمر ہے' خدمت تو چند سال اور کرلیتے' کیا فرق پڑتا ہے مگر یہ جو ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے نا انہوں نے' اس سے میرا دل بڑا خراب ہوا ہے۔" اپنے دل کی بھڑاس نکال کر وہ خاموش ہوگئیں۔



اتنی مشکلوں سے اس نے ہمت مجتمع کی تھی۔ احتشام کو سالگرہ کی مبارک باد کے ساتھ تحفہ دینے کی' حالانکہ وہ اکیلی تو نہیں تھی' جویریہ بھی احتشام کے لیے گفٹ اور کارڈ لائی تھی۔ اس نے تو بڑے آرام سے وش کرکے کارڈ اور گفٹ دے دیا تھا۔ ایک حریم ہی تھی جو نروس ہو رہی تھی۔ بہرحال جیسے تیسے یہ معرکہ بھی اس نے سر کر ہی لیا۔ جلدی سے وش کرکے تحفہ اس کے حوالے کیا اور دھڑکن سنبھالتی ایک طرف بیٹھ گئی۔

"ارے بھئی... یہ تم لوگوں نے کیا تکلف کرلیا..." احتشام مسکرا دیا تھا' بڑی جان دار مسکراہٹ دادی جان کے چہرے پر تھی' سلیمان صاحب' ہمیشہ کے لاپروا اور بے نیازی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ دادی نے کیک کٹنے کے بعد پوتے کو ایک ہزار کا نوٹ دیا۔ "میری طرف سے کچھ خرید لینا۔" ان کے بوڑھے چہرے پر محبت اور خوشی کی چمک تھی۔ سلیمان صاحب نے بھتیجے کو فقط ایک مسکراہٹ سے نوازا۔ "پہلے بتادیتے میں بھی گفٹ لے آتا۔"

"اوہو! بڑے ابو اور دادی جان' آپ کی دعائیں کافی ہیں میرے لیے قیمتی اور بے لوث دعاؤں سے بڑھ کر بھلا کیا تحفہ ہوسکتا ہے۔" احتشام دادی کے برابر میں بیٹھ گیا اور ان کے شانے کے گرد اپنا بازو دراز کیا۔

"دعائیں تو ہر وقت کرتی ہوں' تمہارے لیے بھی' اپنے سارے بچوں کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔"

"اپنے لیے نہیں کرتیں دعائیں؟" جویریہ آہستہ سے ان کے دوسری طرف آبیٹھی۔

"کیوں نہیں بچی' دعا کا آغاز تو اپنی ذات سے ہی کرنا چاہیے۔ پہلے اپنے لیے مانگو۔ پھر والدین کے لیے اور سب کے لیے۔" دادی مسکرادیں۔

"یہ لیں نانی کیک کھائیں۔" حریم نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا چاکلیٹ کیک کا نکال کر نانی کو دیا۔ اسے جویریہ کو یوں نانی کے پہلو میں جاکر براجمان ہونا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ باری باری اس نے احتشام' ماموں اور جویریہ کو بھی کیک دیا اور آخر میں اپنے لیے لیا۔

پرتکلف کھانے کے بعد احتشام نے مزے دار سی کافی کی فرمائش جویریہ سے کی تھی' وہ کافی بنانے کچن میں چلی گئی' حریم بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

"کیا گفٹ لائی ہو میرے لیے۔" وہ حریم کی جانب متوجہ ہو کر مسکرایا۔

"سوٹ ہے۔" حیرت انگیز طور پر بغیر گھبرائے' بغیر گڑبڑائے اس نے اعتماد کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہوں... کیسا ہے؟"

"بس آپ ہی جیسا ہے' اچھا..." حریم نے مزید جرأت کا مظاہرہ کیا۔

''ارے... تمہیں تو بولنا آگیا... جویریہ کی صحبت کا اثر ہے شاید...'' شاہی ہنسا تھا۔ اتنے میں جویریہ کافی لے آئی تھی' آخری فقرہ اس کے کانوں میں پڑا تھا۔

''میری صحبت کا کس پر کیا اثر آیا ہے؟'' اس نے ٹرے شاہی کی طرف بڑھائی۔

''بھئی تمہاری صحبت نے لوگوں کو بولنا سکھا دیا ہے۔''

''اچھا... تو لوگ گونگے کب تھے۔'' جویریہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

ہیں کواکب کچھ' نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

حریم نے کلس کر اسے دیکھا۔ یہ میری دوست ہے یا دشمن؟

''نہیں بھئی... حریم کی پرسنالٹی تو بڑی سیدھی سادی سی ہے' جیسی ہے ویسی ہی نظر آتی ہے۔'' شاہی نے نفی میں سر ہلا کر حریم کی سائڈ لی۔

''آپ خود سیدھے ہیں' شاید اسی لیے ہر کوئی آپ کو سیدھا نظر آتا ہے۔'' جویریہ نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا۔

''نہیں جویریہ بی بی' میں سیدھا نہیں ہوں اور نہ ہی میں ہر ایک کو سیدھا سمجھتا ہوں۔'' احتشام سنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا بھئی... ایک بار پھر بہت بہت شکریہ' جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا اب اجازت؟''

''کیا آپ کو میری بات بری لگی ہے۔'' جویریہ نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

''دنہوں... اپنی سالگرہ والے دن نہ میں ناراض ہوتا ہوں کسی سے' نہ برا مانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

''کیا چیز ہو تم؟'' حریم اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جاننے کی کوشش کرو' ویسے عورت کے بارے میں اس سوال کا جواب بڑے سے بڑا فلسفی بھی نہیں دے سکا ہے۔''

''اچھا... تو تمہارا شمار ان مشکل اور عجیب و غریب خواتین میں ہوتا ہے۔'' اس بار حریم نے سچ مچ طنز کیا تھا اور کمال کا کیا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہے تھے شاہی' واقعی بولنا آگیا ہے۔''

''میں گونگی نہیں ہوں اور نہ ہی اندھی۔''

''واقعی؟ ویسے اندھے دو قسم کے ہوتے ہیں' آنکھوں کے اندھے' عقل کے اندھے۔'' جویریہ کا انداز چڑانے والا تھا' حریم تپ گئی۔

''نہ میں آنکھوں کی اندھی ہوں' نہ عقل کی۔'' اس نے شعلہ بار نگاہوں سے جویریہ کو دیکھا۔ ''تم میرے ساتھ گیم کھیلنا بند کرو۔''

''کون سا گیم۔'' جویریہ نے بڑی معصومیت سے سوال کیا تھا۔ پھر حریم کی شکل دیکھ کر ہنس پڑی۔

''تم شاہی بھائی کو پسند کرتی ہو؟'' حریم نے آج اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''کوئی بھی لڑکی کر سکتی ہے' اتنی خوبیاں تو ہیں ان میں۔'' جویریہ نے کندھے اچکائے۔

''میں کوئی بھی یا کسی بھی لڑکی کی بات نہیں کر رہی' تمہاری بات کر رہی ہوں' تم بتاؤ' تم ان کو پسند کرتی ہو یا نہیں۔''

''ہاں... کرتی ہوں۔''

''شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کیں۔

''پھر میرے ساتھ اس ڈرامے بازی کا مقصد۔'' حریم نے دانت کچکچائے۔

''کون سی ڈرامے بازی؟''

''تم... ہم دونوں کو قریب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟''

''میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' جویریہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم بہت بڑی ڈرامے باز ہو' میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔'' حریم نے طیش میں آکر منہ موڑ لیا۔

''ارے ہاں... ڈرامے سے یاد آیا تم جو اتنی غور سے اور اتنے شوق سے ڈرامے اور فلمیں دیکھتی ہو تم

نے کبھی ان میں لوٹرائی اینگل ٹائپ کہانیوں پر غور کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب ایسے ڈرامے اور فلمیں جن میں ایک ہیرو اور دو ہیروئنز یا دو ہیروز اور ایک ہیروئن۔"

"ہاں..." حریم نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جواب دینے پر مجبور ہوگئی۔

"ویسی کہانی ہوتی ہے نا یہ تین میں سے دو افراد کے دل کی مراد پوری ہوتی ہے انہیں منزل ملتی ہے اور ایک بے چارہ اکیلا رہ جاتا ہے تنہا اور نامراد۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے ان سے باتوں سے۔" حریم کے صبر و برداشت کی حد ختم ہونے لگی۔

"مطلب یہ کہ میں اور تم لوٹرائی اینگل کا حصہ بن گئے ہیں دیکھیں کون شاد باد ہوتا ہے اور کون بے آباد برباد ہوتا ہے؟"

"تم کیا سمجھتی ہو چالاکی اور مکاری پن کے ہتھکنڈوں سے تم اپنے دل کی مراد حاصل کرلوگی۔" حریم نے پہلی بار کسی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

"بہترین حکمت عملی اور اچھی تدبیر سے انسان اپنے دل کی مراد حاصل کرسکتا ہے۔"

"یہ حکمت عملی اور تدبیر نہیں چلتر پن ہے امی ٹھیک کہتی تھیں تمہارے بارے میں ان کی رائے بالکل درست نکلی میں ہی بے وقوف تھی جو تمہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھی۔" غصے اور بے بسی کے مارے حریم کی آواز بھرا گئی۔ پلکیں جھپک جھپک کر وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"بے کار میں ایموشنل ڈراما کررہی ہو یار! میں سچ میں تمہاری دوست ہی ہوں۔ پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ تم مجھ پر شک نہ کرو۔ باقی رہا لوٹرائی اینگل والا معاملہ تو یہ ایک کھیل ہے تم اپنی جگہ اچھا کھیلنے کی کوشش کرو میں اپنا گیم اچھا کھیلنے کی کوشش کررہی ہوں دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔" جویریہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"پتا نہیں تمہیں یونی ورسٹی میں ایڈمیشن کس نے دے دیا مجھے تو پاگل لگ رہی ہو پوری۔" حریم چڑ کر بولتی ہوئی کمرے سے باہر ہی نکل گئی۔

"تھوڑا بہت پاگل تو ہر انسان ہوتا ہے ڈیئر۔" پیچھے سے جویریہ کی بلند آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی مگر وہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔

اگلے دن سے اس نے جویریہ سے بات کرنا بالکل ہی چھوڑدی تھی اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کررہی تھی۔ دو دن تک جویریہ نے بھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی مگر تیسرے دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"یہ تو اسپورٹس مین اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے بھئی۔" اس نے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی حریم کو اپنے مخصوص بے تکلف اور دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"میں ٹی وی دیکھ رہی ہوں مجھے ڈسٹرب مت کرو۔" حریم نے اس کی جانب دیکھے بغیر رکھائی سے کہا۔

"تمہاری معصوم صورت دیکھ کر کبھی تو سنجیدگی سے سوچتی ہوں کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں اور تمہیں چانس دے دوں مگر کیا کروں اس بندے نے مجھے کچھ زیادہ ہی امپریس کردیا ہے۔" جویریہ بولتی ہوئی اس کے قریب ہی ٹک گئی۔

"بندے نے یا بندے کے اسٹیٹس نے...؟" حریم نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز کچھ اور بڑھائی۔

"کچھ بھی سمجھ لو۔" جویریہ ڈھٹائی سے مسکرائی اور مزید بولنے لگی۔

"ویسے اگر ہمارے پیارے کزن شامی صاحب کوئی غریب غربا ہوتے تو شاید تمہاری امی حضور بھی تمہاری یہاں شادی کروانے کے لیے اتنے پاپڑ نہ بیلتیں نہ ہی تم اتنی خوشی خوشی اپنی نانی اور ماموں کی خدمت کے لیے یہاں آن موجود ہوتیں۔" حریم کے اوپر جیسے کسی نے جلتے ہوئے انگارے برسا دیئے اس کا پورا وجود سلگ اٹھا۔

"تم کون سی پارسا ہو تم بھی تو اپنے مطلب سے یہاں آئی ہو اپنے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش

کرنے۔" اپنے بارے میں کیے گئے اس کے دعوے کی تردید کے بجائے حریم نے اس پر جوابی وار کیا۔

"میں منافق نہیں ہوں' تمہاری طرح' جیسی ہوں ایسا ہی خود کو بتاتی ہوں۔" جویریہ کا لب و لہجہ اور الفاظ طیش دلانے والے تھے مگر حریم نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنی آنکھوں اور لہجے میں طنز بھرا اور اس سے مخاطب ہوئی۔

"تم بہت بہادر' سچی اور صاف گو ہو۔ جاؤ اور اپنی صاف گوئی کا مظاہرہ شاہی بھائی کے سامنے کرو' انہیں بتاؤ کہ تم ان پر مرمٹی ہو' ان کے اسٹیٹس پر بھی اور وہ سب کچھ بتاؤ جو تم نے اپنے ذہن میں پلان کیا ہے۔"

"وقت آنے پر یہ بھی ہو جائے گا' اتنی جلدی کیا ہے۔" جویریہ لاجواب ہو کر یہی جواب دے سکی' یہ تو دن بدن ہری مرچ سے لال مرچ ہوتی جارہی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئندہ مجھے مخاطب کرنے کی اور مجھ سے بات کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔" ٹی وی اسکرین پر بدستور نظریں جمائے حریم نے کٹ دار لہجے میں کہا تھا۔ جویریہ جو جانے کے لیے پر تول رہی تھی' اس کے اس انداز پر سن رہ گئی' کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑی خود کو سنبھالتی رہی' پھر پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"ڈیئر اتنی نفرت مت کرو مجھ سے' آخر تمہاری کزن ہوں۔"

"کزن نہیں دشمن۔" حریم نے تصحیح کی۔

جویریہ چند لمحے اس کے سخت تاثرات دیکھتی رہی' پھر بغیر کوئی جواب دیے مڑ کر چلی گئی۔

"ہونہہ! خود کو بڑی افلاطون سمجھتی ہے' جیسے دوسرے لوگ تو بنے بنائے احمق ہیں' اندھے گونگے اور بہرے' جدھر چاہے ہنکا دو۔" حریم کے دل میں غم و غصے کا لاوا ابل رہا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز کچھ اور بلند کر دی۔



تیسری بار بالوں میں پف صحیح بنا تھا۔ اس نے گردن گھما گھما کر ہر زاویے سے اپنے چہرے کا معائنہ کیا۔ ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی تھی۔ بقایا سارے بال سمیٹ کر پونی میں باندھے' لپ گلوز لگا کر اس نے اپنا سیل فون بیگ میں رکھا اور دوپٹا اوڑھ کر بیگ کاندھے پر لٹکا لیا۔ کمرے سے باہر آئی تو حریم' سلیمان ماموں کو چائے دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر منہ پھیر کر چلی گئی۔

"ہاں بھئی.... چل دیں اپنی ڈیوٹی پر۔" انہوں نے شگفتہ لہجے میں جویریہ کو مخاطب کیا۔

"جی بڑے ابو...." اس نے ان پر عجلت بھری نظر ڈالی اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"چائے پینی چھوڑ دی کیا' پہلے تو چائے پی کر جاتی تھیں۔" انہوں نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا مگر جانے کیوں جویریہ چور سی بن گئی۔ اس کے بڑھتے قدم ایک لحظے کو رکے۔

"ٹائم ہی نہیں ہوتا اب' دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔ ٹائمنگ چینج ہو گئی ہیں کلاسز کی' اچھا میں چلتی ہوں' خدا حافظ۔" مختصر سی وضاحت کر کے وہ چل دی۔

"شاہی نہیں آیا ابھی تک۔" انہوں نے چائے کی چسکی لے کر خود کلامی کی تھی' جویریہ جا چکی تھی' حریم کچن میں چلی گئی تھی۔ نہ جانے یہ سوال انہوں نے کس سے کیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہاں سے اٹھے اور ماں کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔

"ماں جی.... اور چائے منگواؤں؟"

"نہیں.... میں تمہاری طرح شوقین نہیں ہوں اتنی' بس سردیوں میں دو چار گھونٹ کافی ہیں۔" وہ مسکرائیں تو بوڑھے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔

انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے شاہی کی آواز آئی' وہ ان ہی کے بارے میں حریم سے پوچھ رہا تھا۔

"ہم یہاں ہیں ماں جی کے پاس۔" انہوں نے آواز بلند کہا۔ شاہی وہیں آگیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" دونوں کی طرف سے جواب آیا تھا۔

"ہاں بھئی' کیا چل رہا ہے۔" شامی' دادی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

"فی الحال تو چائے کا دور اور وہ بھی اختتام پذیر ہے' یہ لو" سلیمان صاحب نے آخری گھونٹ پی کر چائے کا مگ قریب رکھی تپائی پر رکھ دیا۔ "کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" شامی' دادی سے مخاطب ہوا۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

"مجھ بڈھے کو بھی پوچھ لیا کرو یار!"

"کون بڈھا؟" شامی نے معصومیت سے نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔

"کب ہوا یہ واقعہ؟"

"برسوں گزر گئے بیٹا' تم اپنی خیر مناؤ' کیا بالوں پہ برف گرنے کے انتظار میں ہو کب گھر بساؤ گے؟" انہوں نے ڈائریکٹ سوال کر ہی دیا جو وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اکثر کیا کرتے تھے۔

"بس جائے گا گھر بھی' جلدی کیا ہے۔" وہ مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا اور حریم سے چائے کا مگ لینے لگا' جو وہ اس کے لیے لائی تھی۔ چائے دے کر وہ سست روی سے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

"جلدی ہے یار... کیا بڑھاپے میں شادی کرو گے' بس یہی عمر ہے شادی کی' اب کوئی لڑکی یا تو تم فائنل کرلو یا پھر میں کہیں دیکھوں۔" دیکھنا... دیکھنا تو کیا تھا وہ بس یوں ہی خالی خولی دھمکی دے رہے تھے۔ شامی کو ہنسی آگئی۔

"بہت جلد فائنل کرلوں گا' بے فکر ہوجائیں۔" کمرے سے باہر نکلتے ہوئے حریم نے شامی کی آواز سنی' اس کا دل دھڑک اٹھا۔

جویریہ اکیڈمی سے لوٹی تو شامی لاؤنج میں اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ سلیمان صاحب کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جاچکے تھے۔ وہ جلد سونے کے عادی تھے۔ رات میں جلدی سوتے' صبح جلدی اٹھ جاتے تھے۔ کھڑے کھڑے سلام دعا اور خیر خیرت پوچھنے کے بعد جویریہ کمرے میں چلی گئی۔ شامی بدستور اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرتا رہا۔ جویریہ فریش ہو کر' کپڑے تبدیل کرکے واپس آئی تو شامی نے لیپ ٹاپ سے اپنا سر اٹھایا' ایک نظر اس پر ڈالی اور مسکرایا۔

"تمہارا گفٹ بہت اچھا تھا' پسند آیا' بائی دا وے تمہیں کیسے پتا چلا میرے فیورٹ پرفیوم کے بارے میں؟؟"

"آپ اکثر یہی پرفیوم استعمال کرتے ہیں' مجھے لگا یہ آپ کو پسند آئے گا اس لیے یہی گفٹ کردیا۔" لاپروائی سے بولتی ہوئی وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

حریم آئی تو جویریہ کو وہاں بیٹھے دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ وہ کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی۔ شامی نے لیپ ٹاپ بند کرکے ریموٹ اٹھایا' بزنس نیوز دیکھنے لگا۔ جویریہ جو اس سے بات کرنے کے لیے پر تول رہی تھی' خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ حریم دوبارہ آئی' شامی خبروں میں مگن' جویریہ خاموش بیٹھی تھی۔

"شامی بھائی کھانا لگادوں۔" اس نے جویریہ کو قطعی طور پر نظر انداز کرکے شامی کو مخاطب کیا۔

"کھانا..." شامی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نہیں... تم دونوں کھالو' میں ایک دوست کے ساتھ باہر ڈنر کروں گا۔" اس نے سہولت سے بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور اپنا رخ دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف کرلیا۔

حریم کا چہرہ اتر گیا۔ اتنی محنت اور وقت لگا کر اس نے شامی کی پسند کی چیزیں بنائی تھیں۔ وہ "اچھا" کہہ کر واپس چلی گئی۔ جویریہ بھی اس کا پروگرام سن کر بدمزہ ہورہی تھی۔

"کوئی خاص دوست ہے کیا؟" ٹی وی پر اشتہارات آرہے تھے' موقع غنیمت جان کر جویریہ نے ذہن میں کلبلاتا سوال پوچھ ہی لیا۔

"جو دوست ہوتا ہے وہ خاص ہی ہوتا ہے۔" شامی نے مسکرا کر ذو معنی جواب دیا۔ ٹی وی آف کرکے ریموٹ میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جارہا تھا اور جویریہ اس کی چوڑی پشت کو گھورتی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔

حریم بے دلی سے کمرے میں جاکر لیٹ گئی تھی۔

اس کے دماغ میں ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ''میں بلاوجہ کے انتظار میں بٹھا کر نہیں رکھوں گی تمہیں' بھتیجا ہے تو کیا ہوا' دنیا کا آخری لڑکا تھوڑی ہے' اسے اگر پھوپھی سے کوئی ہمدردی اور دلچسپی نہیں ہے تو ہماری طرف سے بھی سو سلام۔ تمہارے باوا نے الگ تنگ کرکے رکھا ہوا ہے کہ جلد از جلد کوئی رشتہ فائنل کرلو۔'' امی جان غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔

وہ تنگ مزاج تھیں' اس دن حریم کی شادی اور رشتے سے متعلق بات چیت پر بھتیجے کا جو ردعمل تھا وہ خاصا مایوس کن تھا۔ پھر اپنی ساس کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر انہیں شدید غصہ آیا تھا۔ بے شک وہ اپنی بیٹی یہاں دینے کی خواہش مند تھیں مگر جب ان کا غم وغصہ آگے آتا تو باقی ہر شے پیچھے چلی جاتی' اس وقت ان پر غم وغصے کا غلبہ تھا۔ کسی اور پر بس نہ چلا تو بیٹی کے آگے دل کی بھڑاس نکال لی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس نخرے باز کے آگے پیچھے پھرنے کی اور جی حضوری کرنے کی۔'' انہوں نے یوٹرن کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حریم کو تنبیہہ کی تھی۔

ادھر جویریہ کمپیوٹر پر مصروف تھی' اپنا اسائنمنٹ بناتے بناتے تھک گئی تو تھوڑی دیر آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''تو احمقوں کی ملکہ صاحبہ! آپ کیا سمجھتی ہیں؟ سادگی اور معصومیت سے اتنے نمبر نہیں ملتے کہ اپنی زندگی کے رزلٹ میں کامیاب کا لفظ درج کرسکو۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں حریم کو تصور میں مخاطب کیا۔

''اور تم مسٹر پرنس مین!'' دوسری بار تصور میں اس کا مخاطب احتشام تھا۔ ''زندگی دو جمع دو چار کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ یہ دو جمع دو پانچ بھی ہوتی ہے اور کبھی اس کا جواب صفر بھی نکلتا ہے۔ مرد کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو' کبھی کبھی عورت کی ہوشیاری اور چالاکی کے آگے ڈھیر بھی ہوجاتا ہے۔ وہ بے وقوف لڑکی تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی۔'' اس نے بند آنکھیں کھول کر اپنا سر جھٹکا اور دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔



احتشام نے نمبر ملا کر موبائل کاندھے اور کانوں کے بیچ میں دبایا اور بالکونی میں نکل آیا۔

''جی پھوپھو! السلام علیکم! میں ہوں احتشام۔''

''ارے شرمندہ مت کریں' جانتی تو ہیں آپ میری مصروفیات۔'' اس نے کاندھے اور کان کے درمیان سے موبائل نکال کر ہاتھ میں تھاما۔

''ج۔جی ضروری بات ہی کرنی تھی آپ سے' اس لیے فون کیا ہے' مجھے حریم کے بارے میں بات کرنی تھی آپ سے۔''

دوسری طرف سے وہ پھوپھی کی بات سن کر ہولے سے مسکرایا۔

''تھوڑے' بہت خیر خواہ ہم بھی ہوسکتے ہیں' بس کہنا یہ ہے کہ آپ حریم کے رشتے کے بارے میں فکر نہ کریں۔ میں نے اس کے لیے ایک اچھا رشتہ دیکھ رکھا ہے۔

میں ساری ڈیٹیل بتاؤں گا آپ کو' بس چند روز ٹھہر جائیں' آپ کو فون کرکے پہلے سے اس لیے بتانا پڑا کہ آپ جلد بازی میں کسی الٹی سیدھی جگہ رشتہ نہ دیکھ لیں۔''

''اوہ۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' وہ جھنجلایا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں اگلے ہفتے بالکل فائنل بات کرتا ہوں آپ سے۔ ٹھیک ہے' خدا حافظ۔'' موبائل آف کرکے جیب میں رکھتے ہوئے احتشام کے چہرے پہ اطمینان تھا۔



اگلی صبح سلمان صاحب تو ناشتا کرکے حسب معمول کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے' پھر اپنے کمرے میں اپنی کتابوں میں مگن ہوگئے۔ احتشام ناشتا کرکے لیپ ٹاپ میں منہمک ہوگیا۔ حریم ملازمہ کے سر پر سوار کام کروا رہی تھی۔

جویریہ کمرے سے نکل کر بیٹھی تھی۔ ناشتا وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ ریموٹ لے کر ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ ملازمہ کام ختم کر کے چلی گئی۔ حریم کٹنگ بورڈ پہ کھٹاکھٹ سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ آج وہ چائنیز بنا رہی تھی۔

"حریم! تمہاری دادی کیسی ہیں؟" ٹی وی کی آواز ہلکی کر کے اس نے بہ آواز بلند حریم کو مخاطب کیا۔ اس کی آواز سامنے کمرے میں بیٹھے احتشام تک بہ آسانی جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں۔" حریم نے رکھائی سے جواب دیا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ توڑ دے۔

"ابھی اولڈ ہوم میں ہی ہیں؟" جویریہ نے دوسرا میزائل فائر کیا۔

"پھوپھو کے گھر ہیں۔" مختصر جواب دے کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"حیرت ہے اتنی خدمت گزار پوتی کے ہوتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کے گھر ہیں۔"

"ان کی مرضی' بائی دا وے' آپ نے اپنی دادی کی کتنی خدمت کی ہے جو میری دادی کی فکر ہو رہی ہے۔" حریم نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"کیا کروں' مجھے ڈپلومیسی نہیں آتی نا۔" جویریہ اس کی تلملاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اتنے میں احتشام کمرے سے باہر نکل آیا۔ "میں کام سے جا رہا ہوں' دیر ہو جائے گی' پلیز لنچ پہ ویٹ مت کرنا' آپ لوگ کھانا کھا لینا۔" وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ حریم کو مخاطب کر کے بولا۔

وہ پہلے ہی جویریہ کی باتوں کی وجہ سے طیش میں تھی اور بھی بھنا گئی۔ سبزیاں' چھری' کٹنگ بورڈ ایک طرف کر کے وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

"آپ باہر جا رہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ کوئی کام ہے؟" وہ جویریہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے مارکیٹ تک چھوڑ دیں گے؟"

"شیور۔۔۔ بائی دا وے کیا لینا ہے۔" وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"بکس لینی ہیں۔" وہ اپنا بیگ اور اسکارف لینے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

واپس آئی تو اس کے لبوں پہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے چڑا دینے والے تاثرات کے ساتھ حریم کی طرف دیکھا اور احتشام کے پیچھے پیچھے چل دی۔

"ہونہہ۔۔۔ چھچھوری۔۔۔" حریم نے پیچھے سے اسے گھورا۔



پھپھو اپنے شوہر نامدار کے ساتھ اسی شام حاضر ہوگئیں۔ نانی اور سلیمان بھائی سے علیک سلیک اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد انہوں نے اپنا روئے سخن احتشام کی طرف کیا۔

"تو تم کس رشتے کے بارے میں بتا رہے تھے مجھے۔"

احتشام بے ساختہ ہنس پڑا' اسے پھوپھو کو آج یہاں دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی فون کال کی وجہ سے آئی ہیں۔

"آپ سے میں نے کہا تو تھا اگلے ہفتے ساری ڈیٹیل بتا دوں گا۔"

"اگلا ہفتہ کس نے دیکھا ہے میاں' اگر کوئی رشتہ ہے تمہاری نظر میں تو ہمیں بتا دو' تھوڑی بہت چھان بین ہم بھی کر لیں گے۔" حریم کے رشتے اور شادی کے معاملے میں پھوپھو سے زیادہ پھوپھا کو جلدی تھی۔

"اچھا تو پھر سنیں۔" اس نے بولنا شروع کیا' اس کی باتیں ان دونوں سمیت نانی اور سلیمان صاحب بھی غور سے سن رہے تھے۔ اس نے اپنی بات مکمل کی تو سب کے چہروں پہ اطمینان کی کرنیں رقصاں تھیں۔

"ٹھیک ہے میاں! بات آگے بڑھتی ہے تو نیک کام میں بسم اللہ کریں گے۔" پھوپھا نے احتشام کے کاندھے پہ اپنائیت سے ہاتھ رکھا تھا۔



گرم شال اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر وہ سیڑھیوں

کے نچلے اسٹیپ پر بیٹھ گئی۔ اوپر سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے مگر برے نہیں لگ رہے تھے' اسے سردیاں اچھی لگتی تھیں۔ حالات نے یک دم ہی نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ اختشام نے اپنی جاننے والی ایک فیملی میں حریم کا رشتہ کروا دیا تھا۔ لڑکا انجینئر تھا۔ چار بہن بھائیوں اور والدین پر مشتمل اچھی سلجھی ہوئی فیملی تھی۔ وہ لوگ گھر آکر حریم کو پسند کر گئے تھے۔ اگلی بار آکر سب کا منہ میٹھا کر کے بات پکی کر دی تھی۔ شادی چھ ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔ حریم کو پہلے پہل تو یہ سب جان کر دھچکا لگا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے خود کو سمجھا لیا۔ اختشام سے لگاؤ تھا' انسیت بھی مگر جب وقار سے نسبت ٹھہری' اس کی تصویر دیکھی تو وہ اچھا لگنے لگا۔ شاہی نے اسے کہا تھا۔

"وقار بہت اچھا لڑکا ہے۔ گھر والے بھی اچھے ہیں۔ تم وہاں ضرور خوش رہوگی۔" حریم نے اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

"تائی جان کا کیا ہوگا' ان کا خیال کون رکھے گا؟" اس نے بس ایک سوال ضرور کیا تھا۔ اختشام نے اس کا حل بھی نکال لیا تھا۔ اس نے پھپھو سے کہا تھا کہ وہ یہاں شفٹ ہو جائیں۔ اپنا مکان کرائے پر دے کر انہیں یہاں آجانا تھا۔

معاملات خیر و خوبی کے ساتھ نپٹ رہے تھے۔ سلیمان صاحب نے ایک بار پھر اختشام کی شادی کا شوشا اٹھایا تھا۔

"بس تھوڑا سا انتظار اور۔ بہت جلد آپ کو یہ خوش خبری بھی مل جائے گی۔" اختشام نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا تھا۔

"منگنی مبارک ہو تمہیں' یقین کرو سچے دل سے مبارک باد دے رہی ہوں تمہیں' اب تو پلیز اپنی ناراضی ختم کر لو۔" جوریہ نے بہت کھنکتے لہجے میں یہ سب کہا تھا۔

"میں ناراض نہیں ہوں اب' مگر وہ پہلے جیسی دوستی اور تعلقات ہمارے درمیان ہونے مشکل ہیں۔" حریم کا چہرہ بے تاثر تھا مگر الفاظ اور لہجہ مضبوط تھے۔ جوریہ بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

"میں نے جو کچھ کیا یا کہا اس کا مقصد تمہیں ہرٹ نہیں کرنا تھا۔ میں تو اپنی بقا' اپنے فیوچر کے لیے یہ سب کر رہی تھی اور محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔" جوریہ نہ جانے کیوں اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ محبت اور جنگ میں صرف وہی جائز ہوتا ہے جو عام حالات میں بھی جائز ہو اور وہ سب ناجائز ہوتا ہے جو عام حالات میں ناجائز ہو اور تم پلیز' میرے سامنے کسی بھی قسم کی صفائی پیش نہ کرو۔ اس سے نہ تو سچائی بدلے گی اور نہ ہی میرا دل۔" حریم دوٹوک لہجے میں بولتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے حریم بی بی۔ تم اپنا غم و غصہ اسی طرح ہی نکال سکتی ہو مجھ پر۔" جوریہ اسے جاتا دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔



وہ بڑی پیاری اور ملنسار سی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت نمایاں تھی اور شخصیت سے اعتماد جھلکتا تھا۔ اس کے والد بزنس مین تھے۔ بلال رزاقی' ان کے چار بچوں میں سب سے چھوٹی تھی' ماہ نور رزاقی۔ ایم بی اے کر کے اپنے والد کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اختشام اسے دادی جان سے ملوانے لایا تھا اور خاص طور پر سلیمان صاحب سے جن کی سب سے بڑی فکر اختشام کی شادی تھی۔

دادی جان اور سلیمان صاحب' ماہ نور سے مل کر خوش تھے۔ حریم نارمل اور جوریہ بھونچکا تھی۔ ماہ نور کے جانے کے بعد وہ خاموشی سے کمرے میں بیٹھ گئی اور کتنی دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کا زعم' خود ساختہ خواب اور بلند و بانگ دعوے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ پھر اک دم ہی اس کے اندر غصے کی ایک ایسی لہر اٹھی کہ اس کے قدم خود بخود ہی باہر کی طرف بڑھے۔ لاؤنج کا

دروازہ کھول کر وہ باہر آئی تھی۔ اختشام بوگن ویلیا کی بیل کے پاس کھڑا موبائل آف کر رہا تھا۔ غالباً ”ابھی ابھی وہ کسی سے بات کرکے فارغ ہوا تھا۔

”ہاں جویریہ...“ اسے دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ ”کہیں جانا ہے؟“

”نہیں تو...“ وہ پژمردہ سی ستون سے ٹیک لگائے اسے دیکھنے لگی۔

”ماہ نور کیسی لگی تمہیں؟“ اختشام نے موبائل جیب میں ڈالا۔

”اچھی سیڑھی ہے‘ اپنے ایم (مقصد) تک جلدی پہنچ جائیں گے آپ۔“ جویریہ کے اندر بھانبھڑ جل رہا تھا۔ جلن اور تپش اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

”بہت سخت بات کہہ دی تم نے۔“ اختشام کے چہرے کے عضلات تن گئے۔

”سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔“

”اچھا... تو کیا ہے سچ؟“ وہ دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ کر سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”آپ تو بہت ”سیلف میڈ“ بنتے تھے‘ پھر سہارے کیسے تلاش کرلیے‘ اپنے بزنس کو آگے سے آگے بڑھانے کے لیے۔“ جویریہ نے طنز کے تیر برسانے شروع کیے۔

اختشام نے اس کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بہت تحمل کے ساتھ گویا ہوا۔

”میں آج بھی اپنے اس دعوے پہ قائم ہوں کہ میں ”سیلف میڈ“ ہوں۔ میں نے اپنے لیے اپنے بزنس کے لیے کوئی سہارا‘ کوئی سیڑھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی‘ نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے‘ ماہم ڈیڑھ سال پہلے میرے آفس میں جاب کرنے آئی تھی۔ فریش ایم بی اے مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے‘ نہ ہی اس نے کبھی بتایا‘ اس کی چند خوبیوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ غیر معمولی تو نہیں مگر ذہین ہے اور محنتی بھی بلا کی محنتی اس میں خودداری اور وقار ہے‘ میں نے ایک سال پہلے اسے پرپوز کیا تھا‘ اس نے مجھے جواب دیا کہ مزید سوچئے اور انتظار کیجیے‘ مجھے جواب دینے میں ٹائم لگے گا۔ ایک سال تک میری ثابت قدمی اور اصرار دیکھ کر اس نے حامی بھری اور اپنی فیملی سے ملوایا‘ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کہاں سے بی لونگ کرتی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ عام ورکر کی طرح سے کسی بھی جگہ جاب کرکے ایکسپرینس حاصل کرنا چاہتی تھی‘ اسی لیے اس نے اپنے والد کا بزنس جوائن نہیں کیا۔ میرے دل میں اس کی قدرو قیمت اور بھی بڑھ گئی۔ رہی میری بات تو مجھے کسی کی بیساکھیوں کی ضرورت نہ کل تھی‘ نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔“ اختشام نے اپنی بات ختم کی۔

اس کا ایک ایک لفظ جویریہ کے دل کو سخت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ وہ چند لمحے اختشام کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر جیسے یک دم پھٹ پڑی۔

”پچھلے ایک سال سے آپ اس لڑکی پہ دل و جان سے فدا ہیں اور مجھ سے الگ ڈائیلاگ جھاڑتے رہے۔ تم بہت اچھی ہو‘ بہت ذہین ہو‘ میرے ہاتھ کی کافی کے آپ دیوانے تھے۔ میری صلاحیت اور محنت پر آپ کو رشک آتا تھا‘ پھر میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے تھے آپ۔“ وہ پھنکاری۔ اس کی آواز اور آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

”اف...“ اختشام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”تم لڑکیاں کتنی عجیب ہوتی ہو۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں آج بھی تم سے کہتا ہوں کہ تم ذہین‘ باصلاحیت ہو‘ بہت محنتی ہو‘ اور سچ میں تمہاری ہاتھ کی کافی کا میں دیوانہ ہوں‘ مگر یہ تمہاری خوبیوں کا‘ صلاحیتوں کا اعتراف ہے‘ اس کا کیا مطلب لے لیا تم نے اور کیوں؟“ اختشام مجسم سوال بن گیا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا‘ پھر دھیرے سے کہنے لگا۔

”میں نے ماہم سے شکوہ کیا کہ تم نے ایک سال تک انتظار کروانے کے بعد جواب دیا ہے مجھے۔ میں نے تو یوں ہی مذاق میں شکوہ کیا تھا مگر اس کا جواب بڑا سنجیدہ تھا‘ وہ کہنے لگی۔

"اس لیے کہ تم لڑکے لوگ یہ نہ سمجھو کہ ہم لڑکیاں اپنا دل ہتھیلی پہ رکھے بیٹھی رہتی ہیں کہ کوئی ہمیں مسکرا کر دیکھے یا پرپوز کرے اور ہم فوراً" یہ دل اس کے حوالے کردیں۔ خودداری اور وقار بہت اہم اور قیمتی ہوتے ہیں احتشام۔" ماہم کے الفاظ دہرا کر وہ کچھ لمحے بعد بولا۔

"ماہم کی بات سن کر میں نے سوچا لڑکیوں میں واقعی اتنا وقار اور خودداری ہونی چاہیے کہ کسی کی ایک نظریا مسکراہٹ انہیں موم کی طرح نہ پگھلا دے۔ کسی کے تعریفی الفاظ یا سراہنے والی نظریں انہیں اپنے رستے سے بھٹکنے پہ مجبور نہ کریں۔ لڑکیاں اتنی موم کیوں ہوتی ہیں۔ جویریہ انہیں تو فولاد ہونا چاہیے۔" وہ نرم لہجے میں مگر تاسف کے ساتھ بول رہا تھا۔

"خواب دیکھنے کو ہر ایک کا من کرتا ہے اور یہ کوئی عیب نہیں مگر ہم زبردستی تو کسی سے اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل نہیں کرسکتے اور ایک بات اور.... وہ ایک لمحے کو رکا۔ "تم سچ مچ بہت ذہین ہو مگر اپنی ذہانت سے بے زار ہورہی تھیں۔" چونک پڑی۔

"مجھے حیرت ہوئی' جب حریم نے میری برتھ ڈے پہ اتنا مہنگا سوٹ گفٹ کیا' پھر وش کرنے کا انداز جتنا میں اسے جانتا ہوں اس کے طور طریقے بہت الگ اور مختلف لگ رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے گھبرا کر سب کچھ اگل دیا۔ تم نے جس طرح اسے شاپنگ کروائی' جو کچھ اسے سمجھایا اور کہا' سب اس نے بتادیا۔"

"اف.... سچ مچ کی احمق!" خجالت اور شرمندگی کے مارے جویریہ کا برا حال تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میری کس بات یا کس انداز نے تمہیں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا کردیا۔ آئی وش کہ ایسا نہ ہوتا' مجھے خود اپنے آپ سے شرمندگی ہورہی ہے۔" وہ دھیمے دھیمے بولتا رہا۔ جویریہ شرمندگی کے سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔

"بہت کچھ کہہ دیا میں نے' میری باتیں بری لگی ہوں یا تمہارا دل دکھا ہو تو اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں اور ایک آخری بات اور" احتشام نے ایک گہری سانس لی۔ "کہانیوں' فلموں اور ڈراموں میں لو ٹرائی اینگل ہوتا ہے مگر ریل لائف میں کبھی کبھی یہ ٹرائی اینگل' ریکٹ اینگل بھی بن جاتا ہے۔ میری کہانی' میری اور ماہم کی کہانی تھی۔ تم دونوں خوش فہم زاویے تھے۔" وہ خاموش ہوا اور جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا۔

جویریہ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنے بے جان ہوتے قدموں کو گھسیٹ کر اندر لے جاتی۔ احتشام گاڑی لے کر باہر نکل رہا تھا۔

جویریہ سوچ رہی تھی' وہ جو بات بات پر حریم کو اسٹوپڈ اور فولش کہہ کر پکارتی تھی' دراصل سب سے بڑی احمق وہ خود تھی اور شاید ہر وہ لڑکی بے وقوف ہی ہوتی ہے جو کسی کی ایک مسکراہٹ اور سراہتی نظروں سے خوش فہمی کی اور خوابوں کی دنیا آباد کرلیتی ہے۔ کچھ لڑکے جان بوجھ کے یہ کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ انجانے میں' مگر کوئی لڑکی کیوں اتنی موم بن جاتی ہے کہ اپنے آپ کو پگھلا کر ضائع کردیتی ہے۔



حمیرا نوشین



"کیا طلب ہو [illegible] آنسو [illegible]
آنکھیں [illegible]
سینے میں حقیقت کا [illegible] سے بھی
[illegible]

[illegible] دل ہی جاتا ہے"
"[illegible] کی بات [illegible]
میں تو صرف انتظار کروں گی [illegible]
[illegible] سے ملے

جھریاں نہیں ڈالنا چاہتی' بس گلیسرین استعمال کرتی ہوں اور ٹپ ٹپ بہتے آنسوؤں سے سین مکمل کروا کر دوسرے ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے نکل پڑتی ہوں مگر یار! اس کا بھی بڑا نقصان ہے۔ آنکھوں میں خارش ہوتی رہتی ہے۔ مسلسل گلیسرین استعمال کرکے میری تو آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہے۔" دوسری ہیروئن نے اپنے پرس میں سے چھوٹا سا شیشہ نکال کر فوراً" اپنی آنکھوں کا جائزہ لیا۔

"ہم لوگ رو دھو کر اپنے سین کر لیتی ہو' مجھے دیکھو' کم بخت ایسا رول ملا ہے' جس میں سوائے شوہر کے طعنے تشنے سننے اور مار کھانے کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اوپر سے مقابل ہیرو ایسا جان دار تھپڑ رسید کرتا ہے کہ دل کرتا ہے کھینچ کے اس کے پیٹ میں لات رسید کروں مگر کردار انتہائی صابر لڑکی کا ہے اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں۔ میرے چہرے کا تو حشر ہی ہو گیا ہے' تھپڑوں سے ہر وقت سن رہتا ہے الرجی کی شکایت ہو گئی ہے۔ آج کل اسکن اسپیشلسٹ کے چکر لگا رہی ہوں۔ ڈرامے سے جو کما رہی ہوں' وہی ڈاکٹر پہ لٹا رہی ہوں۔ میں تو سچ میں اپنی رائٹر سے عاجز آچکی ہوں جسے سوائے رونے دھونے اور ظلم و ستم کی ماری لڑکیوں کی کہانیاں لکھنے سے فرصت نہیں۔" تیکھے نین نقوش' گوری رنگت والی نے خوب دل کی بھڑاس نکالی تو باقی سب اس کی حالت پر ہنس دیں۔

"ہائے۔۔۔! کیا وقت ہوتا تھا جب میں الہڑ دوشیزہ بنی خوب صورت پراندے جھلاتی بل کھاتی پگڈنڈیوں پر چلا کرتی تھی اور ہیرو میری ایک نظر التفات کا منتظر گھنٹوں چاچا شیدے کے کھیتوں میں کھڑا اپنی ٹانگیں تھکا رہا ہوتا تھا۔ میں بھی کن اکھیوں سے دیکھتی اسے مسلسل نظرانداز کیے آگے بڑھتی چلی جاتی تھی اور وہ بے چارہ میرے پیچھے پیچھے میری ہرنی سی چال کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتا تھا۔ حق ہا۔۔۔ اب تو وہ ہیرو نہ جانے کہاں مر کھپ گئے۔ آج کل کے ہیرو تو سوائے اپنی بیگم پر ہاتھ اٹھانے اور دوسری کو پٹانے کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔"

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا تو محفل میں موجود ایک اور ہیروئن اپنا دکھڑا سنانے کو بے تاب ہو گئی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے میں کتنی ڈیسنٹ ہوا کرتی تھی' میرا ہیرو مجھے مخاطب کرنے سے پہلے سو بار سوچا کرتا تھا' کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ میرے بارے میں کوئی فضول بات کر جائے۔ بابا سے ملنے کے بہانے وہ میرے گھر کا ہر دوسرے روز چکر لگایا کرتا تھا اور میں بظاہر اسے مکمل اگنور کرتی اس کی آنکھوں کے سحر میں مکمل گرفتار ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا خمار رات بھر مجھے بے چین رکھا کرتا تھا۔ آج بھی وہ خمار میری آنکھوں میں ہلکورے لیتا ہے اور دل میں کہیں شدت سے یہ خواہش ابھرتی ہے کہ کاش وہ پھر سے لوٹ آئے۔ سچ اب تو میں وعدہ کرتی ہوں' اسے بالکل بھی نہیں ستایا کروں گی' چائے میں چینی کی بجائے نمک بھی نہیں ڈالوں گی اور اس کی آنکھوں کے سامنے رہ کر اس کے دل کو قرار بھی بخشوں گی۔" سانولی سلونی پرکشش ہیروئن اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی گھماتی ہوئی ماضی میں کھو سی گئی۔

"ہم کافی دیر سے خاموش بیٹھی ہو کیا تمہیں اپنی رائٹر سے کوئی شکوہ نہیں' تمہارے ڈرامے بھی ہم نے دیکھے ہیں' تمہارا حال بھی ہم سے مختلف تو نہیں ہے' پھر کیوں چپ سادھ رکھی ہے یا زیادہ معاوضے نے تمہاری زبان پر قفل لگایا ہوا ہے۔" دل جلی ہیروئن نے کافی دیر سے خاموش بیٹھی ایک ہیروئن پر جملہ کسا تو وہ بلبلا اٹھی۔

"میرا سینہ چاک کر کے میرا دل دیکھو جسے محبوب کی بے وفائی نے چھید ڈالا ہے۔ ہر ڈرامے میں میرا محبوب شوہر مجھے بیوی بنا کر دوسری پر ڈورے ڈال کر میرے ہی گھر میں بیوی بنا کر جب رکھتا ہے تو مت پوچھو کہ میرے سینے پر کیسے سانپ لوٹتے ہیں۔ میں دکھیاری غموں کی ماری' مجھ میں اب بولنے کی سکت ہی کہاں؟ اب تو ناظرین کے چہروں پر بھی ڈرامے میں

میرا چہرہ دیکھ کر بے زاری چھا جاتی ہے مگر کیا کروں' ایک ہی ڈگر پر چلنے والی رائٹر یہ بات سمجھ ہی نہیں رہی مگر اب... کیا کہوں ان رائٹرز کو اللہ ہی ہدایت دے اور یہ عورتوں کی تذلیل' ظلم و ستم کے قصے اور دوسری شادی کے شوقین مردوں پر لکھنا کم کردیں اور معاشرے میں پھیلی مزید کہانیوں کی طرف توجہ دیں تو گھر بیٹھے ناظرین کو بھی کچھ سکون ہو' ورنہ تو ایک جیسے ڈرامے دیکھ کر وہ بھی اکتا گئے ہیں۔ بیویاں ہر وقت شوہر کی دوسری شادی کے خوف میں مبتلا رہتی ہیں کہ کیا پتا کب دوسری بیوی ان کے سر پر نازل ہو کر ان کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ ڈالے۔" کم عمر شوخ ہیروئن نے حقیقت پر بیان کی۔ "میں بھی تم سے صد فیصد متفق ہوں' میری اپنی بہن اسی خوف کا شکار رہ کر ہر وقت اپنے میاں کو نظروں میں رکھتی ہے۔ رات کو چوری چوری موبائل چیک کرتی ہے کہ کہیں کوئی چکر تو نہیں چل رہا' آفس فون کر کرکے بار بار ان کی موجودگی کا پتا کرتی ہے' آفس سے واپسی پر اگر اس کے ہزبینڈ ذرا لیٹ ہو جائیں تو پتا نہیں کتنے شک کے کیڑے اس کے ذہن میں کلبلانے لگتے ہیں' اب تو بہنوئی بھی اس کی اس عادت سے عاجز آچکے ہیں اور مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ جلد ہی تنگ آکر اس کے شک کو یقین میں بدل ڈالیں گے۔ اس کی اس حالت کے ذمہ دار یہ آج کل کے ڈرامے ہیں جن میں شوہر اب دوسری چھوڑ تیسری اور چوتھی شادی کرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔"

"تم سب میری بات سے یقیناً" اتفاق کرو گی۔" قدرے فربہی جسامت اور دل نشین اداؤں والی ہیروئن نے سب کی طرف دیکھ کر آنکھیں مٹکائیں تو وہاں موجود ساری ہیروئنوں نے اپنے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا۔

"تم سب اپنے رونے دھونے والے سین سے پریشان ہو' ذرا میری حالت ملاحظہ کرو' ایک ڈرامے میں رومانٹک رول کرنے پر میری پرفارمنس کو خوب سراہا گیا اور ڈراما ناظرین میں خوب مقبول ہوا' تب سے میری رائٹر نے ایسے بے باک سین لکھنے شروع کیے ہیں کہ مجھے کرنے سے پہلے ہی سوچ کر پسینہ آجاتا ہے۔ رومینس سب کو اچھا لگتا ہے مگر وہ جو ڈھکا چھپا ہو یہ کیا کہ سب گھر والے بیٹھ کر دیکھیں تو پانی پانی ہو جائیں' ایسا ہی ڈرامے میں میرا ایک سین تھا' بڑے بھائی نے جو دیکھا تو ایک تھپڑ رسید کیا کہ ہم نے تمہیں ڈراموں میں کام کرنے کی اجازت دی ہے بے حیائی پھیلانے کی نہیں۔"

"مجھ میں اور تم میں فرق بس یہی ہے کہ تم ڈراموں میں تھپڑ کھا رہی ہو اور میں گھر میں مگر ایک بات بتادوں' ڈراموں سے زیادہ گھر کے تھپڑ چکرا کر رکھ دیتے ہیں۔" نازک سی ہیروئن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو اس کے دکھ پر کئی ہیروئنوں کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں جو کہ اس بات کا ثبوت تھیں کہ ہم تمہارے غم میں برابر کی شریک ہیں۔

"اب یوں ہی دکھڑے روتی رہو گی یا اس کا کوئی حل بھی نکالو گی' آج کی یہ محفل اسی لیے رکھی گئی ہے کہ ہم کیسے ان ایک جیسے کرداروں سے جان چھڑائیں۔"

"صبر کرو' اسی طرف ہی آرہی ہوں' اب اکر اکٹھے ہوئے ہیں تو اپنا کچھ غم بھی تو ہلکا کرلیں۔"

"غم ہلکا کرنے کے چکر میں پوری رات بیت جائے گی۔" سمجھ دار ہیروئن نے وقت گزرنے کا احساس دلایا تو وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

"اب اتنے بھی سر نہ جوڑو کہ ہماری جوئیں آپس میں تبادلہ خیال کے ساتھ ساتھ تبادلہ سر کرلیں۔" نفیس سی طبیعت کی ہیروئن نے انہیں ڈرایا تو وہ سب قدرے فاصلے سے ہو کر سوچنے لگیں۔

"السلام علیکم.... دیر سے آنے پر معذرت' کیا کروں' میرا ڈائریکٹر مجھے اٹھنے ہی نہیں دے رہا تھا' کہتا تھا ڈرامے میں اپنے سارے سین کر جاؤ' حالانکہ میں نے کہا بھی کہ مجھے اپنے سارے مکالمے بغیر یاد کیے ازبر ہیں مگر پھر بھی بضد رہا کہ نہیں پھر بھی پڑھو تاکہ ڈرامے میں جان پیدا ہو۔ ناچار میں بے جان ہوتے وجود کے ساتھ سارے سین پڑھ کر ہی تم تک پہنچی ہوں۔" دراز قد ہیروئن نے پرس صوفے کی طرف

اچھالا اور بات مکمل کرکے گلاس لبوں سے لگالیا۔ اس کے دیر سے آنے کی وجہ سن کر سب خاموش ہو گئیں۔

"کوئی حل نکلا۔۔۔؟"

"اوں ہوں۔۔۔" سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"زیادہ دماغوں پر زور ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، جن ڈراموں میں ہم کام کررہے ہیں۔ وہ سب مکمل کرواکے ڈائریکٹر اور مصنفہ کو سچ سچ بتا دیتے ہیں کہ روتی شکلیں دیکھ دیکھ کر ہمارے ساتھ ساتھ لوگوں کے چہروں کی رونقیں بھی ماند پڑ گئی ہیں۔ ہمارے چہروں پہ پھٹکار برسنے لگی ہے، ہم سے اب مزید بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔" وہ قطعی لہجے میں بولی تو دوسری نے اس کے خیال کی نفی کردی۔

"نہیں یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ہمیں انہیں اس بات کا احساس دلانا چاہیے کہ لوگ ان کے بارے میں منفی رائے قائم کررہے ہیں، ابھی تو تنقید کی رم جھم شروع ہوئی ہے، کہیں ایسا نہ ہو تنقید کے بھاری پتھر برسنے لگیں۔ اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ایسا ڈراما لکھیں، جس کی ایک قسط دیکھ کر لوگ دوسری قسط کا بے صبری سے انتظار کریں اور عرصہ دراز تک وہ کردار ناظرین کے ذہنوں سے محو نہ ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ تمہاری بات میرے دل کو بھی لگی ہے مگر اس دوران پھر وہ فارغ رہ کر کریں گی کیا۔" دوسری کو فکر ہوئی۔

"کتنے عرصے سے ہماری قارئین بہنیں اپنی پیاری مصنفات کو یاد کررہی ہیں، ہر ماہ اس امید پر رسالہ کھولتی ہیں کہ شاید اپنی پرانی مصنفاؤں میں سے کسی کا نام فہرست میں نظر آجائے مگر نہ جی عید کا چاند بن گئی ہیں ہماری مصنفات تو۔"

"یہ سب سچ ہے مگر ایک بات میں خدا لگتی کہوں گی کہ ان ڈائجسٹوں نے ہمیں بہترین رائٹرز سے بھی نوازا ہے۔ ہماری آج کل کی بہت سی مصنفات بلاشبہ لائق تحسین ہیں جن کی بنا پر رسالوں کا معیار کسی بھی طور کم نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی کمی قارئین محسوس کرتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے فیرنی میں میٹھا تھوڑا کم رہ گیا ہو مگر فیرنی بہت زبردست ہو۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے تو وقت نہیں بھولتا جب سردیوں کی راتوں میں لحاف میں لیٹ کر میں اپنے کردار سے خوب حظ اٹھاتی تھی۔ پورا ماہ کتنی شدت سے میں قاری بہنوں کے خطوط کا انتظار کرتی تھی کہ انہیں میرا کردار کتنا پسند آیا ہے؟ خوب صورت لفظوں میں وہ جب میرے کردار کی تعریف کرتی تھیں تو سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ اب تو وٹامن کی ٹیبلٹس ہی لینی پڑتی ہیں۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

"اور میرے کردار کی کئی خوبیاں اپنا کر کتنی ہی بہنوں نے ماؤں کی دعائیں سمیٹی ہیں۔" ایک ہیروئن اترائی۔

"اور وہ جو میرا ہیرو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے اپنا ہاتھ میری انگلیوں سے ٹچ کرتا تھا تو اس وقت مت پوچھو میرے دل کی کیا حالت ہوتی تھی، خون سرخی بن کر چہرے پر دوڑنے لگتا تھا، آنکھیں بار بار حیا سے جھک جاتی تھیں۔ اپنے دل کی حالت کو سنبھالتی لڑکھڑاتی ٹانگوں سے جو کمرے کا رخ کرتی تھی تو آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر خود پہ ہی پیار آجاتا تھا۔ کسی بلش آن کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اب تو میک اپ کروا کروا کر ساری جلد ہی خراب ہوگئی ہے۔" ماضی کے قصوں کو کھنگالتی ہیروئن آخر میں اکتاہٹ سے بولی۔

"تو بس پھر طے ہوگیا۔ دھرنا ہوگا، دھرنا ہوگا، ڈراموں کو بدلنا ہوگا، ڈراموں کو بدلنا ہوگا۔"

جوشیلی ہیروئن جوش سے بولی تو باقی بھی سب شروع ہوگئیں۔ "دھرنا ہوگا، دھرنا ہوگا۔۔۔ ڈراموں کو بدلنا ہوگا۔۔۔" اور اس شور سے ہماری آنکھ کھل گئی۔



ملیحہ سعید

ابھی جو چاند نکلا ہے

مہینے کا وسط تھا اور چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کی ٹھنڈی سی روشنی باہر لان سے دودھیا سا اجالا پورے صحن میں بکھرا ہوا تھا جس نے گھر کی چاردیواری کو رنگ دیا تھا۔ تمام کمرے سامنے کی دیواروں سے لپٹی بیلوں کے پتے اس کی چاندنی میں نہا رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے ان کے باعث پتوں کی سرسراہٹ سے ماحول میں گونج رہی تھی۔ اس نے کروٹ لے کر اس منظر کو دیکھا۔ شاید کسی نے ہمیں ان کو رونقنے کے پاس بلایا تھا۔

وہ سیدھی ہو گئی۔ پھر تھوڑا سا رخ موڑ کر باہر کی طرف دیکھا۔ وہ رات قدرتی طور پر بہت خوب صورت تھی۔ مگر اس کی نگاہ دیوار کے اس پار کی طرف تھی جہاں دوسری طرف کوئی لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے اس پار جمی تھیں۔ ایک زبردست جذبے سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کی نظریں ان چیزوں پر پڑ رہی تھیں جو اس کے اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ اس وقت تک انتظار کا اختتام نہیں ہوا تھا اور اس کا دل بار بار کسی انجانی خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ بالآخر جب تک کال کے لیے دل ماننے والا نہ تھا۔

اس نے نظریں ہٹا لیں۔ جیسے کوئی اس کا منتظر ہو۔ جیسے کسی کی طرف سے کوئی پیغام آنے کو ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے آج وہی آ رہا ہو۔ اس نے سامنے ہی بچی سے کروٹ بدلی۔ ایک نظر موڑ کر دیکھا اور جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک تھی جو اس کے پاس آتے ہی بڑھ جاتی تھی۔

اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس کے لبوں پر بے آواز ایک مسکراہٹ سی آ گئی۔ چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ صورت ایسی لگ رہی تھی کہ جیسے جاگتی ہوئی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ تو اسی طرح اس نے دور اس کو دیکھا۔ پھر وہ جگہ دیکھ کر جو اب بالکل خاموش دکھائی دیتی تھی اس نے ایک لمحے کو پھر سوچا اور اس کے سوال پر غور کیا۔

اس کی بات سن کر وہ مسکرا دی تھی۔

بس ایک پل کو چاند کے چہرے کی طرف دیکھا اس نے

ناولٹ



پڑھ لی تھی۔ کیا تم بھی ان سے نہیں کہتے کہ کوئی انہیں یاد کرتا ہے۔ وہی مخصوص سوال جو وہ ہمیشہ سے کرتی تھی۔ تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو؟ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کا کہا ٹالا تو نہیں جاتا۔ کیسی محبت ہے تمہاری کہ تم میری اتنے برسوں کی التجا ان تک نہیں پہنچا رہے۔ اس نے شکوہ کیا۔ تم میری بات نہیں مانتے' اب میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ پانیوں سے لبالب بھری نگاہیں چاند پر ڈالتے کروٹ بدل کر گویا اپنا غصہ باور کرایا۔

فاطمہ الیاس جو بظاہر سونے کی اداکاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے شدت سے اس کا یوں بے چینی سے کروٹ بدلنا نوٹ کیا اور اس کی طرف سے کروٹ لے لی۔ ایک ماں بھلا کیسے سوتی جب اس کی اولادیں بے چین تھی اور جس سے نیند کوسوں دور تھی۔

اور دور پردیس میں ایک اور انسان بھی ایسے ہی بے چین تھا۔ نیند ان آنکھوں سے بھی روٹھی ہوئی تھی۔ سکون وہاں بھی ناپید تھا۔ کیونکہ وہ جسم تھا جس کا دل زخمی تھا اور جب جسم کا کوئی حصہ تکلیف میں ہوتا ہے تو پورا وجود درد کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور یہاں تو درد بھی جان لیوا تھا۔ کیونکہ اس وجود کا تو دل ہی زخموں سے چور تھا۔

سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے



صبح ہمیشہ جیسی روایتی ہی تھی' قریبی گھروں سے بلند ہوتی آوازیں' کھیتوں کا رخ کرتے کسان' ٹوپیاں سروں پر' سیپارے سینوں سے لگائے گھروں سے مسجد کا رخ کرتے بچے' صبح کا وقت عائلہ الیاس کے لیے سب سے پیارا اور دلچسپ ہوتا تھا۔

امی ناشتا بنانے میں مصروف۔۔۔ بلاول کالج کی تیاریوں میں۔۔۔ عجیب ہی لڑکا تھا وہ بھی' جس کا کوئی کام وقت پر اور ڈھنگ سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود بوکھلاتا تو خیر۔۔۔ لیکن اپنے علاوہ امی کے ہاتھ پاؤں پھلانا اس کا مشغلہ تھا۔ کبھی آواز آتی۔ "امی جوتے نہیں مل رہے' کبھی تولیہ اور کبھی برش' خیر۔۔۔ اب تو وہ لوگ اس کی بوکھلاہٹوں کے عادی ہو چکے تھے' اسے تو سامنے پڑی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی۔

عائلہ' بلاول کی ان دہائیوں کو نظرانداز کرتی ہوئی' اپنے گھر کی درمیانی چھوٹی دیوار پر کہنیاں ٹکائے پڑوس میں' ماموں کے گھر میں جھانک رہی تھی۔ جہاں ارحم اور عالیان نہ صرف اٹھ چکے تھے بلکہ ناشتے میں مصروف تھے' جبکہ بدر یامین' ہنوز نیند میں دھت تھا۔ وہ بھی بلاول کی طرح ہی نیند کا شیدائی تھا لیکن بلاول کی نسبت اس کی یہ عادت بہت اچھی تھی کہ وہ فجر کے وقت خود اٹھتا تھا اور باجماعت نماز کے بعد پھر سو جاتا تھا اور اس وقت بھی وہ یقیناً" نماز ادا کرکے سویا تھا' ورنہ مامی اب تک اسے جگا چکی ہوتیں۔

اس نے رشک بھری نگاہوں سے بدر کی طرف دیکھا' کس قدر پرسکون تھا وہ' حالانکہ وہ بھی بلاول کے ساتھ ہی کالج جاتا تھا لیکن اسے کسی چیز کی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہڑبونگ نہیں مچاتا تھا' کیونکہ اسے ہر چیز سلیقے سے رکھنے کی عادت تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کی مانند وقت کا پابند' پونے آٹھ بجے تک اٹھتا' پورے آٹھ پر وہ تیار ہو کر مامی کے پاس آتا' دس منٹ ناشتے کے اور سوا آٹھ بجے بلاول کو پکارتا۔

"میں بائیک نکال رہا ہوں' گیٹ پر آجاؤ۔"

اب بلاول کہاں چھپا ہے۔ اس نے سنا یا نہیں' اس کی جانے بلا۔ اگر وہ عین وقت پر وہاں نہیں پہنچا تو بس پھر سمجھو بے چارے کی شامت آجاتی' بدر جو کرتا سو کرتا لیکن جو امی اسے بے نقط سناتیں کہ بے چارہ شرمندہ ہوتا۔ بدر سے چڑتا رہتا' کیونکہ وہی اس کا دشمن تھا' کیونکہ امی اس کی مثالیں دے کر شرم دلاتی تھیں۔

"بدر بھی تمہارا ہی ہم عمر ہے مگر مجال ہے جو کبھی ماں کو ستایا ہو' اتنا سعادت مند کہ بس۔۔۔ نماز کے لیے

خود اٹھتا ہے' اپنی کتابیں' کپڑے' جوتے خود سنبھال کر ترتیب سے رکھتا ہے' مجال ہے جو کبھی کوئی چیز ادھر ادھر پھینکی ہو اور ایک تم ہو۔" وہ دانت پیستیں اور بلاول سر جھکائے ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتا' بدر کو کوستا رہتا۔

"یہ کلاک ہمارے گھرانے میں جانے کیوں پیدا ہوگیا۔" اس کا بس چلتا تو گھڑی کی طرح اس کے سیل بھی نکال لیتا مگر وائے ری قسمت! اس کے نصیب اتنے اچھے کہاں؟ اس کی وہی باتیں جو دوسروں کی ماؤں کو پسند تھیں اور اپنی اولادوں کو اس کی مثالیں دے کر شرم دلاتی تھیں۔ اس کی اپنی ماں اس کی انہی عادتوں سے عاجز بلکہ خائف رہتی تھیں' کیونکہ اسے ہر چیز بالکل پرفیکٹ چاہیے ہوتی تھی' کسی بھی چیز میں معمولی سا نقص بھی وہ برداشت نہیں کرتا تھا۔ چھوٹے بھائیوں کے ساتھ بھی وہ خاصی سختی کر جاتا تھا' بھی' البتہ خود سے وابستہ رشتوں کے معاملے میں وہ خاصا حساس تھا۔

عائلہ نے اس کے وجود سے نظر ہٹا کر ارحم کی طرف دیکھا۔ وہ یونیفارم میں ملبوس اپنا بیگ چیک کر رہا تھا' جبکہ عالیان گھر کے کپڑوں میں ملبوس امید بھری نگاہوں سے مامی کو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً "وہ آج چھٹی کے موڈ میں تھا۔ خود میں تو ہمت نہ تھی' اس لیے ماں کو سفارشی بنا کر اپنے جلاد بھائی کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوگا۔ اسے بے ساختہ عالیان پر ترس آیا۔

تب ہی اس نے بدر کو اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے دیکھا۔ پھر بے ساختہ پلٹ کر بلاول سے ٹائم پوچھا۔ پھر دوبارہ واش روم کی طرف جاتے بدر کو حیرت سے دیکھا' وہ آج پندرہ منٹ لیٹ تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور مامی نے بھی اسے نہیں جگایا تھا۔ وہ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھیں' آج تو اسے یقیناً "دیر ہو جائے گی' سوچتے ہوئے پلٹ کر ماں کے پاس آگئی۔ بلاول جلدی جلدی ناشتا کر رہا تھا۔

"آرام سے کھاؤ' بدر تو خود ابھی اٹھا ہے۔" اس نے بلاول کو تسلی دی۔

مگر بلاول کو معلوم تھا' بدر انسان نہیں' جن ہے اور ہوا بھی یہی' مخصوص وقت پر اس کا مخصوص ہارن سن کر وہ ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئی' جبکہ بلاول نے دانت پیستے ہوئے جلاتی نگاہوں سے عائلہ کو دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں نہ کہتا تھا بدر یامین انتہائی فضول انسان ہے' جس پر پابندی' وقت کا بھوت سوار رہتا ہے۔" اور فاطمہ نے بھی اسے جتاتی شرم دلاتی نگاہوں سے دیکھا' گویا کہہ رہی ہوں "اسے کہتے ہیں پابندی وقت اور اس کی قیمت کا احساس' جبکہ بلاول ان کی نگاہیں نظر انداز کرتا اٹھ گیا اور عائلہ تو گویا لقمہ لینا ہی بھول گئی تھی۔



اس روز ویک اینڈ تھا' اسماعیل اور فائز شہر سے آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ڈی فارمیسی کے بعد ایک میڈیسن کمپنی میں نوکری کرتے تھے۔ اسماعیل' بدر یامین کا بڑا بھائی تھا اور اس کا متضاد' یعنی نرم مزاج اور خوش اخلاق انسان' عالیان اور ارحم کے لیے وہ دو دن عید سے کم نہیں ہوتے تھے' جب ہفتے کی شام وہ لوگ آتے اور پیر کی صبح واپس جاتے تھے۔

فائز' عائلہ کا بڑا بھائی تھا اور وہ دونوں تقریباً "ایک نیچر کے مالک تھے۔ عائلہ کو اسماعیل سے خصوصی لگاؤ تھا' اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کا لہجہ بالکل الیاس جیسا تھا اور اسے باپ سے والہانہ محبت تھی۔ دونوں مائیں اپنے بیٹوں کی یوں آؤ بھگت کرتیں گویا وہ پردیس سے برسوں بعد لوٹے ہوں اور وہ لوگ بھی پیٹ بھر بھر کر ان کی بنائی مرغن غذائیں کھاتے' چاہے اس کے بعد پورا ہفتہ اس کی سزا بھی بھگتتے رہیں' ان کی آمد پر وہ چلتا پھرتا کلاک بھی اپنے معمولات میں تھوڑی بہت ردوبدل کر لیتا تھا۔

اس وقت عائلہ' ماموں کے گھر اور درمیان والی چھوٹی سی دیوار پھاند کر آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ساگ کا پیالا تھا جو فاطمہ نے فائز کے لیے بنایا تو اسے کہا کہ اسماعیل کو بھی دے آئے۔ وہ برآمدہ عبور کر کے اس

کے کمرے میں آئی تو وہ کپڑے استری کر رہا تھا۔
"ارے آپ کیوں پریس کر رہے ہیں کپڑے؟" وہ اس کے قریب آئی تو اسماعیل مسکرا دیا۔
"اٹس اوکے گڑیا۔"
"آپ ہٹیں' میں کر دیتی ہوں۔" اس نے پیالا میز پر رکھا۔
"اٹس اوکے بیٹا' میں کرلوں گا۔"
"میرے ہوتے ہوئے آپ کیوں کریں گے۔" اس نے بہت مان سے کہا تو اسماعیل نے قمیص چھوڑ دی۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ کر دے۔
"امی نے ساگ بھیجا ہے آپ کے لیے۔" اس نے اسماعیل کو بتایا۔
"میں تو وہیں آرہا تھا' پھوپھو نے یہاں بھیج دیا۔"
"کوئی بات نہیں' آپ وہیں چلے جائیں' یہ میں فریج میں رکھ دیتی ہوں۔" اس نے بہت پیار سے اسماعیل کی طرف دیکھتے سنجیدگی سے کہا تو اسماعیل نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔
سولہ برس کی عمر' اتنی سنجیدہ اور سوبر تو نہیں ہوتی۔ یہ احساس ذمہ داری کہاں سے لی اس معصوم سی بچی نے' وہ گندمی رنگت کی پرکشش نقوش معصوم سی بچی تھی۔ اسماعیل کے یوں دیکھنے پر عائلہ متوجہ ہوئی' تو وہ گہری سانس لیتے اس کے پاس آئے۔ نرمی سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"بدر کو بہت پسند ہے ساگ' تم فریج میں رکھ دو' پھر ہم لوگ چلتے ہیں۔" عائلہ نے ان کے پلٹتے وجود کو دیکھا' ان کا صرف لہجہ ہی الیاس کے لہجے جیسا نہیں تھا بلکہ جب وہ یوں شفقت سے پیش آتے تو اسے الیاس ہی لگتے تھے۔ وہ جاچکے تھے' جبکہ عائلہ وہیں ساکت کھڑی تھی۔



بدر یامین اس کے ماموں کی دوسری اولاد اور نہ سمجھ میں آنے والی اولاد تھی۔ شاید ماموں' مامی نے اس کا نام اس کی صورت دیکھ کر رکھا تھا' کیونکہ بلاشبہ وہ بہت وجیہہ اور ہینڈسم نوجوان تھا۔ ماموں کے چار بیٹے تھے۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی اور وہ لوگ اپنی بیٹی کی محبت عائلہ پر لٹاتے تھے۔ اس کا نام بھی ماموں نے ہی رکھا تھا' وہ سب کی چہیتی اور لاڈلی تھی۔ ماموں' مامی' اسماعیل بھائی' سب اس سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تو ارحم اور عالیان اسے آپی۔ آپی پکارتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کے گھرانے سے صرف بدر یامین تھا جس کی کچھ بنتی نہیں تھی عائلہ الیاس کے ساتھ' اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ وہ تقریباً"ہم عمر تھے۔
عائلہ' بلاول سے گیارہ ماہ چھوٹی تھی' جبکہ بدر' بلاول سے دس ماہ بڑا تھا۔ وہ دونوں قریبی قصبے میں ایف ایس سی پارٹ ٹو کے اسٹوڈنٹ تھے۔ عائلہ میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ چکی تھی اور کسی نے اس کے آگے پڑھنے پر زور بھی نہیں دیا تھا' جبکہ اس کی خواہش تھی اسے بھی پڑھائی کے لیے فورس کیا جائے لیکن اس کے ماں باپ نے اس پر کبھی کسی کام یا بات کے لیے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ اس کا جو دل چاہتا وہ وہی کرتی اور اس کی زندگی کا یہی دکھ تھا۔ اسے روک ٹوک چاہیے تھی' اس کا باپ برسوں سے اس سے دور تھا' تو ماں بھی جانے کیوں نظریں چرائے رہتی۔
بلاشبہ وہ سب کی لاڈلی تھی۔ ماموں' مامی' فائز بھائی' اسماعیل سب لوگ اس سے بہت محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے' لیکن اسے ان سب کی نہیں اپنے والدین کی محبت چاہیے تھی۔ اس کا باپ روایتی باپوں کی طرح اسے سینے سے لگا کر پیار کرے اور ماں عام ماؤں کی طرح اسے نہ پڑھنے پر ٹوکے۔ بلاول کی طرح ہی ڈانٹے' اسے اسپیشل بچوں کی طرح کا برتاؤ نہ کیا جائے اور یہ حسرتیں اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھیں اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ جیسے امربیل کی طرح اس کے وجود سے لپٹتی اسے کھوکھلا کیے جارہی تھیں۔
سات برس کی عمر سے وہ تنہا تھی' محبت بھرے رشتوں کے درمیان' والدین کی محبت کو ترستی لیکن اس نے اپنے دکھ اور تنہائیاں کبھی کسی پر عیاں نہیں کی

تھیں۔ وہ جب بھی روئی اپنے رب کے سامنے روئی تھی۔ دور آسمانوں پر چاند تھا' جو اس کی محرومیوں اور رتجگوں کا گواہ تھا۔ کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ بدر اور بلاول کے ساتھ ہر وقت لڑتی جھگڑتی لڑکی کے اندر کتنی محرومیوں کا ڈیرا ہے۔

"ارحم' یہ پکڑو شرٹ پریس کرکے لاؤ۔" بدر نے کرکٹ میچ دیکھتے ارحم کو شرٹ تھمائی۔

وہ بے دلی سے اٹھا' کیونکہ انکار تو کر نہیں سکتا تھا' وہ خوب جما جما کر شرٹ پریس کرکے دیکھ رہا تھا مگر سلوٹیں تھیں کہ نکل کے نہیں دے رہی تھیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا اگر سلوٹیں رہ گئیں تو بدر یا مین نے شرٹ اس کے منہ پر دے مارنی ہے۔ وہ خواب میچ دیکھ رہا تھا' وہ روہانسا ہو گیا۔

پھر ایک نظر اندر جھانکا اور دبے پاؤں چلتا پھوپھو کے گھر آگیا۔

"آپ سے فیور چاہیے' پلیز تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ہاں آجائیں۔" وہ اس کا جواب سنے بنا واپس پلٹ گیا تھا۔ اسے آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ آئی تو بدر' ارحم کو ڈانٹ رہا تھا۔

"اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر ایک شرٹ نہیں پریس کرسکتے ڈھنگ سے۔" وہ دانت پیستے ہوئے سر جھکائے کھڑے ارحم پر برس رہا تھا۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر تمہاری جگہ ہماری کوئی بہن ہوتی۔ اب اپنی شکل میرے سامنے سے لے کر چلے جاؤ' شام تک میرے سامنے مت آنا اور خبردار اگر ٹی وی کے پاس بھی پھٹکے تو۔"

ارحم کی خاموشی اسے مزید غصہ دلا رہی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے؟" عائلہ کو بولنا پڑا۔ بدر نے خفگی سے اسے دیکھا' جبکہ ارحم نے پرسکون سانس خارج کی۔

"تم کبھی پیار سے بھی بات کرتے ہو۔" سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"تم سے مطلب؟ جاؤ یہاں سے۔" اس نے خفگی سے کہا۔ ارحم نے ملتجی نظر عائلہ پر ڈالی۔

"لاؤ میں کر دیتی ہوں۔" اس نے برآمدے میں آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑے بدر سے کہا۔

"رہنے دو۔" وہ جھلایا۔

"یہ ایسے پریس نہیں ہوگی' کاٹن کی ہے' پہلے اس پر تھوڑا پانی چھڑکو۔" بدر نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ میں سچ کہہ رہی ہوں' یہ ایسے پریس نہیں ہوگی۔" اسے لگا بدر نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا' اسی لیے بات دہرائی تو بدر سر ہلاتا شرٹ چھوڑ کر پیچھے بیٹھ گیا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ کر دے اور اب یہ اس کی قسمت کہ بدر کو پریس شدہ شرٹ بھاگئی اور اس کے بعد اسے جب بھی کپڑے استری کرانے ہوتے اس کے پاس جا پہنچتا۔

"عائلہ پلیز' یہ ذرا پریس کر دو۔" اس کے انداز میں اس قدر لاپروائی اور بے نیازی ہوتی گویا وہ اس پر کوئی احسان عظیم کر رہا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی بلاول بھی وقت بے وقت اس کے سر ہو جاتا۔ ایک ڈیڑھ ہفتہ تو اس نے بنا چوں چرا کیے ان کے کپڑے کر دیے۔ پھر وہ بھی تنگ آگئی۔

"ملازمہ تو نہیں ہوں تم دونوں کی' اپنے کام خود کرو۔" اس نے بے مروتی سے کہا۔ بلاول بے چارہ تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا مگر بدر یا مین ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا عائلہ کو چاکلیٹ اور چپس پسند ہیں۔ اگلے روز وہ چاکلیٹ لے کر اس کے پاس آ پہنچا' وہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹی میگزین پڑھ رہی تھی جو ہر ہفتے فائزہ اور اسماعیل اس کے لیے لاتے تھے۔ بدر نے میگزین جھپٹ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے' ادھر دو میرا میگزین۔" اس نے خفگی سے کہتے بدر کو گھورا۔

"میرے کپڑے پریس کر دو' صبح پہننے ہیں۔" عائلہ کے غصہ کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔

"میں نہیں کر رہی' ادھر دو میگزین۔" اس نے ہاتھ بڑھایا' تو بدر نے ہاتھ بلند کرکے میگزین اس کی پہنچ سے دور کر دیا۔

''کردو نا! دیکھو تمہارے ہاتھ سے پریس شدہ کپڑے مجھے پسند ہیں۔'' اس نے یوں کہا گویا وہ اس کے منہ سے یہ تعریفی کلمات سننے کے لیے مری جارہی ہو۔

''بدریامین! تم فوراً'' یہاں سے چلے جاؤ' اگر مجھے غصہ آگیا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے دھمکایا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے جیب سے چاکلیٹ نکالی۔ ''تم میرے کپڑے پریس کردو' یہ تمہاری۔''

''اگر مکر گئے اپنی بات سے تو......؟''

''تم جانتی ہو عائلہ' میں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوکے لاؤ۔'' عائلہ نے جب کپڑے اس سے لیے تو اس نے شرافت سے چاکلیٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھمادی۔

اس روز کے بعد تو جیسے انہیں عائلہ سے کام نکلوانے کا گر آگیا تھا۔ جب بھی کام ہوتا' چاکلیٹ یا چپس کا پیکٹ لے کر آجاتے اور وہ بخوشی ان کے کام کردیتی۔ اور وہ لوگ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ یہ سب تو بس اک دکھاوا ہے۔ وہ ان لوگوں پر ظاہر کرتی گویا ان کے کام وہ چاکلیٹ یا چپس کے لیے کرتی ہے' اگر وہ یہ بات جان لیتے کہ عائلہ الیاس یہ سب اپنے اندر کی بڑھتی ہوئی اداسیوں سے گھبرا کر مصروفیات میں پناہ' ڈھونڈتی ہے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی مگر عائلہ الیاس سمجھ میں آنے والی چیز کہاں تھی۔



ان دنوں بدریامین اور بلاول امتحان کے بعد فارغ تھے۔ بلاول ان چھٹیوں میں کمپیوٹر شارٹ کورس کرنے جارہا تھا جبکہ بدر فل انجوائے منٹ کے موڈ میں تھا۔ ماں چاہتی تھیں وہ بھی بلاول کے ساتھ کورس کرلے مگر وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ ان مصروفیات کے دنوں میں اس کے ہاتھ ایک مشغلہ لگا تھا۔ وہ ہروقت لڑائی جھگڑا کررہا ہوتا اور وہ بھی عائلہ کے ساتھ' کبھی ان کے ہاں تو کبھی جب وہ کسی کام سے ان کے ہاں آتی تب مامی عاجز آچکی تھیں۔

''یہ کیا تماشا لگار کھا ہے بدر تم نے' کیوں بیچاری بچی کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔''

''ہونہہ! بے چاری بچی۔'' وہ دھپ دھپ کرتا نکل جاتا۔

اصل وجہ یہ تھی کہ مامی اسے ہروقت کورس کے لیے منانے کی کوشش کرتی رہتیں اور ایسا انسان جس پر کبھی روک ٹوک نہ ہوئی ہو اور نہ ہی کسی بات کے لیے سختی کی گئی ہو جب اچانک ہی اس پر کسی بات کا دباؤ ڈالا جائے تو وہ چڑچڑا تو ضرور ہوتا ہے اور وہ ہورہا تھا۔ چڑچڑاہٹ غصے میں بدلتی تو پھر وہ عائلہ سے جھگڑتا تھا۔

اس وقت وہ برآمدے میں کرسی پر نیم دراز تھا۔ ٹانگیں چارپائی پر...... پھیلا رکھی تھیں۔ کانوں میں ہینڈ فری سیٹ تھے۔ ارحم اور عالیان اس کے پاس بیٹھے ہوم ورک کررہے تھے جب عائلہ ان کے پاس آبیٹھی بدر نے ایک نظر اسے دیکھا اور ٹانگیں نیچے کرلیں۔

''تم اتنے ضدی کیوں ہو بدر! مان کیوں نہیں جاتے۔ کورس کے لیے۔'' تینوں بھائیوں نے اس کی طرف دیکھا مگر بولا صرف بدر ہی تھا۔

''میری مرضی میں کروں یا نا کروں۔'' وہ اکتایا ہوا تھا۔ پچھلے دو ہفتوں سے ایک ہی بات کی رٹ سن سن کر بے زار ہوچکا تھا۔

''تم خوش قسمت ہو بدر' تمہیں سب لوگ فورس تو کررہے ہیں کچھ کرنے پر' مجھے دیکھو' کوئی بھی کچھ نہیں کہتا جو دل چاہے کروں۔''

''اوہ! خوش قسمتی۔'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم کسے کہتی ہو خوش قسمتی؟''

''پیار کو۔'' عائلہ کے بے ساختہ پن پر وہ چونکا۔

''پیار؟''

''ہاں' پیار۔ وہ پیار جو سب لوگ تم سے کرتے ہیں۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیا تو بدر نے سر جھٹکا۔

''تم یقین کیوں نہیں کرتے۔ سب لوگ تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتے ہیں۔'' اس دفعہ لہجے میں خفگی

تھی۔ ارحم اور عالیان اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ تھے۔

"مجھے اس میں بالکل شک نہیں کہ سب لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کسی انسان کو ایسے کام کے لیے پریشرائز کریں جس میں اس کا رتی برابر انٹرسٹ نہیں۔" اس بار وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا تم شخصی آزادی نامی کسی چیز سے واقف ہو عائلہ الیاس؟"

"رہنے دو بیٹا! مرضی کا مالک ہے یہ' کرے گا تو وہی جو اس کا دل چاہے گا۔ خوامخواہ پتھر سے سر پھوڑنے کا فائدہ۔" مامی سبزی کی ٹوکری لے کر ان کے پاس آگئیں اور ان کے طنز پر وہ اٹھ کھڑا ہوا' انداز میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔

"فار گاڈ سیک امی!" وہ خفگی سے کہتے وہاں سے چلا گیا' جبکہ مامی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔



"پھپھو! پلیز چائے دے دیں۔ آج میری امی مجھے کھانے کے لیے کچھ دینے پر راضی نہیں ہیں۔" بدر درمیانی دیوار پر بیٹھا فاطمہ سے کہہ رہا تھا جبکہ عائلہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے لقمے لے رہی تھی۔ پچھلے تین روز سے وہ نہ تو ان کے ہاں گئی تھی اور نہ ہی اس سے بات کر رہی تھی۔

"تو تم نے ایسی حرکت کی ہی کیوں' جس کی وجہ سے کھانا پانی بند ہو گیا؟" فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اچھل کر نیچے پھپھو کے پاس آگیا۔ عائلہ اٹھ گئی۔

"آپ بھی خفا ہیں؟" اس نے پھپھو سے پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی بدر!"

"اف!!" اس نے بال نوچ ڈالے۔ "مجھے لگتا ہے سب لوگوں نے صرف ضد باندھ لی ہے کہ مجھے مجبور کر کے چھوڑیں گے۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے پھپھو' میں نے کبھی کسی کی بات نہیں ٹالی' اب اگر نہیں مان رہا تو کیوں کوئی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا سوائے فائز بھائی کے۔ اوکے' میں اپنی بات سے پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ کل سے جا رہا ہوں میں بلاول کے ساتھ۔ پلیز اب تو مان جائیں۔ ادھر صبح سے امی کی منتیں کر رہا ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"میرا بچہ' یہ ہوئی نا اچھے بچوں والی بات۔" پھپھو نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"چلو ناشتا کرو۔"

"میں ناشتا کر چکا ہوں۔" وہ اٹھا۔

"ابھی تو کہہ رہے تھے امی نے کھانے کو کچھ نہیں دیا۔" انہوں نے اس کی غلط بیانی پر گھورا تو وہ مسکرا دیا۔ پھر ہینڈ پمپ کے پاس ہاتھ دھوتی عائلہ کو دیکھا اور قدم اس طرف بڑھا دیے۔ پھپھو نے بے ساختہ اس کے بڑھتے قدموں کو دیکھا۔ زیادہ فاصلہ نہ ہونے کے باعث وہ بہ آسانی ان کی آواز سن سکتی تھیں۔

"تم ناراض ہو؟" نیم کے پیڑ سے پتا توڑتے پوچھا۔

"مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم سے ناراض ہوتی پھروں۔" اب وہ رگڑ رگڑ کر پاؤں دھو رہی تھی۔

"کیا کھال ادھیڑو گی؟" پاؤں کی گندمی رنگت سرخ ہوتے دیکھ کر خفگی سے کہا لیکن وہ اس کی بات پر توجہ دیے بنا پاؤں دھوتی رہی۔ "میں دیواروں سے بات نہیں کر رہا ہوں۔" اس کی مصروفیت کو نظرانداز کرتے وہ بولا۔

"میں کل جا رہا ہوں فارم منگوا لیا ہے۔" اس کے جواب نہ دینے پر اس نے خود ہی بتا دیا مگر عائلہ نے تو نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اس کی خاموشی پر بدر کا دل چاہا ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دے۔ بمشکل خود کو کنٹرول کیا۔ عائلہ نے سر اٹھا کر اس کا ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھا۔

"تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ تمہاری زندگی ہے جو چاہے کرو' میں کون ہوتی ہوں تمہارے معاملات میں دخل دینے والی۔"

"چلو۔ اچھا ہوا تم خود ہی سمجھ گئیں۔ اب اپنی

شکل لے کر میرے سامنے مت آنا۔" خفگی سے کہتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا اور وہ اونہہ کر کے رہ گئی۔



بلاول ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا جبکہ بدر سنجیدگی سے اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"یار! سچ میں مزہ آگیا۔ میں جو چاہ رہا تھا' وہ ہو گیا۔" بلاول ہنسی روک کر بمشکل بولا۔ "تم نے مجھے بہت ستایا ہے' امی ہمیشہ تمہاری مثالیں دے کر مجھے شرم دلاتی تھیں۔ میری بہت خواہش تھی تمہیں بھی ڈانٹ پڑے' مجھے معلوم تھا تمہیں ایسے شارٹ کورس میں ذرا دلچسپی نہیں' اس لیے میں نے پلان بنایا اور دیکھو کامیاب رہا۔ خوب' بہت خوب بدر یامین!" بلاول کا چہرہ اس قدر ہنسنے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

بدر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مبارک ہو تم کامیاب رہے۔ مجھے سب سے ڈانٹ پڑ گئی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر پلٹا تو بلاول نے اس کا ہاتھ تھام کر روکا۔

"تم ناراض ہو گئے ہو؟"

"نہیں' بلکہ شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے میرا ٹائم ویسٹ نہیں ہو گا۔" وہ ہاتھ چھڑا کے پلٹ گیا۔

"کچھ زیادہ ہو گیا۔" بلاول نے سر ہاتھ پھیرا۔

"تمہارے ابا کی بہت خواہش تھی کہ ان کی بیٹی اعلا تعلیم حاصل کرے۔" فاطمہ نے اس کے بالوں میں مساج کرتے جانے کس دھن میں کہا۔ عائلہ نے بے ساختہ ماں کا چہرہ دیکھا جو نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔ عائلہ نے بے ساختہ ان کا تیل سے چپڑا ہاتھ چوم لیا' تو وہ یوں چونکیں جیسے نیند سے جاگی ہوں۔

"تو کبھی کہا کیوں نہیں۔" انہوں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی اور حیرت سے اس کے جگمگاتے چہرے کو دیکھا۔ "کیا نہیں کہا؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ گویا انہیں اپنے الفاظ یاد نہیں تھے۔

"ابا چاہتے ہیں نا میں بہت سارا پڑھوں تو کبھی کہا کیوں نہیں؟"

فاطمہ نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔ "جاؤ نہالو۔" وہ اٹھ گئیں۔

عائلہ بہت خوش تھی۔ اسے اپنے ابا سے بہت محبت تھی اور آج ان کی ایک خواہش معلوم ہوئی تھی اور وہ ان کی خوشی کے لیے تو جان بھی دے سکتی تھی۔ یہ تو پھر پڑھائی تھی۔

ویک اینڈ پر فائز بھائی آئے تو ان سے کہہ دیا کہ اسے پڑھنا ہے بھلا انہیں کیا اعتراض ہونا تھا۔ اس نے پرائیویٹ انٹر کی تیاری کی۔ ایگزامز کے دوران وہ واپسی پر سب کو بتاتی کہ اس کے پیپرز بہت اچھے ہو رہے ہیں۔

وہ آخری پرچہ دے کر آئی تھی اور مزے سے لمبی نیند کا ارادہ کر کے لیٹی تھی لیکن اسے لیٹے ابھی دو چار منٹ ہوئے تھے' جب امی کی آواز آئی' وہ فون پر بات کر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ تیزی سے چپل پاؤں میں ڈالتی ہوئی باہر آئی۔

"ابا؟ مجھے بھی بات کرنی ہے۔" وہ ہاتھ بڑھائے فون مانگ رہی تھی۔ وہ انہیں ایگزامز کے متعلق بتانا چاہتی تھی کہ کتنے اچھے ہوئے۔ اس کے چہرے پر خوشی جھلملا رہی تھی جبکہ فاطمہ اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھیں۔ ایک بے خودی سی تھی جو انہیں عائلہ کو دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے خود ہی ماں کے ہاتھ سے فون لے لیا۔

"ہیلو ابا!" خوشی سے نہال' کپکپاتے لب لرز کر مایوسی سے سکڑ گئے۔ کیونکہ دوسری طرف گہرا سکوت تھا۔ یعنی فون کٹ گیا تھا یا پھر کاٹ دیا گیا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن وہ عائلہ الیاس کو بے توقیر کر گئی تھی۔ وہ بے جان ٹانگوں سے نیچے بیٹھی۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ فاطمہ نے اس کا بے رنگ ہوتا چہرہ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کی پیشانی چومی۔

"شاید لائن کٹ گئی۔ وہ پھر بات کریں گے نا تم سے' پتا ہے۔ انہوں نے تمہارے لیے بہت ساری چیزیں

بھیجی ہیں۔ ابھی ایک دو روز میں مل جائیں گی۔" اس کا پھیکا پڑتا چہرہ انہیں اذیت دے رہا تھا۔ اسی لیے بے ربطگی سے بول رہی تھیں اور یہی بے ربطگی ظاہر کر رہی تھی کہ فون ابا نے خود کاٹا ہے۔ مگر وہ ماں کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی، اسی لیے پھیکے انداز میں مسکرا دی۔

"میں جانتی ہوں ابا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" یہ جملہ بولتے ہوئے اس کا دل کیسے کرلایا تھا، یہ بات وہ جانتی تھی یا اس کا رب۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ وہ جی بھر کے رونا چاہتی تھی لیکن رو نہیں سکتی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا فاطمہ ابھی اس کے پیچھے آئیں گی اور وہ واقعی چند لمحوں میں اس کے کمرے میں آگئیں۔ تو اس نے ضبط سے سرخ ہوتی آنکھیں بند کرلیں۔ فاطمہ نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا جو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ــــ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی چھلکی وہ تیزی سے پلٹ گئیں اور عائلہ کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

اگر اس وقت کوئی عائلہ الیاس سے اس کی سب سے بڑی خواہش پوچھتا تو وہ کہتی کہ ایسی جگہ چاہیے جہاں وہ اپنے دکھ اور محرومیوں پر جی بھر کے روئے اور کوئی اس سے نہ پوچھے کہ تمہاری آنکھ نم کیوں ہے۔

آنکھیں رگڑتی وہ چپل پہن کر باہر نکلی، فاطمہ شاید ماموں کی طرف چلی گئی تھیں۔ وہ برآمدے میں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بدر اور بلاول دیوار پھاند کر ادھر آگئے فاطمہ نے ہی انہیں بھیجا تھا۔

"لو! یہ افلاطون کی جانشین یہاں بیٹھی ہے، وہاں پھوپھو پریشان ہو رہی ہیں۔" وہ اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے مگر عائلہ چپ چاپ بیٹھی غیر مرئی نقطے کو گھورتی رہی۔

"ایسے نہ کرو بھئی! تمہاری شکل تو پہلے ہی بن مانس جیسی ہے۔ ایسے منہ لٹکا کر بیٹھو گی تو کہیں ایسا نہ ہو ہم تمہیں ZOO (زو) میں چھوڑنے پر غور کرنا شروع کردیں۔" بلاول نے بدر کو دیکھتے شرارت بھری معصومیت سے کہا مگر وہ چپ رہی۔

"ہیلو میڈم! ہم آپ سے بات کر رہے ہیں۔ کہیں بیٹھے بٹھائے مر مرا تو نہیں گئیں۔" بدر نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو عائلہ نے گلابی آنکھوں سے اسے دیکھا مگر بولی پھر بھی نہیں، گلے میں آنسوؤں کا پھندا اسے بولنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟" بدر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم سے بڑے دکھ میری زندگی میں بھرے پڑے ہیں بدر ریامین!" بھرایا لہجہ، نم آنکھیں، وہ حیران ہی تو رہ گئے۔

"کیا ہوا؟" کیسے دکھ؟" بدر نے سنجیدگی سے پوچھا، تو وہ سنبھلی۔ پچھلے ساڑھے بارہ برس سے وہ کسی کے سامنے نہیں روئی تھی، تو اب کیوں روتی۔ اس نے چہرہ رگڑا وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے بھلا کیا دکھ ہوگا۔" وہ مسکرائی۔

"ڈرامے ان کے سامنے کرنا جو تمہیں جانتے نہ ہوں۔ اب انسانوں کی طرح شرافت سے بتا دو، کون سے دکھ کی بات کر رہی تھیں تم؟" بدر اب ٹلنے والا نہیں تھا۔

"تم ہو نا دکھ بدر ریامین، سب سے بڑا دکھ تو یہی ہے کہ صبح و شام تمہاری شکل دیکھنا پڑتی ہے۔"

"بہت اچھا! اب دوسرے دکھوں کا بھی بتادو۔" اس نے سعادت مندی سے کہا تو عائلہ کی آنکھیں اس کے لب و لہجے پھر سے بھر آئیں۔ بلاول تو گویا ساکت و صامت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا دکھ تھا اس کی پیاری بہن کو؟

"تم جاؤ یہاں سے۔" آنکھیں رگڑتے بدر سے کہا۔ خفگی بھرا انداز تھا۔

"تم جانتی ہو جب تک وجہ نہیں بتاؤ گی میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا، کیوں بلاوجہ خود کو تھکا رہی ہو۔" اس نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

"کیا میں تمہارے معاملات میں مداخلت کرتی ہوں جو تم ٹانگ اڑا رہے ہو۔" اس نے دانت پیستے ہوئے

بدر کو گھورا۔
"تمہاری یادداشت کمزور تو نہیں؟ کچھ عرصہ قبل ہی تو تم نے مجھے کورس کے لیے اکسایا تھا۔" وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔
"میری نہیں... تم نے سب لوگوں کی بات مانی تھی' یہ مجھ پر احسان نہیں ہے۔"
"اوکے... لیوات... تم کس دکھ کا ذکر کر رہی تھیں اور دیکھو جھوٹ مت بولنا اور نہ ہی غلط بیانی سے کام لینا۔" اس نے وارن کیا۔
"تم دفع کیوں نہیں ہو جاتے یہاں سے۔" اگر وہ ایک دوبار پھر سے پوچھتا تو وہ یقیناً "سچ کہہ دیتی' اسی لیے دانت پیستے ہوئے بدتمیزی سے کہا تو وہ چپ رہ گیا۔
"عائلہ! بتاؤ نا پلیز کیا ہوا ہے۔ تم کون سے دکھ کا ذکر کر رہی تھیں۔" بلاول نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے پوچھا تو وہ اس کے شانے سے سر ٹکا کر رو دی۔
"عالی پلیز... بتاؤ نا۔" بلاول نے پریشانی سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں سمیٹتے نرمی سے پوچھا۔
"میرے پیپرز بالکل اچھے نہیں ہوئے' میں فیل ہو جاؤں گی۔" اسے بروقت بہانہ سوجھ گیا۔" بلاول پرسکون ہو تا مسکرا دیا جبکہ بدر بغور اس کا بکھرا انداز دیکھتا رہا۔
اسے رتی برابر یقین نہیں تھا کہ اس کے یوں رونے کے پیچھے یہ وجہ ہوگی۔ کچھ بہت خاص تھا جو وہ چھپا رہی تھی اور وہ اسے یہ کہہ کر مزید دکھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اٹھ گیا۔
"پگلی! بھلا یہ کوئی رونے والی بات ہے' پھر سے ٹرائی کر لینا۔" بلاول نے اس کے آنسو پونچھے اور عائلہ اپنے رب کے صدقے واری جارہی تھی' جو دلوں کے بھید جانتا ہے' جو بندے کو کبھی رسوا نہیں کرتا۔
"تم نے بدر کو ہرٹ کر دیا عالی! اس سے ایکسکیوز کر لینا۔" بلاول اس کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا تو وہ سرہلا کے مسکرا دی۔



دکھ ہے' احساس جرم ہے' کیا ہے
کوئی اندر سے توڑتا ہے مجھے
وہ بالکل ساکت بیٹھی ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو' کیا وہی سچ تھا' جو اس نے سنا؟ فاطمہ کا پرسکون انداز گواہ تھا' یہی سچ ہے۔ الیاس واپس آرہے تھے۔ کبھی واپس نہ جانے کے لیے اور عائلہ کو جب یقین ہو گیا حقیقت یہی ہے تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا تھا' اس سے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی اور یہ بات سب ہی نے نوٹ کی تھی۔
پچھلے چھ ماہ میں ان کی زندگیوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اسماعیل اور فائز کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ فائز شہر ہی میں شفٹ ہو گیا تھا' جبکہ اسماعیل کی بیوی عائشہ وہیں تھی۔ بلاول اور بدر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے چکے تھے۔ عائلہ بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ بدر یامین نے اس سے الجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ عائلہ اب بخوشی ان کے کام کر دیتی' جب وہ بلاول کے کپڑے نکالتی تو بدر چپکے سے اپنے کپڑے بھی رکھ جاتا' اس کا خیال تھا وہ نہیں جانتی مگر عائلہ اس کے کپڑے پہچانتی تھی۔ وہ خود ہی تو اسے یہ موقع دیتی تھی' عائلہ نے خود کو بری طرح کاموں میں الجھا لیا تھا۔
اسے اپنے باپ سے عشق تھا۔ اس کے دکھ اور محرومیاں اسے کھوکھلا کیے دے رہی تھیں۔ کبھی وہ وقت تھا جب الیاس کو بھی بیٹی سے شدید محبت ہوا کرتی تھی لیکن وہ ماضی کا قصہ ہو کر رہ گیا تھا۔ چھ ماہ قبل الیاس چند دنوں کے لیے فائز اور اسماعیل کی شادی کے لیے چھٹی لے کر آئے تھے' پھر فوراً" ہی ان کی واپسی ہو گئی تھی۔ عائلہ جو ان سے ملنے کو بے تاب تھی' ان کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رونا چاہتی تھی۔ جب ان کے سامنے گئی تو اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اگر وہ نفرت سے اس سے منہ موڑ لیتے تو وہ اتنی دکھی نہ ہوتی مگر یہاں معاملہ ہی کچھ عجیب ہوا تھا۔

الیاس نے جب اس کی صورت دیکھی تھی تو جہاں ان کا دل سینے میں پوری شدت سے پھڑپھڑایا تھا وہیں چہرے پر کسی ویران کھنڈر اور زلزلے کے سے آثار نظر آئے تھے اور یہ دیکھ کر عائلہ الیاس کی گویا دنیا ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ اس کے لیے بہت سے تحائف بھیجا کرتے مگر اسے یہ تمام چیزیں نہیں چاہیے تھیں۔ اسے اپنے باپ کے سینے سے لگ کر اپنی محرومیوں کو رونا تھا اور اب وہ ہمیشہ کے لیے واپس آگئے تھے مگر اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ باہر جاتی' چند لمحوں بعد اس نے قدموں کی آہٹ پر جھکا چہرہ اٹھایا تو گویا ساکت رہ گئی۔ الیاس اس کے سامنے تھے۔ وہ خود ہی آگے بڑھے اور اسے سینے سے لگالیا۔ نم آنکھوں سے اس کے ریشمی بالوں کا بوسہ لیا تو وہ یوں بلک بلک کر روئی کہ سب کو ہی رلا دیا۔

الیاس بہت جلد اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتی تھی انکار کردے' ابھی تو اس نے جی بھر کے اپنے ابا سے پیار بھی نہیں کیا تھا مگر ان کے چہرے پر عائلہ کی شادی کے ذکر پر جو اطمینان اور جگمگاہٹ ہوتی تھی وہ عائلہ کو بہت پیاری اور عزیز تھی۔ اس نے انکار کو اندر ہی دبا دیا۔ اگر اس کے باپ کو اس کی شادی سے اطمینان ملتا ہے تو وہ کچھ نہیں بولے گی اور پھر گویا سلسلہ چل نکلا' آئے دن لوگ آجا رہے ہوتے مگر حیرت کی بات تھی' کوئی بھی پلٹ کر نہ آتا۔ عائلہ کا تو معلوم نہیں تھا مگر بدر اکتا گیا اور اسی اکتاہٹ اور جھنجلاہٹ میں ماں کے پاس جا بیٹھا۔

انہوں نے سالن بھونتے اس کا وجیہہ چہرہ دیکھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ فضول قسم کی پریڈ کب ختم ہوگی' آئے دن لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ امی! میں آپ سے بات کررہا ہوں۔'' ان کے جواب نہ دینے پر اس نے پھر کہا۔ وہ اب آٹا گوندھ رہی تھیں۔

''آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ عائلہ خوب صورت' پڑھی لکھی' سلیقہ مند ہے۔ آخر کیا ڈیمانڈز ہوتی ہیں لوگوں کی۔'' وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

صوفیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ضروری نہیں ہے بدر' جو چیز ہمیں اچھی اور مکمل لگ رہی ہو وہ دوسروں کو بھی ایسے ہی لگے۔'' آٹا ڈھک کر ہاتھ دھوتے سنجیدگی سے کہا۔ فرقان صحن میں چارپائی پر افسردہ سے لیٹے تھے۔

''اف! پتا نہیں کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا' تو صوفیہ... فرقان کی چارپائی کی پائنتی پر آ بیٹھیں۔

''فرقان! کیوں نہ ہم بدر کے لیے عائلہ کا ہاتھ مانگ لیں۔''

وہ اٹھ بیٹھے۔ ''میری بھی یہی خواہش ہے' میں بھی چاہتا ہوں اپنی بہن عزیز از جان بہنوئی اور بھانجی کی اتنے برسوں کی تکلیف کا کچھ تو مداوا ہو۔ اگر اسماعیل' ارحم یا عالیان اس کے ہم عمر ہوتے تو میں ایک پل بھی نہ سوچتا مگر بدر کو تم بھی جانتی ہو' اسے ہر چیز بے داغ اور پرفیکٹ چاہیے ہوتی ہے۔ جو انسان بے جان چیزوں کے لیے اتنا جنونی ہو' وہ شریک حیات کے لیے کیا کرے گا۔ وہ میری اولاد ہے اور میں نہیں چاہتا وہ میرے فیصلے پر سر جھکا دے اور پوری زندگی ایک خلش کے ساتھ گزارے۔''

''مگر فرقان! آپ نے دیکھا وہ کتنی پروا کرتا ہے اس کی۔ اب تو لڑائی جھگڑا بھی نہیں کرتا' میں بات کرتی ہوں اس سے۔'' ''نہیں امید تھی۔ وہ چپ رہ گئے۔

اگلی صبح روز جیسی ہی تھی۔ وہ لوگ بدر کے منتظر تھے جو تیار ہو رہا تھا۔ ارحم کالج کے لیے تیار تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو چاروں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ یلو جینز ۔ وائٹ شرٹ میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ''یہ کیا بچوں کی طرح پین استعمال کرتے ہو؟ تم پوائنٹر یا کلپر کیوں نہیں استعمال کرتے۔'' اس نے ارحم کو پین میں سیاہی بھرتے دیکھ کر ٹوکا تو وہ مسکرا دیا۔

''بھائی مجھے پین سے لکھنے میں مزہ آتا ہے' اوچ...!'' اگلے ہی پل اس کا منہ کھل گیا' کیونکہ اس نے پین جھٹکا تھا اور اس کی سیاہی بدر یامین کی شرٹ پر گری تھی۔

"اف..." وہ جھنجلاتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔
چند لمحوں بعد واپسی ہوئی تو شرٹ تبدیل تھی۔
"کیوں بدل لی شرٹ؟ ذرا سی سیاہی تو گری تھی۔" صوفیہ نے بے ساختہ کہا۔
"امی مجھے بے داغ چیزیں پسند ہیں اور میں ان پر کمپرومائز نہیں کر سکتا۔" اور ایسی باتیں تو وہ بچپن سے ہی کرتا آرہا تھا مگر آج سے قبل صوفیہ اور فرقان کو کبھی اتنا دکھ نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ اور وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔



نہ جانے کس کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ عائلہ کا رشتہ ہو گیا تھا لڑکی والے جلد شادی پر زور دے رہے تھے۔ ڈیڑھ ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی سب ہی خوش اور مطمئن تھے، جن میں سرفہرست بدر تھا اس نے تو باقاعدہ مبارک باد دی تھی عائلہ کو فائز اور الیاس اسے شہر لے گئے تھے، جبکہ ارحم اور عالیان بھی فارغ تھے، تو وہ بھی شہر چلے گئے۔ اس روز فرقان، صوفیہ اور بدر پھوپھو کے ہاں تھے جب عائلہ کی ہونے والی ساس لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ ان کے دیے گفٹ لیے چلی آئی اور تمام گفٹ حیران پریشان الیاس کے قدموں میں پھینکے۔
"حد ہے دوغلے پن اور منافقت کی۔ خدا کی پناہ! ایک میرا ہی بیٹا ملا تھا تم لوگوں کو اپنی بدکردار بیٹی کے لیے۔" ان چاروں کے چہرے سرخ پڑ گئے لیکن بدر بم کی طرح پھٹا تھا۔
"آپ نے ایک لفظ بھی اور کہا تو میں آپ کی عمر کا لحاظ کیے بغیر آپ کو اٹھا کر گلی میں پھینک دوں گا۔" اور وہ انہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتی پلٹ گئیں۔
"انکل! آپ کو اس خاتون کا منہ توڑنا چاہیے تھا۔" اس نے بہت خفگی سے، سر ہاتھوں پر گرائے الیاس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تو فرقان نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم جاؤ یہاں سے بدر۔"
ان کے لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس سے اس لہجے میں بات کر رہے تھے۔ وہ لب بھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ رات گئے واپسی ہوئی تب بھی غصہ کم نہیں ہوا تھا اور اس نے آتے ہی وہی بات کہی تھی، صوفیہ اسے بازو سے تھامتے ہوئے کمرے میں لے گئیں۔ فرقان تھکے قدموں سے ان کے پیچھے آئے۔
"آپ لوگوں کو اس عورت کا منہ توڑنا چاہیے تھا بابا، جس نے ہماری عزت اچھالنے کی کوشش کی۔" اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ فرقان نے اس کی طرف دیکھا۔
"کس منہ سے اس کا منہ توڑتے بدر۔" ان کے لہجے میں دکھ اور اذیت تھی اور بدر یامین کے سر پر گویا چھت گری تھی۔
"میں تمہیں بتاؤں بدر یامین۔" ان کی آواز بلند ہوئی، بدر بت بن گیا۔ "وہ ایک کم ظرف عورت تھی، بلکہ وہی کیا ہم سب، پورا معاشرہ سب کم ظرف لوگ ہیں۔ گناہ کرنے والے کا گریبان نہیں پکڑتے، معصوم کو سنگسار کرتے ہیں۔ آج اگر وہ بچی اس کے والدین پل پل جی اور مر رہے ہیں تو قصوروار وہ نہیں ہم ہیں۔ گناہ گار وہ نہیں، یہ گندا ہوس بھرا حیوانوں کا معاشرہ ہے، تم میں، ہم سب گناہ گار ہیں، عائلہ الیاس کے۔" وہ ہانپ گئے ان کی آنکھیں نم اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
کیسا بھیانک دن تھا جب وہ چھ سالہ بچی کسی حیوان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اور فاطمہ اور الیاس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ الیاس اس سب کے لیے خود قصوروار سمجھتے تھے۔ عائلہ ان کی ذمہ داری تھی۔ اس کی حفاظت ان کا فرض تھا اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر چکے تھے اور اس کوتاہی کی سزا انہوں نے اپنے آپ کو خود دی تھی۔
وہ بچی کی صورت دیکھے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عائلہ سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ خود

سے ناراض تھے۔ غصہ خود پر تھا اور اس کی سزا انہوں نے خود کو دی' وہ مسقط چلے گئے۔ وہ جب تک بیٹی کی صورت نہ دیکھ لیتے ان کی صبح نہیں ہوتی تھی اور ان کے لیے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اس کی صورت دیکھنے کو ترس جائیں۔ وہ اس سے بات نہیں کرتے تھے' کیونکہ جانتے تھے اگر اس کی آواز سن لی تو خود کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جائے گا اور فائز' اسماعیل کی شادی کے بعد جب وہ واپس گئے تو فرقان نے فون پر انہیں بے نقط سنائی تھیں۔

''تم کیوں اس بچی کو سزا دینے پر تلے ہوا الیاس! بارہ برس سے میں اسے پل پل مرتے دیکھ رہا ہوں' اسے تمہاری محبت اور شفقت کی ضرورت ہے۔ مت سولی پر لٹکاؤ اسے' اگر تمہیں اس سے ذرا بھی محبت ہے تو لوٹ آؤ۔ اس سے قبل کہ کچھ انہونی ہو جائے۔'' اور وہ لوٹ آئے۔



''فاطمہ!'' الیاس نے بہت دھیمے سے بیوی کو پکارا۔ تین گھنٹے کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد انہوں نے نم آنکھوں سے بیوی کو دیکھا اور ان میں تو ہمت ہی نہیں تھی کہ الیاس کا دھواں دھواں چہرہ دیکھیں۔

''میں نے ان ساڑھے بارہ برسوں میں اپنی بیٹی کے لیے مقدس جگہ دعا مانگی ہے۔ اس کے اچھے مستقبل کی' خوشیوں کی' ہر سانس کے ساتھ اس کی خوشیوں کی بھیک مانگی ہے' کیا اتنے برسوں میں کوئی ایسا پل نہیں آیا ہو گا جو قبولیت کا ہوتا۔ میں نے جب بدر کو دیکھا اسے اپنی بیٹی کے ساتھ سوچا۔ بہت دعائیں مانگیں' بدر میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو میں اپنے داماد میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ رشتوں کو مقدس فریضہ سمجھتا ہے اور ایسے لوگ کبھی اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کرتے لیکن جب اس کی عادتیں دیکھیں تو یہ آس خود ہی توڑ دی۔'' وہ شریک حیات سے دل کی بات کہہ رہے تھے۔ فاطمہ کی جھکی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

''میری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی' جب اس کا رشتہ ہوا تو مجھے لگا تھا اتنے برسوں کی ریاضت رنگ لے آئی ہے۔'' وہ بے حد دل گرفتہ لگ رہے تھے۔ ''جانے کن گناہوں کی سزا ہے' جس کی معافی ہی نہیں مل رہی۔ فاطمہ! میں نے کبھی کسی کی بہن' بیٹی کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھا' تو یہ سب میری بیٹی کے ساتھ کیوں ہوا۔ میں زندہ بھی نہیں رہنا چاہتا۔'' فاطمہ نے بوکھلا کر ان کا چہرہ دیکھا۔

''میں اپنی بیٹی کو بے جرم و خطا سنگسار ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکلے۔ فاطمہ بھی ان کے پیچھے ہی نکلی تھیں مگر ان کے بھاگتے قدموں کا مقابلہ فاطمہ کے بس میں نہیں تھا۔ وہ بہتے اشکوں سے فرقان بھائی کے گھر بھاگیں۔

میں شجر شہر ملال کا' میری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں' کسی ابر جام میں ڈال کر

مجھے خار خار مسافتوں کی ستم گری نے تھکا دیا
مجھے منزلوں کا پیام دے میرے حوصلوں کو بحال کر



آج دلہن بنی عائلہ الیاس' سب کے دلوں کو اطمینان اور سکون دے رہی تھی۔ خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کی موجودگی میں وہ سادگی سے رخصت ہو کر ایک دیوار کے فاصلے سے ماموں کے گھر دلہن کے روپ میں بدر یامین کے کمرے میں موجود تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے قدموں کی چاپ بیڈ کے پاس معدوم ہو گئی۔

وہ اس کے سامنے بیٹھا اور ہولے سے گھونگھٹ اٹھایا۔ خوب صورت تو ہمیشہ سے تھی لیکن دلہن بن کر اس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ بدر نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر نازک سی رنگ انگلی میں پہنادی۔ اس کے لمس میں نرمی' اپنائیت اور محبت کے رنگ تھے۔

''عائلہ یامین! نئی زندگی کی خوب صورت شروعات کے موقع پر بہت ساری دعاؤں اور نیک خواہشات کے

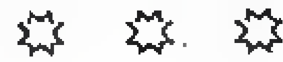
ساتھ' بدر یامین آپ کی خدمت میں آداب بجالاتا ہے۔" اس نے شرارت سے کہا تو عائلہ ساکت سی یک ٹک اسے دیکھتی گئی۔

یہ وہ بدر تو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ بہت نرم لہجے میں بات کرنے والا حساس اور مخلص' بدر نے گہری سانس لیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"دکھ کی کالی رات چاہے جتنی بھی کالی اور لمبی ہو اس کا خاتمہ' صبح کی پُرنور کرنیں خوشیوں کی صورت میں کرتی ہیں۔ میں آج تمہارے روبرو سچے دل سے رب کو حاضر ناظر جان کر ایک بات کہہ رہا ہوں' نہ میں نے تم سے ہمدردی کی ہے' نہ ترس کھایا ہے' یہ فیصلہ میں نے اپنی دل کی ایما پر کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تمہارے لیے چاند تارے توڑ لاؤں گا' نہ ہی دولت کے انبار تمہارے قدموں میں لگادوں گا لیکن ایک وعدہ میں ضرور کررہا ہوں' تم میری عزت ہو' کسی کو تم پر انگلی اٹھانے نہیں دوں گا۔ ہم ماضی بھلا نہیں سکتے سدھار نہیں سکتے لیکن مستقبل سنوارنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے عائلہ کے جھکے سر اور ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے عائلہ۔" اس کے آنسو پونچھتے نرمی سے پوچھا تو اس نے بے ساختہ سر کو نفی میں جنبش دی۔

"مجھے آپ پر بھروسا ہے۔" اس کے لہجے میں سچائی بول رہی تھی۔



فرقان' بدر کو تمام سچائی بتانے کے بعد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اٹھے تو اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھا اور ان کے ہاتھ تھامے تو انہوں نے بھیگے چہرے سے شکوہ کناں نگاہ اس پر ڈالی۔ (کیا ہوجاتا اگر ان کا بیٹا اس قدر چوزی نہ ہوتا' تو وہ اپنی بھانجی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے۔ کچھ نہ کچھ تو ان کے دکھ کا مداوا ہوتا۔)

بدر نے ان کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ "میں شادی کروں گا عائلہ سے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ دونوں حیران رہ گئے۔

"تم...." بے یقینی سے پوچھا۔

"جی میں.... وہ میرے گھر کی عزت ہے۔ آپ لوگ بات کریں پھوپھو اور انکل سے۔" (کیا دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں) فرقان اس کا چہرہ تکتے حیران تھے۔

"بدر! تم کیسے؟" صوفیہ خدشوں میں گھری بے یقینی سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیوں امی! میں کیوں نہیں۔" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

"تم نے بچپن سے اب تک ہر چیز مکمل اور بے داغ استعمال کی ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ ایک دو دن پہلے تم نے ذرا سی سیاہی گرنے پر شرٹ بدل لی تھی۔ آج تم جذباتیت اور ہمدردی میں رشتہ جوڑ بھی لو تو کیا گارنٹی ہے کہ تم پوری زندگی بخوشی اس کے سنگ گزار دو گے۔" صوفیہ نے صاف گوئی سے اس کی شخصیت کو مدنظر رکھتے خاصے چبھتے لہجے میں کہا مگر وہ غصے کے بجائے مسکرا دیا۔

"آپ کی تمام باتیں سچ اور درست مگر میری پیاری امی جان! عائلہ کوئی چیز نہیں ہے جسے میں ذرا سا خراب یا میلا ہونے پر اٹھا کر پھینک دوں گا۔ وہ جیتا جاگتا سانس لیتا وجود ہے' وہ میرے گھر کی عزت ہے اور آپ تو جانتی ہیں بدر یامین جذباتی ہونے والے انسانوں میں سے نہیں۔ آپ اتنا تو مجھے جانتی ہی ہوں گی' رہی بات ہمدردی کی تو بھلا میں کیوں ہمدردی کروں گا اس کے ساتھ۔ بھلا کیا کمی ہے اس میں' اگر میں یہ فیصلہ کررہا ہوں تو پوری دلی رضامندی سے' آپ کے تمام خدشات بے بنیاد ہیں۔ اپنے بیٹے پر اتنا تو بھروسا رکھیں۔" اس نے شرارتاً خفگی سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

تب ہی حواس باختہ سی فاطمہ وہاں آئیں تو پوری بات سنے بنا بدر یامین اور فرقان باہر بھاگے تھوڑی ہی

دیر میں وہ الیاس کو واپس لے آئے تھے اور بہت عقیدت سے انہوں نے عائلہ کا ہاتھ مانگا تھا۔ ان لوگوں کو بھی وہی خدشات ستارہے تھے جو صوفیہ کے تھے مگر انہوں نے بہت سلیقے سے ان کے خدشات کو دور کردیا تھا۔

شادی کی جو ڈیٹ فکس تھی اسی پر بدر اور عائلہ کا نکاح اور رخصتی ہوئی تھی۔ پانچ لوگ واقف تھے کہ عائلہ کی شادی کس سے ہورہی ہے خود عائلہ کو بھی عین نکاح کے وقت حقیقت معلوم ہوئی تھی تو ایک پل کے لیے وہ حیران رہ گئی تھی۔ سب ہی خوش تھے' مطمئن تھے' بدر یامین' عائلہ اور الیاس کی زندگی میں دعاؤں کی صورت آیا تھا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"جو بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔ یاد رکھو تو صرف آنے والا کل جس میں بدر یامین تمہارے ساتھ ہے اور بدر یامین میں چاہے لاکھ برائیاں سہی لیکن وہ خود سے وابستہ رشتوں کے معاملے میں بہت کھرا اور پوزیسو ہے۔" عائلہ نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

اگر ہمدردی نہیں تھی اور ترس بھی نہیں کھایا تو شادی کیوں کی؟ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"ارے!" بدر ہنس دیا' پھر شرارتاً" اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" عائلہ نے جھینپ کر سر جھکالیا۔

"محبت وحبت کچھ نہیں تھی بھئی۔" بدر نے اپنی بات پر زور دیا۔ "میں نہیں جانتا وہ کون سا جذبہ ہے جس کی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔" وہ سنجیدہ ہوا۔ "تمہیں یاد ہے ایک بار تم اپنے دکھوں کا ذکر کرکے روئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا تم کس دکھ کی بات کررہی تھیں مگر ہاں اس وقت میں نے بہت صدق سے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ عائلہ الیاس کی زندگی میں کوئی دکھ نہ آئے۔ اس کی آنکھ کبھی نم نہ ہو اور اب جب تم میری شریک حیات بن گئی ہو تو تمہیں خوش رکھنے کی ذمہ داری میری ہے اور میں خود کو تمہارے سنگ پاکر خود کو بہت مکمل محسوس کررہا ہوں۔"

وہ نہیں جانتا تھا' اس نے کس بنیاد پر عائلہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا مگر رب جانتا تھا' ایسا کیوں ہوا تھا۔ وہ کسی کی دن رات کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ مانگنے والے نے بہرحال بیٹی کی خوشی مانگی تھی اور دینے والے نے کرم کی برسات کردی تھی۔

ادھر فاطمہ اور الیاس شکرانے کے نوافل ادا کررہے تھے' دکھ کی لمبی مسافت کے بعد صبح کی پرنور کرنیں ــــ ان کی زندگی میں خوشیاں بھرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ ان کی تمام دعائیں قبولیت کی سند پاچکی تھیں تو رب ذوالجلال کے سامنے سر جھکانا تو ان کا فرض تھا اور دور آسمانوں میں وہ مہربان دوست آج جیسے سرخرو ہوچکا تھا' کرنوں کی صورت' بے تحاشا پیار لٹا کر جیسے خوشی کا اظہار کررہا تھا۔

میرے رب کی محبت کا بھی انداز نرالا
سب دے کر بھی کہتا ہے' ہے کوئی مانگنے والا

امتل عزیز شہزاد

ستارۂ آشوب

ایک ڈھلتی عمر کی عورت سڑک پار کرتے ہوئے ایک لڑکی کو دیکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ماڈرن عورت ہے۔ وہ اسے چلا کر رکنے کے لیے کہتی ہے لیکن وہ دونوں سڑک پار کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔

وقار صاحب کے دو بچے ہیں۔ اجیہ اور سائر.... وہ سائر کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔ ان کی سالی مہ پارہ خاص طور پر لندن سے اس شادی میں شرکت کرنے آئی ہیں' اجیہ وقار صاحب کو بتاتی ہے کہ سائر اس شادی سے ناخوش نظر آتا ہے۔ وقار صاحب یہ سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اجیہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ دو ماہ کی تھی جب اس کی ماں چلی گئی۔ وہ اپنی خالہ مہ پارہ سے پوچھتی ہے' اس کی ماں کیسی تھیں۔ مہ پارہ بتاتی ہیں کہ اس کی ماں بہت خوب صورت تھی بالکل کانچ سے بنی مورت۔ وقار صاحب کی بہنیں بھی انہیں احساس دلاتی ہیں کہ سائر اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ تب وقار صاحب سائر سے براہ راست بات کرتے ہیں کہ سائر کہیں اور انٹرسٹڈ تو نہیں ہے۔ تب سائر کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور وہ اپنے باپ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا۔

سائر کی شادی میرب سے ہو رہی ہے۔ میرب دو سال کی تھی جب ان کی ماں بھی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے اس کے بعد شادی نہیں کی۔ ان کے پڑوسی اور دوست احمد سعید اور ان کی بیگم نے میرب کا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا سعید صاحب کی بیٹی ماریہ کی میرب سے گہری دوستی ہے ان کا ایک بیٹا عاشر ہے جو اجیہ کو پسند کرتا ہے شادی کی

مکمل ناول





تقریبات میں سائر کا رویہ بہت اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ شادی کی رات بھی وہ میرب سے بہت رکھائی سے پیش آتا ہے۔ وہ میرب سے کہتا ہے کہ وہ اس سے صرف وفاداری کی توقع رکھتا ہے اور اسے اپنی بہن اور والد کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔

اجیہ کی دوست شیننا بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کا بھائی آغا شایان اجیہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اجیہ بھی اس کی طرف مائل ہے۔ جبکہ میرب کا بھائی سعد' اجیہ کو پسند کرتا ہے۔

سائر کا رویہ میرب کے ساتھ بہت عجیب ہے۔ وہ معمولی باتوں پر شدید ردعمل ظاہر کرتا ہے۔' وہ کہتا ہے کہ وہ کسی بھی لڑکے سے بات نہ کرے۔

وہ عورت جس نے سڑک پر مہ پارہ کو دیکھا تھا۔ ایک خستہ فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں سے کوئی پرانا پتا نکال کر مہ پارہ کے گھر جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ مہ پارہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ لیکن وہاں کے مکین اسے وقار صاحب کے گھر کا پتا دے دیتے ہیں۔

تب وہ کہتی ہے وقار آج سے سالوں پہلے تم نے جو اذیت مجھے پہنچائی تھی' اس کے بدلے کا وقت آپہنچا ہے۔"

شیخ عبدالحمید کریانہ فروش ہیں۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں' نازو' چندا اور مانو۔ چندا کا مزاج اور صورت سب سے الگ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے اور پڑھائی کے بجائے دوسری رنگا رنگ سرگرمیوں میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کی لاڈلی ہے۔ کالج میں ایک ڈرامے میں قلوپطرہ کا کردار کرتی ہے تو آصف شیرازی اسے ٹی وی پر اداکاری کی آفر کرتا ہے۔ وہ ایک ڈائریکٹر شکیل ملک کا ملازم ہے۔ اس آفر پر چندا بہت خوش ہوتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے گھر والے کبھی اسے ٹی وی پر کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور شادی کرکے رخصت کردیں گے۔ وہ آصف شیرازی سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرلو یہ اصلی شادی نہیں صرف ایک معاہدہ ہوگا۔ میں گھر والوں کے چنگل سے نکل آؤں گی۔ آصف مان جاتا ہے۔

میرب سائر کے رویے سے بہت پریشان ہے۔ وہ عاشر سے بات کرنے کو منع کرتا ہے۔

اجیہ کا تعلق آغا سے بہت بڑھ چکا ہے۔ دونوں ملاقاتیں کررہے ہیں۔ ادھیڑ عمر عورت اجیہ کو فون کرکے بتاتی ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اجیہ کی ماں سے ملاقات بھی کرا سکتی ہے۔

پانچویں قسط

"میری حدیں مجھے مت بتاؤ۔ بس میری بات مانو اور مجھے بخش دو۔" اس نے ہاتھ جوڑے۔

جمیل کو بے طرح تاؤ چڑھا اس کے انداز پر۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا' سائیڈ پر رکھا فون بج اٹھا۔ اس نے چندا کو گھورتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کی بات سن کر اک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری اور "اچھا ہم آتے ہیں۔" کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

"تمہارے گھر سے فون تھا۔ تمہارے ابا میاں کا انتقال ہوگیا ہے ابھی کچھ دیر قبل۔ فوراً" چلنا ہے ہمیں۔" وہ اسے مطلع کرکے لاؤنج عبور کرگیا۔

کوئی چیز چھناکے سے اس کے اندر ٹوٹی تھی اور اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔

"ابا۔ ابا۔ یہ کیسے ہوگیا میرے اللہ۔" وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر صوفے پر بیٹھتی چلی گئی اور کمرے میں ان کی لڑائی بغور' مگر خاموشی سے سنتا سونو اس کے رونے پر گھبرا کر بے ساختہ اٹھ بیٹھا۔

"زینت بی' ممی کو کیا ہوا؟؟"

"بس بیٹا۔ اللہ انہیں صبر اور عقل دے' تم سو جاؤ صبح تمہیں اسکول بھی جانا ہے۔" زینت بی نے اک ٹھنڈی افسردہ سانس لے کر کہا۔

"مگر زینت بی! ممی بڑی زور زور سے رو رہی ہیں۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"میرے بچے کسی پیارے کے بچھڑ جانے کا دکھ انسان کو یونہی پگھلا دیتا ہے۔" وہ اسے پچکار کر لٹاتے

ہوئے بولیں۔ "اور اب مزید باتیں نہیں' اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ' شاباش۔" اور وہ اتنا فرماں بردار تو تھا ہی کہ ان کی بات مان جاتا۔



لا متناہی سوچوں کا سلسلہ تھا اور میرب لب بھینچے خاموشی سے بظاہر LED پر نگاہیں جمائے ٹویٹر پر براجمان تھی۔ تب ہی پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ کچھ چونک کر جیسے ہوش میں آئی اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو السلام علیکم!" اس نے اپنی مخصوص نرم آواز میں کہا۔

"میں میرب سے بات کر سکتا ہوں؟" دوسری طرف سے آتی آواز نے میرب کا پورا وجود جھنجوڑ کر سراپا سماعت بنا دیا۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔

"ہیلو؟" دوسری جانب سے کسی قدر بے زاری سے کہا گیا۔

"جی... میں بات کر رہی ہوں۔" اس نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔

"میں سائر بات کر رہا ہوں۔" اس کے بعد دونوں طرف خاموشی۔ گویا کہنے سننے کو کچھ نہ ہو۔

"ہیلو میرب! میں سائر بات کر رہا ہوں۔" اس نے دوبارہ بتایا۔

"جی پہچان گئی ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟" آنکھوں میں آنسو تو آگئے' مگر لب پر بے رخی کا شکوہ لانے کی جرات نہ ہوئی۔

"کیسی ہو؟"

"جی رہی ہوں۔" آنکھ سے بہتے آنسو بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے صاف کیے۔ دائیں ہاتھ میں ریسیور تھام رکھا تھا۔

"ہوں!" اس نے جواباً "ایک سنجیدہ سا ہنکارا ابھرا۔

"طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"گھر آنے کے متعلق کیا سوچا ہے؟"

"جی؟" اس نے بڑی بے یقینی سے اس کی بات سنی۔

"میں لینے آؤں یا خود آجاؤ گی؟" وہ یوں بولا گویا معمول کی بات ہو۔ میرب کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ نہ اپنے کیے پر شرمندگی کا اظہار نہ معذرت... اسے واپس گھر جانا ہی تھا' مگر اس طرح بے وقعت ہو کر نہیں۔

"جواب دو میرب۔"

"میں کیا کہوں۔" وہ بے بسی سے رو دی۔

"دیکھو میرب' میں بہت پریکٹیکل قسم کا انسان ہوں' تمہارا یہ رونا دھونا مجھے کوفت میں مبتلا کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے انداز زندگی میں میچورٹی لاؤ۔" وہ اکتا کر بولا۔

"معذرت کی توقع رکھنا بچکانہ سوچ ہے؟" وہ بول ہی پڑی۔

"کس بات کی معذرت؟" وہ اچنبھے سے بولا۔

"یہاں میں دن رات کے ہر لمحے پور پور سلگی ہوں اور آپ پوچھ رہے ہیں کس بات کی معذرت؟" وہ سلگ کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آئم سوری اور اب مزید کوئی بات نہیں میں کل شام میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔ تیار رہنا۔" اس نے بے لچک انداز میں گویا حکم سنا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ فون کریڈل پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے ارے' کیا ہوا؟" سعدیہ بیگم گھبرا کر کچن سے نکل آئی تھیں۔

"کیا ہوا بیٹا کس کا فون تھا؟" وہ گھبرا کر بولیں۔

"سائر کا۔" اس نے رونے کے درمیان بتایا۔

"اللہ خیر کرے' کیا کہہ رہا تھا۔" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر دہل کر بولیں۔

"مجھے لینے آرہے ہیں کل۔" اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

"اچھا!" وہ خوش گوار حیرت میں گھر کر بولیں۔

"ارے بیٹا تو اس میں اس قدر رونے کی کیا بات ہے۔"
وہ اس کا پیار سے سر اپنے کندھے پر رکھ کر بولیں۔
"آنٹی! اس نے میری کردار کشی کی' میری تذلیل کی۔ اتنے دن پلٹ کر نہیں پوچھا اور اب جب مجھے فون کیا ہے تو اس نے اپنے سلوک پر مجھ سے معذرت کرنا تک ضروری نہیں ۔۔۔ سمجھا میرے جتانے پر جسٹ آئم سوری کہہ دینے سے کیا میرے زخموں کا ازالہ ہو سکتا ہے؟" وہ ان سے تھوڑی دور ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔
"میری جان' ہمارے معاشرے میں تو مرد کا یہ سلوک بے حد عام ہے۔ وہ ظلم و زیادتی روا رکھتے وقت عموماً اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے اور جو اپنے تئیں حق پر ہوں وہ معذرت کیوں کرنے لگے؟" انہوں نے طنزیہ کہا۔
"مگر آنٹی! اگر کوئی ناخواندہ' اسچور شخص ایسا رویہ روا رکھے تو شاید حیرت نہ ہو مگر سائر۔۔۔ وہ تو اک پڑھے لکھے باشعور انسان ہیں۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟"
"بیٹا! مرد کی فطرت بڑی عجیب ہے اور پھر بات کچھ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے کا دستور کچھ ایسا ہے کہ غلطی ہونے پر بھی مرد معذرت نہیں کیا کرتے اور اکثر غلطی پر نہ ہونے کے باوجود بھی عورت کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس نے تم سے معذرت نہیں کی تو کیا ہوا۔ تمہیں فون تو کر لیا نا۔۔۔ ہو سکتا ہے تم سے سوری کرنے پر اس کی انا آڑے آ گئی ہو۔ مرد بہت انا پرست ہوتا ہے۔ عورت کو بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر ان کے بیچ سے یہ انا کی دیوار گرتی ہے۔" وہ اسے پیار سے سمجھاتی رہیں۔
"مگر آنٹی! انہوں نے مجھے خود میری ہی نگاہوں سے گرا دیا۔ کیا میں یہ بات بھول سکتی ہوں؟" وہ زخمی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر بولی۔
"شادی شدہ زندگی میں ایسے کئی مقام آتے ہیں اور گھر بنانے کے لیے تو عورت ہمیشہ سے ہی اپنی انا' اپنا دل' اپنا وقار' پس پشت ڈالتی آئی ہے۔" اب وہ کچھ متاسف سی ہو گئیں۔
"مگر آنٹی میرا دل نہیں مان رہا۔"
"دل کو سمجھاؤ بیٹی۔۔۔ دل کو سمجھانا آسان ہے۔ لوگوں کو سمجھانا مشکل۔ سوچو ذرا! اپنی اس حالت میں یہاں رہنے کی توجیہہ کس کس کو بتاؤ گی۔ خدانخواستہ ہمیں تمہارے یہاں رہنے پر اعتراض ہرگز نہیں بلکہ بے حد خوشی ہے مگر یہ خوشی ادھوری ہے بیٹی۔۔۔ کہ والدین تو بیٹیوں کو ہمیشہ ہی اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے پیار سے اس کی تھوڑی چھو کر کہا۔
"خواہ بیٹیاں ہنسنے بسنے کے لیے اپنی جان گنوا دیں؟"
اس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔
"ایسا کیوں سوچتی ہو۔ ابھی تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور پھر شروع شروع میں چونکہ ہم آہنگی نہیں ہوتی تو جھگڑے ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ جھگڑے ہی تو تعلق کو مضبوط بناتے ہیں نا بیٹی۔ اور پھر اب تو تمہارا تعلق اپنے شوہر سے مزید مضبوط ہونے جا رہا ہے۔ اب دیکھو نا سائر نے اتنے دن سے فون نہیں کیا اور یہ خبر سنتے ہی سب کچھ بھلا کر آخر تمہیں کال کر ہی لی نا۔۔۔ اس نے ہاتھ بڑھایا ہے اب اس کو تھامنا تمہارا کام ہے۔"
"مگر میں کل جانا نہیں چاہتی۔۔۔ کل ماریہ کے سسرالیوں نے آنا ہے۔" وہ نیم رضامندی سے بولی۔ اس نے سوچا واپس تو جانا ہی ہے پھر بحث و تمحیص کا فائدہ؟
"آ جائیں گے وہ بھی' مگر پہلے تم اپنا گھر دیکھو۔" انہوں نے کہا تو وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی۔



"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر آپ ہمارے ساتھ ہی رہتی ہوتیں تو زندگی کتنی آسان اور مزے دار ہوتی۔" اجیہ گہری سوچ میں مستغرق' خستہ حال کرسی پر بیٹھی گل سے مخاطب تھی۔
"حق ہا۔۔۔" ایک آہ سی اس کے لبوں سے خارج

ہوئی۔ ''سوچتی تو میں بھی دن رات یہی ہوں۔ تمہارے اور اپنے بیٹے کا بچپن' لڑکپن کو بھی ترس ہوں۔ یقین کرنا اجیہ! راتوں کو چیخیں مار مار کر تم دونوں کو پکارا کرتی تھی' کہیں کسی بچے میں تم دونوں بچوں کی شباہت نظر آجاتی تو اسے چوم چوم کر سرخ کردیتی تھی۔ اس آدمی نے میرا دل نوچ ڈالا تھا اجیہ! پھر اس کے بعد مت پوچھو میری بعد کی زندگی اس ادھڑے ہوئے دل کے ساتھ کیسے بسر ہوئی؟''

پہلے چہرہ سرخ ہوا' پھر آواز لڑکھڑائی' اب وہ اونچا اونچا رونے لگی۔ اجیہ جیسے کسی ٹرانس سے باہر آئی تھی۔

''اف۔'' اسے اپنی حماقت پر جی بھر کر افسوس ہونے لگا۔ ''میں بھی نا' پوری احمق ہوں۔ کیا ضرورت تھی یہ بات نکالنے کی۔ جانتی بھی ہوں امی کتنی پٹی ہو جاتی ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔

تپائی پر رکھے ہوئے جگ میں سے پانی گلاس میں انڈیلا اور اس کے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔

''نہیں اجیہ' میرے سینے میں لگی یہ آگ اس پانی سے نہیں بجھے گی۔'' اس نے گلاس ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے کہا۔

''امی پلیز۔ آپ روئیں تو مت۔ میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔'' گلاس ٹیبل پر پٹخ کر وہ خود بھی جھنجلا کر رو پڑی۔

''آپ نہیں جانتیں آغا بہت غصے میں ہے' بھابھی کی وجہ سے میرا معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے بات تک نہیں کررہا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ ہونٹ چبانے لگی۔ آنکھوں سے ہنوز آنسو رواں تھے۔

''دل کڑھتا ہے تمہاری بے بسی دیکھ کر' تمہاری زندگی کا یہ حال اسی آدمی نے بنایا ہے۔'' وہ زہر آلود ہو کر بولی۔

''نہیں چھوڑیں' مجھے بتائیں میں کیا کروں۔'' اس نے بات کاٹ کر کہا۔

''میں تو کہتی ہوں ابھی اسے جانے دو' آرام سے بعد میں۔۔۔''

''بعد وادمیں کچھ نہیں' مجھے اس سے شادی کر کے اس کے ساتھ ہی جانا ہے۔'' وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

''بس تو پھر کرو آرام سے انتظار اپنی 'بھابھی' کے واپس آنے کا۔'' وہ بری طرح چڑ کر چبا چبا کر بولی۔

''مگر کتنا انتظار۔ انہیں گئے تقریباً''مہینہ تو ہو ہی گیا ہے۔''

''انتظار تو کرنا ہی پڑے گا' میں تمہارے باپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔

''جتنی اچھی طرح آپ انہیں جانتی ہیں۔ کاش وہ بھی آپ کو جان جاتے۔'' اس کی آواز میں کسک تھی۔

''وہ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا۔'' گفتگو کا رخ پھر وہیں

مڑ گیا تھا۔
اجیہ اپنی پریشانی میں گم تھی۔۔۔ گل اپنی فکر میں مبتلا۔

☼ ☼ ☼

شیخ صاحب کے انتقال کو ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ چندا کے وجود کو گہری اداسی کی چادر نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ گم صم اور افسردہ تھی۔
جمیل کو چونکہ بہت ہی ضروری دورے پر بیرون ملک جانا تھا۔ سو وہ آج کل ملائیشیا گیا ہوا تھا۔ سونو چندا کو چپکے چپکے دیکھا کرتا۔ وہ نکھری ستھری 'ریشمی سرسراتے لباسوں میں ملبوس 'خوشبو بکھیرتی جگمگاتی چندا تو کہیں کھو ہی گئی تھی ان دنوں۔۔۔
سونو زینت بی سے کہتا۔ ''زینت بی! مما اتنی اپ سیٹ کیوں رہتی ہیں۔ پہلے کی طرح کلر فل ڈریسز بھی نہیں پہنتیں۔''
''بیٹا۔۔۔ دل کے موسم پر خزاں اتری ہو تو وجود پر بہار نہیں آسکتی۔ آپ کی مما کے ڈیڈی 'آپ کے نانا اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے ہیں نا' اس لیے آپ کی مما اداس ہیں۔'' وہ اسے پیار سے سمجھاتی۔
''مگر زینت بی! مجھے اداس مما بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' اس نے منہ بسور کر بتایا۔
''تو آپ نے اپنی مما کی اداسی دور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔''
''یہ کیسے کرتے ہیں۔'' اس نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ انہیں بے ساختہ اس کا گال چومنا پڑا۔
''اپنی مما کے پاس جاؤ ان سے باتیں کرو' انہیں اپنی اسٹوری بکس میں سے اسٹوری سناؤ۔ کوئی پوئم سناؤ۔''
''اس سب سے ان کی اداسی دور ہو جائے گی؟'' وہ انہیں دیکھ کر پوچھنے لگا۔
''بالکل۔۔۔'' وہ پر یقین ہو کر بولیں۔ اور سونو نے سر ہلا کر اپنی مما کی اداسی دور کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

ماریہ کے سسرال والے آٹھ بجے آئے۔ تاریخ طے کرنے اور ڈنر میں دس بج گئے۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اب میرب کی رخصتی کی تیاری تھی۔ سامان تو کوئی خاص وہ اپنے ساتھ لائی نہیں تھی۔ دو چار کپڑے تھے جو وہ یہیں چھوڑے جا رہی تھی۔ سعدیہ صبح ہی جا کر ٹی پنک اور کافی کلر کا شاندار سا سوٹ بمعہ میچنگ بہ طور خاص میرب کے لیے لے کر آئی تھیں۔ اس وقت وہ مکمل تیار 'مختصر سا ہینڈ بیگ تھامے سارہ کی منتظر تھی۔
''بس بیٹا۔۔۔! سمجھ داری اور بردباری سے اپنے شوہر کے ساتھ معاملات نمٹانا سیکھو۔ گھبراؤ نہیں ہم تمہاری رہنمائی کو موجود ہیں۔ اپنے شوہر کے گرد اپنی محبت' حسن سلوک اور فرماں برداری کا ایسا سنہرا جال بن جاؤ کہ وہ چاہ کر بھی اس حصار کو توڑ نہ سکے۔'' سعدیہ اسے نروس دیکھ کر رسانیت سے سمجھا رہی تھیں۔
''بڑے فائدے کی باتیں ہیں میرب بیگم۔۔۔ اماں جان نے ایویں تو نہیں ساری زندگی ڈیڈ پر راج کیا۔'' سعد نے بولنا اپنا فرض تصور کیا۔ وہ مسکرا دی۔ ماریہ بھی بولی۔
''سعد ٹھیک کہہ رہا ہے' میں تو خود آج سے باقاعدہ ان کے مشوروں کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے والی ہوں۔''
''تمہیں تو خیر بہت ضرورت بھی ہے۔ ہاں میرب کی بات اور ہے۔ یہ سمجھ دار بھی ہے' محبت کرنے والی بھی 'ہاں یہ ہے کہ شادی شدہ زندگی کے اسرار و رموز تو وقت کے ساتھ ساتھ ہی سیکھے گی۔'' سعدیہ بیگم مسکرا کر بولیں۔
''جی ہاں' زمانے بھر کی کم عقل اور پھوہڑ تو صرف آپ کی ہی بیٹی ہے۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔
''اسے کہتے ہیں خود شناسی۔'' سعد نے داد دی۔
اب کی بار میرب کھل کر ہنس دی۔
''یہ ہوئی نا بات۔'' ماریہ جھٹ بولی۔ ''بس اسی طرح ہنستی ہوئی جاؤ اور اسی طرح مسکراتی ہوئی آؤ۔ ہم تمہارے لیے یہی دعا کرتے ہیں۔''

”میں تم لوگوں کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔“ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ اپنا ہاتھ اس نے ماریہ کے ہاتھ پر رکھ کر کہا تھا۔

”اسی منہ سے کردو۔ اتنا بُرا بھی نہیں ہے۔“ سعد نے کہا سب بے ساختہ ایک بار پھر ہنس دیے۔ تب ہی اطلاعی گھنٹی بجی۔ پھر انٹرکام کی بیل ہوئی۔ ریسیور سعد نے اٹھایا۔ دوسری طرف چوکیدار سائر کی آمد کا بتا رہا تھا۔

”جاؤ سعد! جاکر اسے اندر لے کر آؤ‘ بچہ کھانا تو کھا لے اندر آکر۔“ سعدیہ نے کہا۔ سعد باہر گیا۔ واپس لوٹا تو تاثرات سنجیدہ تھے۔

”وہ اندر نہیں آرہے‘ بہت جلدی میں ہیں۔ آپ لوگ میرب کو باہر ڈراپ کردیں۔“ کہہ کر رکا نہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ایک لحظ سعدیہ خاموش ہوئیں پھر نارمل ہوکر بولیں۔

”کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی۔ آؤ بیٹا تمہیں باہر ڈراپ کردوں۔“ انہوں نے اس کا بیگ تھام کر کہا۔

”آنٹی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔

”او یار! مرد بنو اتنا کیوں گھبرا رہی ہو۔ تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔“ اس کی بزدلی ماریہ کو بے مزہ کرنے لگی۔

اور اس کے ذہن میں پوری جزئیات کے ساتھ وہ آخری روز جو اس نے سائر کے ساتھ گزارا تھا گردش کرنے لگا۔ بہرحال وہ گاڑی تک آئی۔ ماریہ نے سائر کو سلام کیا جس کا جواب سر کے اشارے سے دیا گیا۔

(ہونہہ ’بدتمیز‘ اکڑو) وہ دل ہی دل میں بولی۔ سعدیہ بیگم کو اس نے گیٹ پر پھر باہر آنے سے روک دیا تھا۔ بہرحال وہ بیٹھی اور ہاتھ ہلا کر سعدیہ اور ماریہ کو فائنلی الوداع کہا۔ گاڑی لمحہ کی تاخیر کیے بنا زن سے آگے بڑھ گئی۔

”دیکھا آپ نے سائر بھائی کا روّیہ۔“ ماریہ پلٹ کر اندر آتے ہوئے غصے سے بولی۔ ”نہ اندر آئے نہ ہی آپ کو سلام کرنے کی زحمت گوارا کی‘ میں نے سلام کیا تو محض سر ہلا دینے ہی پر اکتفا کیا۔“

”جانے دو ماریہ۔“ سعدیہ گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے بولیں۔ ”ان بے کار کی باتوں کو اہمیت مت دو‘ اہم یہ ہے کہ وہ اپنا رویہ اپنا سلوک میرب کے ساتھ بہتر رکھے۔۔۔ اس کے لیے دعا کیا کرو۔“

”جی امی۔۔۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میرا تو دل ہر وقت اس کے لیے دعاگو رہتا ہے۔ اللہ کرے کہ سائر بھائی اس کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آئیں‘ اس کی زندگی خوشیوں سے بھر دیں۔“ وہ پرخلوص لہجے میں بولی تو سعدیہ بیگم نے بھی دل سے آمین کہا۔



”مما!“ چندا۔۔۔ جان سے بے زار لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی کسی میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی تب ہی اسے سونو نے پکارا۔

”کیا ہے؟“ اس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مما۔۔۔ آپ کو گولڈن فیری کی اسٹوری سناؤں؟“ اس کے ہاتھ میں باتصویر کہانی کی کتاب تھی۔

”مجھے نہیں سننی‘ جاؤ یہاں سے زینت بی کو سناؤ۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

”بٹ مما۔۔۔ اپ سیٹ تو آپ ہیں نا‘ زینت بی تو نہیں اور ویسے بھی زینت بی کو تو یہ اسٹوری پہلے ہی سے پتا ہے۔“ اس نے ازحد معصومیت سے بتایا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ میں اپ سیٹ ہوں۔“ وہ میگزین کے صفحے پلٹتے ہوئے ذرا سا مسکرادی۔ اس کی مسکراہٹ نے سونو کو حوصلہ بخشا۔ وہ اس کے مزید قریب آکر بولا۔

”مما مجھے زینت بی نے بتایا ہے۔۔۔ اب آپ کلر فل کپڑے بھی نہیں پہنتیں‘ سونگز بھی نہیں سنتیں‘ موویز بھی نہیں دیکھتیں۔ آپ بہت اداس ہیں نا۔۔۔ آپ کے ڈیڈ اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے ہیں نا‘

"آپ ان سے بہت پیار کرتی تھیں کیا؟" اس نے چندا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ سونو کا اپنے ننھیال والوں سے محض دور دور ہی کا تعلق تھا۔ تعلق تو خیر اس کا اپنے ددھیال والوں سے بھی دور ہی کا تھا۔

"ہوں۔۔۔" اس نے محض ہوں پر اکتفا کیا کہ اس کی ساری توجہ یک بیک ہی میگزین کے اس صفحے پر موجود اس لڑکی کی تصویر پر مرکوز ہوگئی کہ جو چوہدری صاحب کی آنے والی فلم کی ہیروئن تھی۔ اسے یک دم ہی بے تحاشا غصہ آیا۔ اس نے میگزین سائڈ پر پٹخا اور سائڈ پر رکھا فون اٹھا کر کوئی نمبر گھمانے لگی۔

"بتائیں نا مما؟" سونو نے اس کا گھٹنا ہلایا۔

"دماغ مت کھاؤ' جاؤ یہاں سے' زینت بی کے پاس جاکر کھیلو۔"

"مگر مما میں تو آپ کو اسٹوری سنانے آیا تھا۔" اس نے بسور کر کہا۔

"کہانا' جاؤ۔" وہ چیخی تو وہ سہم کر دور ہٹ گیا۔

"زینت بی' زینت بی' اسے لے کر جاؤ یہاں سے۔"

"ہیلو! کیا میں یومی آنٹی سے بات کر سکتی ہوں؟"

"میں کون۔۔۔" یک لحظہ وہ رکی۔ "انہیں کہو چندا کا فون ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ فون پر تھیں۔ زینت بی سونو کو لے جا چکی تھیں۔

"ہاں بولو۔۔۔" اجنبیت و بیگانگی بھرا لہجہ۔۔۔

"میں چندا بات کر رہی ہوں یومی آنٹی۔" وہ سمجھی شاید وہ اسے پہچانی نہیں۔

"جانتی ہوں۔ کہو کیا بات ہے۔" انہوں نے کرختی سے پوچھا۔

"وہ چوہدری صاحب کی فلم کوئی اور لڑکی کیسے کر سکتی ہے؟" اس نے کسی قدر غصے سے پوچھا۔

"کس زعم میں مبتلا ہو چندا بیگم' نہ تمہاری جیسی صورتوں کی کمی ہے نہ ہی ٹیلنٹ کی پھر اوروں کے تمہاری طرح نخرے بھی نہیں ہوتے۔ تمہارا کیا خیال تھا تم اگر چوہدری صاحب کی بات نہیں مانو گی تو وہ فلم نہیں بنائیں گے۔ ایسا نہیں ہوتا چندا! مارکیٹ میں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔" انہوں نے طنزیہ جتا کر کہا۔

"مگر میں نے انہیں انکار کب کیا تھا' میں نے تو محض سوچنے کا وقت مانگا تھا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"سوچنے کا وقت۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "بی بی سوچنے کا وقت اسٹار مانگا کرتے ہیں اور پھر کتنا وقت ڈھائی ماہ تو بیت گئے ہیں اس بات کو' اب اتنا انتظار تو کوئی کسی کا کر نہیں سکتا۔"

"مگر انہیں تو میں بہت پسند آئی تھی۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔

"سوتیا تم سے زیادہ پسند آگئی۔" انہوں نے اسے لاجواب کر دیا۔

"تو اب کچھ نہیں ہو سکتا؟" وہ موہوم سی امید کے تحت بولی۔

"قسمت بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ تم ہی نے عقل سے کام نہیں لیا' میں نے تو تم پر بہت محنت کی تھی۔" وہ بے پروائی سے بولیں۔

"پلیز یومی آنٹی! کچھ کریں میرے لیے۔" وہ التجاؤں پر اتر آئی۔۔۔ وہ تو شیخ صاحب کے غم میں مبتلا رہی اتنے دنوں' اسے کیا پتا تھا قسمت اس کے ساتھ یہ داؤ کھیل جائے گی۔

"سوری چندا۔۔۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے' مگر پھر بھی کہوں گی ضرور کہ تم میں ترقی کرنے والے گٹس ہی نہیں ہیں۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنے دقیانوسی شوہر کی سیوا کرو' اس کا بچہ پالو۔ یہ باہر نکل کر کام شام کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اچھا بھئی رکھتی ہوں فون بہت کام ہے۔ آخر کو میرے ہزبینڈ ہی ڈائریکٹ کر رہے ہیں فلم' کام کیسے نہیں ہوگا۔ بائے ڈارلنگ۔" انہوں نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

چندا نے ریسیور غصے سے کریڈل پر پٹخ دیا اس کی روشن آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

پورا راستہ خاموشی سے گزرا۔ گمبھیر' الجھن آمیز' چبھتی خاموشی۔۔۔

میرب جوں ہی گھر میں داخل ہوئی اچانک ہی اس پر دونوں اطراف سے پھولوں کی گویا برسات سی ہو گئی۔۔۔ گلاب کے پھولوں ہی کی روش اس کے کمرے تک جا رہی تھی۔ ہر چہرہ خوش تھا' مطمئن تھا اور اس پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجی تھی۔۔۔ وہ اتنے خوب صورت استقبال پر دم بخود رہ گئی۔

وہ جو فکر اندیشے ساتھ لے کر آئی تھی' وہ دہلیز کے اس پار رہ گئے اور وہ پھول کی نازک پنکھڑی ہی کی طرح ہلکی پھلکی ہو کر گھر میں داخل ہوئی۔

''ویلکم بیک بیٹے۔۔۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں کہ میں آج کتنا خوش ہوں۔'' وقار صاحب نے اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

''او ویری وارم ویلکم بیک بھابی۔'' اجیہ بھی خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی اس نے اک چھوٹا سا گفٹ پیک بھی اس کے آگے بڑھایا۔

''قسم سے۔ بس بی بی جی دن رات بڑی دعائیں مانگی ہیں میں نے آپ کے واسطے۔'' لالی نے کہا تو وہ ہنس دی۔ تب ہی نگاہ اس دشمن جان کی طرف اٹھی۔۔۔ یا خدا! کیا میری نگاہوں نے اس سے دلفریب نظارہ بھی کبھی دیکھا ہے؟

اس نے خود سے سوال کیا' ہمہ وقت پیوست رہنے والے لب اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا اور ظالم کیا خوب مسکراتا تھا' شاید اسے معلوم تھا تب ہی اپنی مسکراہٹ کو ہمیشہ کسی بیش قیمت خزانے کی طرح چھپا کر رکھتا تھا۔

''چلو فٹافٹ کھانا لگاؤ لالی۔'' وقار صاحب نے کہا' وہ تعمیل کو دوڑی۔ میز دیکھ کر میرب کو اندازہ ہوا' پوری دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ تو کھا چکی تھی۔ مگر ان کا ساتھ دینے بیٹھ گئی۔ اور سوچنے لگی۔

آج کے دن سے میں جتنا گھبرا رہی تھی' یہ تو اتنا ہی طمانیت سے بھرپور نکلا اے اللہ۔۔۔ ہماری زندگی کو یوں ہی اطمینان و خوشیوں سے بھر دے آمین ثم آمین۔۔۔

اسے اپنے دل سے گلے شکوے مٹتے محسوس ہوئے۔۔۔



چندا اپنے کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی تب ہی زینت نے آکر اندر جھانکا۔

''بی بی صاحب۔۔۔ آکر دوپہر کا کھانا کھا لیں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''مگر سونو ضد کر رہا ہے کہ آپ کے ساتھ ہی کھائے گا۔'' انہوں نے بے چارگی سے بتایا۔

''ضد کر رہا ہے۔'' وہ تلملا کر اٹھ بیٹھی' اگر کل کو وہ چاند لا کر دینے کی ضد کرے گا تو کیا وہ بھی پوری کرنے چل پڑو گی۔'' وہ دھاڑی تو زینت نادم سی ہو کر بولیں۔

''میں معذرت خواہ ہوں بی بی۔''

''جاؤ! اور آئندہ اس کی فرمائشوں اور ضدوں کی کہانیاں مجھے آکر مت سنانا آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟'' وہ حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں؟ انہیں نہیں معلوم تھا جو لوگ خود پرست ہوں وہ اوروں سے محبت نہیں کیا کرتے۔

''مما نہیں آئیں؟'' دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے وہ بڑی آس سے پوچھنے لگا۔

''بیٹا۔۔۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ کھاؤ آرام سے۔'' انہوں نے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر پیار سے نوالہ بنا کر اسے کھلانا چاہا۔

''مجھے نہیں چاہیے۔'' اس نے ہاتھ پرے دھکیلا۔

''اوں ہوں۔۔۔ اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''مجھے نہیں پتا' مجھے مما کے ساتھ ان کے ہاتھ سے کھانا کھانا ہے ورنہ نہیں کھانا۔'' وہ بدتمیزی سے چیخ کر ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا۔ زینت بی سر تھام کر رہ گئیں۔



''استقبال پسند آیا؟'' جونہی میرب اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی' سائر نے سوال کیا۔

''بے حد۔'' اس نے شرمگیں مسکراہٹ سمیت

کہا۔

"اب تو سارے گلے شکوے دور ہو گئے ہوں گے۔" اس نے ہاتھ میں موجود سرخ گلابوں کا گلدستہ جو غالباً" وہ نیچے ہی سے ہاتھ میں اٹھا کر لایا تھا اسے تھماتے ہوئے استفسار کیا۔

"شکریہ۔" اس نے بکے تھام کر کہا۔ "زخم دینے والا خود مسیحائی کردے اس سے بہتر بات اور بھلا کیا ہو سکتی ہے۔" وہ سرشاری سے بولی۔

"ہوں.... بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" اس نے میرب کے کان میں لٹکتا آویزہ چھو کر کہا.... اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی کیسا لگ رہا ہوں؟" اس نے شوخی سے سوال کیا۔ میرب سے تو نگاہ ہی اٹھانا دوبھر تھا کجا کہ جواب دینا۔

"خیر۔" پتا نہیں کیوں وہ قریب آتے آتے یکدم دور ہٹا تھا۔

"تم چینج کر کے آرام کرو۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔" وہ کہہ کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ میرب بھی اپنی بے ترتیب سانسوں کو ہموار کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر جیولری اتارنے لگی۔ اس کے لب آپ ہی آپ گنگنا اٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

دن بھر چندا بولائی بولائی پھرتی۔ رات رات بھر جاگ کر ٹی وی پر فلمیں دیکھتی رہتی۔ عجیب اجاڑ بے حال پریشان گھر کی فکر نہ شوہر اور بچے کی پروا اس کے انداز جمیل دیکھ تو رہا تھا مگر مصلحتاً" خاموش تھا کہتا بھی کیا آخر....

اسے اپنے گھر کا سکون اور اپنی عزت پیاری تھی۔ اس سے جواب طلبی کرتا تو دونوں ہی خطرے میں پڑ جاتے۔

دن یونہی بے کیف سے تھے۔ تب ہی سونو کے اسکول سے پیرنٹس ٹیچر میٹنگ کا بلاوا آیا۔ جمیل نے چندا کو بتایا۔ وہ بنا بس و پیش جانے کو راضی بھی ہو گئی۔

اس نے پہننے کے لیے گہرے نارنجی اور پیلے رنگ کی شیفون کی ساڑی کا انتخاب کیا۔ اہتمام سے میک اپ کیا جیولری پہنی۔ ایک دو مرتبہ اس کی تیاری دیکھ کر جمیل نے اسے ٹوکنے کا سوچا بھی مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ اسکول میں میٹنگ کا مخصوص ماحول تھا۔ آج سونو بہت خوش تھا۔ اس کی مما پہلی بار اس کے اسکول جا رہی تھیں۔ کوئی معمولی بات تھی بھلا؟

ٹیچر سے میٹنگ تو جمیل نے ہی کی۔ پڑھائی میں سونو اچھا تھا ذہین بھی تھا مگر غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ کم آمیز بھی تھا بس یہی دو باتیں ٹیچر نے اس کے متعلق شکایتاً" بتائیں۔ چندا ــــ نخوت سے بیٹھی یہاں وہاں ٹیچرز کو ان کی ڈریسنگ فیشن سینس کو دیکھ کر دل ہی دل میں مضحکہ اڑاتی رہی۔ وقت رخصت ٹیچر نے سونو کا گال چھو کر کہا۔

"مجھے اتنے پیارے سے بچے کی ماما سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسز جمیل! یقیناً" آپ کا بیٹا آپ کا پرتو ہے۔"

سونو جھینپ کر شرمانے لگا۔ چندا کی گردن غرور سے تن گئی۔ اس نے کسی بے پروا شہزادی کی طرح یہ تحسین آمیز الفاظ وصول کیے۔ جمیل البتہ سنجیدہ سا محسوس ہوا۔ واپسی میں کہنے لگا۔

"تم سونو کے اسکول کے معاملات میں بالکل دلچسپی نہیں لیتی ہو۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی بے حد ضروری ہیں تم کوشش کرو تو سونو اس میں دلچسپی ضرور لے گا۔"

"میں بے کار کی باتوں میں نہیں پڑتی۔ نہیں لیتا تو نہ لے۔" اس نے گاڑی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ سونو اس کی ساڑی کا پلو چپکے چپکے اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"یہ باتیں بے کار کی نہیں ہیں چندا! میں سونو کے معاملے میں تمہاری لاپروائی برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"سونو سونو سونو۔ جب سے یہ پیدا ہوا ہے تم نے تو زندگی کا حلقہ ہی مجھ پر تنگ کر دیا ہے۔ آخر تم مجھے

چین سے جینے دو گے یا نہیں۔" وہ چیخ کر بولی۔
"خدا کا خوف کرو چندا' میں نے آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے؟" وہ غصے سے بولا۔
"ہر وقت سونو سونو کا راگ الاپتے رہتے ہو' تمہیں میری پروا ہے کہ نہیں۔"
"بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو تم... تم سے تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔" وہ حسب روایت بے بسی مگر ناپسندیدگی سے بولا۔
"ہونہہ۔" اس نے گردن جھٹک کر ایک مرتبہ پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ سونو اس کا مہکتا پلو چھوڑ کر نجانے کب سے دونوں کو ہراساں نگاہوں سے تک رہا تھا۔ جمیل کی نظر بیک ویو مرر سے اس پر پڑی۔
"چاکلیٹ لو گے؟" اس نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔
سونو نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کھل کر ہنس دیا۔ چندا نجانے کن سوچوں میں مستغرق تھی۔

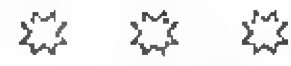


"سچ بھابھی... میں نے آپ کو اتنا مس کیا کہ بتا نہیں سکتی۔" شام کا وقت تھا' وہ دونوں لان میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ وقار صاحب اپنے کمرے میں تسبیحات میں مصروف تھے۔ سائر آفس گیا ہوا تھا۔
"اتنا مس کیا... مگر فون ایک بھی نہیں' آخر کیوں؟" میرب نے ہلکا سا شکوہ کیا تو وہ جھینپ سی گئی۔
"وہ... وہ بس ویسے بھی میرے فون کرنے سے کیا ہو جاتا بھلا؟" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔
"مجھے ڈھارس ہوتی' تسلی ملتی... غیر یقینی حالات میں بڑا حوصلہ ملتا ہے تسلی آمیز الفاظ سے۔"
"وہ تو ہے۔" وہ فوراً متفق ہو گئی پتا نہیں اس نے ٹھیک سے سنا بھی تھا یا نہیں' وہ تو اپنی بات میرب تک پہنچانے کے لیے مناسب لفظوں کی تلاش میں تھی۔
"اور تمہارا کالج ٹھیک جا رہا ہے اور وہ تمہاری فرینڈ کیا نام ہے اس کا۔"
"نتاشا۔" اجیہ کھٹ سے بولی۔
"ہاں' وہ ٹھیک ہے؟"
"بھابی! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بھابی مجھے آپ سے اک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ یکدم رک کر اس کی جانب پلٹ کر بولی۔
"ہاں کہو۔" تب ہی لالی نے چائے لا کر لان کی میز پر لگا دی۔
"آؤ بیٹھو... آرام سے بات کرتے ہیں۔" میرب نے کہا۔ اور اپنے اور اجیہ کے لیے چائے بنانے لگی۔
"بھابھی... وہ اس کا بھائی ہے آغا۔ آئی مین شایان... آغا شایان امریکہ میں رہتا ہے' وہیں بزنس کرتا ہے۔ مجھے اس نے شادی میں دیکھا تھا۔ میں اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے مجھے پروپوز کیا۔ مجھے بھی وہ بہت اچھا لگا۔" اتنا کہہ کر وہ میرب کے تاثرات جانچنے کو رکی جو متحیر سی تھی اور کچھ پریشان بھی۔
"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے بالآخر کہا۔
"تم جانتی ہو اجیہ! اپنے بھائی کے مزاج کو؟" میرب نے تفکر سے اسے دیکھ کر کہا۔
"میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ میں اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ کچھ نڈر ہو کر بولی۔
"مگر کیسے...؟"
"آپ کس مرض کی دوا ہیں۔" اس نے مسکرا کر ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔
"کیا تم میری پوزیشن سے واقف نہیں ہو؟" وہ کسی قدر افسردگی سے بولی۔
"میں صرف اس بات سے واقف ہوں کہ آپ اس وقت بہت اسٹرونگ پوزیشن میں ہیں۔ آخر کو اس گھر کی نسل آگے بڑھانے والی ہیں' یہ کوئی معمولی بات ہے۔" وہ شوخی سے بولی اور شوخ کیوں نہ ہوتی' اپنی ساری فکر اور پریشانی تو اس نے میرب کے سپرد کر دی تھی۔
"تم بات سمجھ نہیں رہی ہو۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا بھابھی.... میں نے آپ سے ایک بات کہی ہے وہ آپ آگے پہنچا دیں' سیدھی سی بات ہے' باقی میں دیکھ لوں گی۔" وہ اتنے پختہ اور پُرعزم لہجے میں بولی کہ میرب اس کے انداز پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو گئی۔

"تو پھر کب کریں گی بات' ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

"کرتی ہوں کچھ' ابھی چائے تو پیو۔" وہ اپنی پیشانی سہلاتی ہوئی دوسرے ہاتھ سے کپ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔



"بابا! کچھ بتاؤ گے کہ کیا ہوا ہے۔ یا یونہی روتے رہو گے؟" سونو جب سے اسکول سے آیا تھا' بنا یونیفارم تبدیل کیے جوتے اتارے' بیڈ پر منہ چھپائے لیٹا رو رہا تھا۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے چلا کر کہا۔

"میرے اچھے بیٹے نہیں ہو؟ شاباش بتاؤ مجھے' کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟" اس کے پوچھنے پر اس نے اپنا چھپا ہوا چہرہ تکیے سے باہر نکالا۔ منہ لال سرخ ہو رہا تھا مسلسل روتے رہنے سے آنکھیں سوج گئی تھیں۔

زینت بی کو بے ساختہ اس پر پیار اور ترس سا آگیا۔ اس کا گال چوما' ماتھے پر بکھرے بال ہاتھ سے سمیٹے' آنسو پونچھے۔

"وہ میرا فرینڈ ہے نا شانی' وہ میری مما کا مذاق اڑا رہا تھا کہہ رہا تھا کہ اس کی مما نے کہا کہ میری مما بالکل کارٹون لگ رہی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگا۔

زینت بی بالکل خاموش رہ گئیں۔

"اور پتا ہے شانی کی ماما اور علی کی ماما دونوں فرینڈز ہیں تو میں نے کہا کہ میری مما کو بھی اپنی مما سے کہو کہ فرینڈ بنا لیں تو علی کہنے لگا۔ میری مما چیپ لوگوں سے فرینڈشپ نہیں کرتیں۔"

"وہ دونوں بہت گندے بچے ہیں۔ آپ اپنی ٹیچر سے کہہ دیتے کہ وہ دونوں آپ کو تنگ کر رہے ہیں۔"

زینت بی اس کی دل جوئی کرنے کو بولیں۔

"میں نے اپنی ٹیچر سے کہا تھا کہ وہ دونوں میری مما کو کارٹون کہہ رہے ہیں تو وہ بھی ہنس دیں۔"

"زینت بی' میری مما تو اتنی پیاری ہیں تو وہ ان کا مذاق کیوں اڑا رہے تھے؟" وہ کہہ نہیں سکیں کہ کسی اور کے پاس تمہاری جیسی نگاہ جو نہیں ہے۔

"چھوڑو ان کی باتیں... آپ کے فرینڈز جھوٹ کہتے ہیں آپ کی مما تو بہت پیاری سی ہیں بیٹا... بی بریو... اتنی سی بات پر اچھے بچے روتے ہیں بھلا' چلو شاباش اٹھو چینج کرو' کھانا کھاؤ پھر شام میں آپ اور میں فٹ بال بھی کھیلیں گے اوکے۔"

"اوکے۔" وہ بہل گیا تھا۔

مگر زینت بی کی پیشانی پر تفکر کی گہری لکیریں کھنچ گئی تھیں۔



"یہ لیجیے آپ کی چائے..." میرب نے اسٹڈی روم میں داخل ہو کر وقار صاحب کی چائے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"شاباش... جیتی رہو' شاد رہو' آباد رہو۔" وقار صاحب نے کتاب نشانی لگا کر بند کرتے ہوئے خوش دلی سے اسے دعائیں دیں۔ وہ بہت آسودہ سے محسوس ہو رہے تھے۔

"اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" وہ کچھ جھجک کر اجازت طلب نگاہوں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

"یہ کیا بات کی تم نے؟" وہ یک لخت خفگی سے بولے "اگر مصروف بھی ہوتا تو تمہاری خاطر مصروفیت ترک کر دیتا' اتنا تو حق ہے نا تمہارا۔" وہ خفیف سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ تمہارا گھر ہے' پورے اعتماد اور استحقاق سے رہو۔ زندگی میں سکھ دکھ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کی اتنی پرواہ نہیں کرنی چاہیے؟"

"جی بابا! مجھے آپ سے اک بہت اہم اور ضروری

بات کرنی ہے۔ دیکھیے مگر پہلے آپ وعدہ کریں کہ پوری بات تحمل سے سن کر سوچ سمجھ کر جواب دیں گے۔" اس نے خائف لہجے میں تمہید باندھی۔

"خیریت بیٹا...." وہ یکدم ہی بہت پریشان دکھائی دینے لگے۔

"آپ اتنے ٹینس نہ ہوں پلیز۔" وہ ندامت محسوس کرنے لگی۔ مگر آخر وہ بھی کیا کرتی، سائرہ سے یہ بات کر کے اپنی ہی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی پھرنا معلوم اجیہ کے متعلق وہ سب سن کر اس کا کیسا ردعمل ہوتا سو بات ان ہی سے کرنی تھی۔

"بات کیا ہے.... سائرہ نے پھر کچھ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟" وہ تشویش سے بولے۔

"نہیں.... نہیں۔" وہ سرعت سے نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "بات دراصل یہ ہے بابا کہ اجیہ کے لیے کچھ لوگ آنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہہ ہی دیا۔

"اجیہ کے لیے؟" وہ بے حد حیرانی سے بولے مفہوم ظاہر ہے کہ وہ سمجھ گئے تھے۔ "مگر ابھی تو وہ انٹر میں ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے آخر؟"

"بات آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ مگر رشتہ اچھا ہے ایک بار غور کرنے میں کیا ہرج ہے۔" وہ بولی۔

"نہیں بھئی.... بالکل نہیں۔ جب ابھی اس کی شادی کرنی ہی نہیں تو رشتہ دیکھنے کا فائدہ۔ خوامخواہ اس کا ذہن منتشر ہو جائے گا۔" وہ قطعیت سے بولے۔

میرب نے سوچا تھا کہ وہ اپنے طور پر رشتے کی بات سنبھالنے کی کوشش کرے گی پھر بات آگے بڑھائے گی مگر یہاں تو پہلے ہی صاف انکار تھا سو چار و ناچار اسے اب اصل بات بتانی ہی تھی سو وہ سنبھل کر بولی۔

"اجیہ کی فرینڈ نتاشا کا بھائی ہے اس نے ہماری شادی پر اجیہ کو پسند کیا تھا اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" اس نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔ ناگواری کی شدید لہر وقار صاحب کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

"نتاشا کا بھائی.... مجھے نتاشا کچھ خاص پسند نہیں۔ نہیں بھئی مجھے اس معاملے کو آگے ہرگز نہیں بڑھانا۔" وہ دوٹوک بولے۔

"بابا.... اجیہ بھی اس کے بھائی کو پسند کرتی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو میرب؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے گویا وہ جو کچھ کہہ رہی ہو اپنی جانب سے کہہ رہی ہو۔

"باخدا.... مجھے اس نے خود بتایا ہے بابا جان.... میں خدانخواستہ الزام تراشی نہیں کر رہی۔" وہ ان کی نگاہوں میں بے یقینی دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ وقار صاحب خاموشی کی دبیز لہر میں ڈوب گئے۔

"بابا.... وہ چاہتی ہے کہ اس کا رشتہ وہیں طے کیا جائے۔ آپ ایک مرتبہ ان لوگوں سے مل تو لیں، ہو سکتا ہے، وہ اجیہ کے لیے موزوں ہوں....؟"

"اور اگر نہ ہوں تو؟" انہوں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ میرب چپ کی چپ رہ گئی۔

واقعی اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا ہوتا بھی تو وہ وقار صاحب کو دے نہیں سکتی تھی۔ مگر وقار کوئی ناسمجھ بچے نہیں تھے اس کی خاموشی بذات خود ایک مکمل جواب تھی۔ انہوں نے اک یاسیت آمیز سی نگاہ اس پر ڈالی۔

"ٹھیک ہے.... اس سنڈے بلا لو انہیں لنچ پر۔" بہت ٹوٹی ہوئی آواز میں وہ بولے تھے۔

"مگر بابا.... آپ تھوڑی سوچ بچار تو کیجیے۔"

"سوچ بچار وہاں کی جاتی ہے، جہاں فیصلہ کرنے میں تردد ہو.... اور جب فیصلے ہی کا اختیار میرے پاس نہیں تو پھر میرا متردد ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟" وہ ناراض لہجے میں بولے تھے۔

"بابا! آپ ناراض مت ہوں.... اگر وہ لوگ خدانخواستہ اجیہ کے لیے مناسب نہ ہوئے تو میں خود اسے سمجھاؤں گی۔" وہ ان کی تشفی کے لیے بولی۔

"اور وہ پھر بھی نہ سمجھی تو؟" کہنے کا فائدہ نہیں تھا اس لیے وقار صاحب نے کہا نہیں مگر سوچا ضرور۔



آج کئی مہینے بعد وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی

تھی۔ نیلے رنگ کی ساڑی میں اس کا متناسب سراپا ہمیشہ کی طرح غضب ڈھا رہا تھا۔ اس کا ارادہ ایمرلڈ کلب جانے کا تھا۔ وہاں وہ پومی آنٹی کے ساتھ اکثر جایا کرتی تھی۔ وہ شہر کے معزز اور اونچے لوگوں کا کلب تھا۔ جہاں شوبز سے متعلق شخصیات کا آنا جانا بھی معمول کی بات تھی۔ اس نے تیار ہو کر اک ناقدانہ نگاہ اپنے سراپے پر ڈالی اور مطمئن ہو کر سلور پرس بغل میں دبائے باہر نکل آئی۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس نے بے حد ضد کر کے اپنے لیے گاڑی اور ڈرائیور جمیل سے لیا تھا... گو کہ جمیل کی پوزیشن فی الحال ڈاؤن جا رہی تھی مگر پھر بھی اس نے اس کی سہولت کے پیش نظر جوڑ توڑ کر کے اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔ اسے گاڑی میں شان بے نیازی سے بیٹھتا دیکھ کر سونو زینت بی سے بولا۔

"مما روز چلی جاتی ہیں... کبھی بھی مجھے اپنے ساتھ پارک لے کر نہیں جاتیں۔" اور زینت بی اسے حسب معمول پچکار کر پارک لے گئی تھیں۔



آج صبح سے مہمانوں کی آمد کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ سارا انتظام میرب نے سنبھالا ہوا تھا۔ سائر سے مصلحتاً "اجیہ کی پسندیدگی والی بات چھپائی گئی تھی۔ اس لیے وہ نارمل تھا۔ البتہ وقار بہت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا' میرے خوابوں کی منزل محض چند قدم کے فاصلے پر ہے۔" آغا صبح سے کتنی ہی بار اجیہ کو ٹیکسٹ کر چکا تھا۔ اور وہ بھی جواباً "اسے اپنی کیفیات سے آگاہ کر رہی تھی۔ گل کو بھی وہ آج کے متعلق بتا چکی تھی جس پر گل نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ۔

"دیکھ لینا' تمہارا باپ ضرور کوئی ڈرامہ کرنے والا ہے۔" اجیہ اس سے کسی حد تک متفق بھی تھی... مگر بظاہر تو سب ٹھیک ہی تھا اس لیے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ بہرحال مقررہ وقت پر مہمان آگئے۔ بے انتہا ماڈ

آغا کی ممی جو اس کی بڑی بہن دکھتی تھیں۔ تیوریاں چڑھائے اس کے ڈیڈی اور نتاشا۔

گفتگو کا باقاعدہ آغاز ہوا تو وقار صاحب نے آغا سے اس کی تعلیم' رہائش بزنس وغیرہ کے متعلق ضروری سوال کیے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے دیے گئے جوابات کو اپنے تجربے کی روشنی میں پرکھتے بھی رہے۔ اس کے ڈیڈی سے بھی وقار صاحب ہی نے بات چیت کی۔ سائر خاموش تھا۔ پھر جب گفتگو کا رخ سیاسیات' معاشیات' اقتصادیات وغیرہ وغیرہ کی طرف مڑا تب وہ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ تب ہی اجیہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ آغا کی ساری توجہ ادھر ہو گئی۔ سائر نے اس کے یوں منہ اٹھا کر اجیہ کو دیکھنے پر ناگواری محسوس کی۔ وہ آئی اور میرب جو آغا کی ممی اور نتاشا کے ساتھ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے بیٹھی تھی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ آغا کی ممی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ نتاشا کی خوشی دیدنی تھی۔ لالی نے جوس پیش کیا۔ تب ہی آغا کی ممی نے اجیہ کے لیے آغا کا ہاتھ مانگ لیا۔

"بس مسٹر وقار... آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اجیہ اور آغا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو آپ اور ہم کون ہوتے ہیں بیچ میں دخل دینے والے' بڑی بات ہے کہ... ہمارے بچوں نے ہمیں عزت بخشی کہ ان کی شادی ہم کروائیں اگر یہ دونوں خود ہی کورٹ میرج کر لیتے تب بھی ہم کیا کر سکتے تھے۔" انہوں نے فلک شگاف قہقہہ لگا کر اپنی بات سے خود ہی حظ اٹھایا۔

سائر کے چہرے کے عضلات تن سے گئے۔ بات تو وقار اور میرب کو بھی کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔ البتہ اجیہ مسکرا رہی تھی۔

"جی بھابھی... اب وقت بہت بدل گیا ہے۔" وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ موصوفہ پھر ان کی بات درمیان سے اچک کر بے تابانہ بولیں۔

"بس تو پھر اگلے ماہ کی کوئی تاریخ دے دیجئے نا آپ! آغا ویسے ہی کتنے مہینوں سے یہاں صرف اجیہ کی وجہ سے اٹکا بیٹھا ہے اب یہ فوراً "واپس نہیں گیا تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔"

"بھابی! کمال کرتی ہیں آپ بھی..." وقار لہجے پر بہت مشکل سے کنٹرول کرپائے تھے "ایسے بھلا بیٹیوں کے رشتے طے کیے جاتے ہیں کہیں۔ آپ سے آج ہی ملاقات ہوئی ہے ابھی تو بہت سے مراحل طے ہونا باقی ہیں۔"

"ہم آج ملے ہیں تو کیا ہوا؟" وہ تیزی سے بولیں۔ "بھئی دیکھیں نا' زندگی تو ان دونوں کو گزارنی ہے تو خوامخواہ ہمیں اپنا دماغ خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے ڈیڈی اپنی بیگم کی ہر بات سے متفق تھے... سر تو ان کا اثبات میں مسلسل ایسے ہی ہل رہا تھا۔

"نہیں بھابھی! میں آپ کی بات سے اختلاف کرتا ہوں بے شک! زندگی بچوں کو گزارنی ہے مگر آخر ہمارے بھی تو کچھ فرائض ہیں اور میں اپنے فرائض کو بہتر طریقے سے ادا کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔" اجیہ نے ان کے یہ کہنے پر اک طنزیہ سلگتی ہوئی نگاہ ان پر ڈالی تھی۔

"مگر..." آغا کی ممی نے کچھ کہنا چاہا لیکن سائر نے اس مرتبہ ان کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"مگر کچھ نہیں آنٹی... آپ کا موقف شاید درست ہو... مگر ہم آپ کو فوری طور پر جواب دے نہیں سکتے۔ آپ بھی ہماری مجبوری کو سمجھیے۔" ماحول کچھ کشیدہ سا ہو گیا۔ آغا بے حد غصے میں دکھائی دینے لگا۔

تب ہی لالی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ کھانے کے دوران یہاں وہاں کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد وہ جلد ہی جواب دینے کے اصرار کے ساتھ رخصت ہوئے۔ ان کے جانے کی دیر تھی کہ سائر پھٹ پڑا۔

"کیا بکواس کر رہی تھی وہ واہیات عورت؟ تم اور آغا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔" وہ اپنی نگاہیں اجیہ پر گاڑ کر بولا۔ اس کا غصہ دیکھ کر اجیہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"میرب! تم اجیہ کو کمرے میں لے کر جاؤ۔" وقار صاحب تحمل سے بولے۔

میرب لمحہ کی تاخیر کیے بنا اسے کمرے میں لے کر چلتی بنی۔

"بابا! اس قدر واہیات لوگ تھے' کیا آپ نے نہیں دیکھا؟" اس نے ان کی جانب پلٹ کر دیکھا۔

"دیکھا... زندگی میں بہت کچھ دیکھ کر آنکھیں چرانا پڑتی ہیں بیٹے! یہ وقت غصے میں آکر الٹا سیدھا بولنے کا نہیں بلکہ بردباری سے معاملات کو ہینڈل کرنے کا ہے۔" انہوں نے نزدیک آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا مطلب؟" آپ کیا چاہتے ہیں میں بے غیرت بن جاؤں؟" اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

"نہیں بیٹے... بات غیرت مند یا بے غیرت ہونے کی نہیں... اجیہ اگر اس شخص کو پسند کرتی ہے اور وہ قابل بھروسا اور نیک ہے تو اس متعلق سوچنے میں کچھ حرج بھی نہیں۔"

"تو کیا آپ اجیہ کو اس شخص سے پسند کی شادی کرنے دیں گے!" اس نے ہاتھ سے اجیہ کے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ اگر وہ لڑکا اس لائق ہوا تو۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کا اس کی پسند ناپسند پر اختیار نہیں ہوتا۔ پسند تو کوئی نہ کوئی آہی جاتا ہے... ہاں مگر میں بے ہودگی... بے حیائی اور بے شرمی کا شدید مخالف ہوں۔ محبت انسان کو ہو جاتی ہے مگر میں اسے پارکوں' ہوٹلوں اور سڑکوں پر رولنے کو گناہ سمجھتا ہوں۔" وہ دھیمے سے بولے تو سائر کے تنے اعصاب کچھ ڈھیلے سے پڑ گئے۔

"میں شاید آپ کو کبھی نہ سمجھ پاؤں۔"

"مجھے سمجھ کر کیا کرو گے برخوردار! زندگی کو سمجھنا' برتنا سیکھو۔" وہ اب سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"میں نے اس کا امریکہ کا ایڈریس لے لیا ہے۔ یہاں کا ایڈریس وغیرہ میرب اجیہ سے پتا کرلے گی۔ تم ذرا اس لڑکے کے متعلق چھان بین تو کرواؤ۔" وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولے۔

"جی کرواتا ہوں۔" وہ تابعداری سے بولا۔ دوسری طرف اجیہ میرب پر ناراض ہو رہی تھی۔

"آپ نے میری پسندیدگی کے متعلق بابا اور بھائی کو کیوں نہیں بتایا؟"

"عجیب لڑکی ہو تم لڑکیاں تو ایسی باتیں باپ بھائی سے چھپاتی ہیں۔" وہ برہمی سے بولی۔

"مگر میں ان لڑکیوں میں سے نہیں' مجھے آغا سے شادی کرنی ہے اور ہر حال میں کرنی ہے۔" وہ بے باکی سے بولی۔ تو میرب پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ تو صبر کرو ان شاء اللہ تمہارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔" اس نے اسے دلاسا دیا تو وہ مضطرب سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ کر ناخن چبانے لگی۔



چندا کو کلب جاتے مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ وہاں اب اس کی اکثر لوگوں سے جان پہچان ہو چلی تھی۔ دو ایک مرتبہ پوی آنٹی سے بھی ٹاکرا ہوا مگر وہ انجان سی بن کر نکل گئیں۔ وہاں اک لڑکی ستارہ سے چندا کی کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک سی کلاس ایکٹرس اور ماڈل تھی۔ جس نے خود کو ہر قید و بند سے آزاد کر رکھا تھا۔ وہ چندا کو طرح طرح کے مشورے دیتی کبھی کہتی۔

"اپنے چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ سجاؤ' اتنی مغرور لگتی ہو' اسی لیے تمہیں کوئی لفٹ نہیں کرواتا۔" کبھی ڈپٹتی کہ۔

"اچھا بھلا وہ شاہ صاحب تمہیں اپنے ساتھ اپنے فارم ہاؤس لے جانے کی آفر دے رہے تھے خوامخواہ تم اکڑ گئیں۔ چلی جاتیں نا تو وارے نیارے ہو گئے ہوتے۔ بیس تیس ہزار تو اس کے ہاتھ کا میل ہیں۔" چندا کوفت زدہ ہو کر بولی۔

"بیس تیس ہزار میرا مسئلہ نہیں ہیں یار! مجھے تو اک چانس چاہیے' ایک ایسا چانس جو مجھے راتوں رات مشہور کر دے۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہائے قسم سے تمہاری یہ جگمگاتی آنکھیں ہیرے کی چمک کو ماند کر دیتی ہیں' ویسے کبھی دیکھا ہے اصلی ہیرا؟" اس نے مشروب کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"اوں ہوں.... ابھی تک تو نہیں۔" وہ بے مزہ ہوئی۔

"کیوں یار.... تمہارا شوہر اتنا بھی غریب نہیں۔" وہ آنکھ سے کسی کو اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"اور وہ اتنا امیر بھی نہیں کہ میرے لیے ہیرے موتی خرید سکے۔" اس نے تندی سے کہا۔

"مگر یار! قسم سے اگر مجھے خدا نے تمہارے جیسا بے داغ حسین چہرہ اور سنگ مرمر سے تراشا فگر دیا ہوتا نا تو تم دیکھتیں.... میں نے تو اپنے لیے سونے چاندی کے محل کھڑے کر لینے تھے۔" وہ بائیں آنکھ دبا کر بولی۔

"میرا نصیب ہی خراب ہے شاید۔" وہ یاسیت سے بولی۔

اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے.... ہمارا نصیب خراب نہیں ہوتا مگر ہم اسے اپنے ہاتھوں سے بڑے جتن کر کے بڑی محنت سے خراب کر لیتے ہیں۔



"کیا بکواس ہے یہ آخر.... کس خوشی میں تمہارے ڈیڈ نے وقت مانگا ہے۔" آغا سخت برہم تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں آغا.... آخر فارمیلٹی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ پچھلے چار پانچ دن سے آغا کو یہی سمجھاتی آرہی تھی۔

"کان پک گئے ہیں تمہاری یہ بے کار کی باتیں سن کر میرے۔" اس کی برداشت جواب دے گئی۔

"یہ کس طرح بات کر رہے ہو تم مجھ سے۔" وہ بگڑ کر بولی۔ تو وہ کچھ نرم پڑا۔

"یار! تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو.... میں تم سے مزید دور نہیں رہ سکتا۔"

"پلیز آغا.... کچھ ہی دن کی تو بات ہے۔" وہ بھی مسکرا کر بولی۔

"اگر تمہارے بھائی نے انکار کر دیا تو... مجھے وہ بالکل پسند نہیں آیا ہے۔"

"وہ کیوں انکار کریں گے بھابی مجھے بتا رہی تھیں کہ پہلے تو وہ واقعی غصے میں تھے مگر بابا نے انہیں سمجھایا تو وہ بالکل نارمل ہو کر تمہارے متعلق تحقیقات کروا رہے ہیں۔" وہ روانی میں کہہ گئی۔ آغا کے کان کھڑے ہو گئے۔

"میرے متعلق تحقیقات؟ کیا میں کوئی ہسٹری شیٹر ہوں؟" وہ شدید طیش میں آ گیا۔

"پلیز آغا... میرا مطلب تھا کہ جیسا کہ ہمارے معاشرے میں عام رواج اور طریقہ ہے۔" وہ کہہ کر پچھتائی۔

"بھاڑ میں گیا معاشرہ، مجھے اس کے رسموں رواجوں سے کچھ لینا دینا نہیں اور تم اس بات پر اتنی نارمل کیسے رہ سکتی ہو؟ اگر اس کو میرے متعلق کچھ الٹا سیدھا معلوم ہو گیا تو وہ تو ہماری شادی ہونے نہیں دے گا پھر کیا کرو گی تم؟"

"اگر تم غلط نہیں ہو تو انہیں کوئی الٹی سیدھی معلومات بھلا کیوں دے گا۔ مجھے پورا بھروسا ہے تم پر ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔" وہ پورے یقین سے گویا تھی۔

"بے وقوف ہو تم اجیہ... اگر تمہارے گھر والے تمہاری شادی میرے ساتھ کرنے پر راضی نہ ہوئے تو تم کیا کرو گی؟" وہ ٹٹولنے والے لہجے میں بولا۔

"تو میں تمہارے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔ اب خوش؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اپنے الفاظ پر قائم رہنا۔"

"ہاں، ہاں اب کچھ اور بھی بات کرو گے یا بس مجھے غصہ ہی دکھاتے رہو گے۔"

"تمہارے گھر والوں نے کچھ اور بات کے قابل چھوڑا ہے؟" وہ بولا۔ تو وہ کھل کر ہنس دی۔

انسان کے الفاظ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ انسان جو کہتا ہے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کی قیمت اسے چکانی ہی پڑتی ہے۔ لفظ مرتے نہیں وہ فضا میں زندہ رہتے ہیں اور پھر زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر آ کر آپ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔



جمیل اپنے آفس میں بیٹھا اپنے معاون کے ساتھ نئی ہونے والی ڈیل کے متعلق ڈسکشن میں مصروف تھا تب ہی اس کی ٹیبل پر رکھا فون بجا۔ نیا نیا کام شروع کیا تھا آفس کا عملہ بھی مختصر تھا زیادہ شو شا بھی اسے پسند نہیں تھی۔ سو فی الحال وہ آنے والی کالز وغیرہ خود ہی ریسیو کر لیا کرتا تھا۔

"ایک منٹ" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے معاون ہمدانی کو خاموش ہو جانے کا اشارہ دیا "ہیلو... کیا؟" وہ بے ساختہ زور سے چیخا۔

"میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں یا تم بشارت سے ٹیکسی منگواؤ، چندا کہاں ہے اس سے میری بات کرواؤ؟"

"صاحب... وہ گھر پر نہیں ہیں۔" زینت نے بتایا تو جمیل کو لگا کہ اگر چندا اس کے سامنے ہوتی تو یقیناً" وہ اس کا منہ تھپڑوں سے سرخ کر چکا ہوتا۔

"تم ایسا کرو۔ وقت ضائع کیے بغیر سونو کو ٹیکسی میں قریبی کلینک لے جاؤ، میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے عجلت میں کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"سب خیریت!" ہمدانی نے تشویش سے پوچھا۔

"یار... میرا اکلوتا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا ہے سر پر چوٹ آئی ہے اس کی میڈ کا فون تھا۔" وہ پریشانی سے اپنی پیشانی سہلاتا ہوا بولا۔

"فکر مند مت ہو' اللہ خیر کرے گا' چلو میں ڈرائیو کر کے تمہیں لے چلتا ہوں۔" اس نے جمیل کی غائب دماغی والی کیفیت نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو!" وہ بنا پس و پیش اٹھ گیا۔

آفس سے گھر کے نزدیکی کلینک تک آتے ہوئے پورے راستے اسے چندا پر بری طرح غصہ آتا رہا آخر تھی کہاں وہ عورت؟ اتنی لاپروائی وہ اپنے اکلوتے بچے سے کیسے برت سکتی ہے... اور پتا نہیں میرے بچے کو کتنی چوٹ آئی ہو گی... آ جائے وہ گھر آج... میں بتاتا

ہوں اس عورت کو.....

"بس یہی ہے یار!" وہ کلینک پر گاڑی رکوا کر سرعت سے اترا اور اندر گیا۔ چھوٹا سا کلینک تھا۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ لیٹا دکھائی دے گیا۔ اس کی ہلکی نیلی شرٹ پر جگہ جگہ خون کے سرخ نشانات تھے۔ نیم بے ہوش سونو کے پاس بدحواس صورت لیے زینت بیٹھی تھی۔

"میرے بیٹے..... میرے بچے کیسے گرے تم۔" وہ بے قراری سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"وہ صاحب جی..... سونو فٹ بال سے کھیل رہا تھا بال کے پیچھے بھاگا تو سیڑھیوں پر پیر پھسل گیا۔" اس نے ڈرتے ہوئے بتایا۔

"چندا کب سے گئی ہوئی ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی وہ تو روز شام کو چلی جاتی ہیں کہیں۔ دو تین گھنٹے بعد واپسی ہوتی ہے ان کی۔" اس نے سن کر کچھ نہیں کہا اور ڈاکٹر کے پاس سونو کے متعلق بات چیت کے لیے چلا گیا۔

"گھبرانے کی بات نہیں۔ جلد پھٹنے کے باعث دو ٹانکے لگے ہیں۔ بچہ کو خوف کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے۔ انجکشن دے دیا ہے ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا..... باقی یہ دوائیں ہیں' یہ آپ انہیں دیتے رہیں۔ فروٹ جوسز دودھ پلائیں۔ دو روز بعد آ کر زخم دکھا دیں۔" ڈاکٹر نے دوائیوں کا پرچہ اسے تھما کر مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ نیم بے ہوش سونو کو اٹھا کر گاڑی تک لایا۔ اس نے چندا کی اچھی طرح خبر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔



"آغا کے باپ کی شہرت کچھ اچھی نہیں' ویسے وہ لوگ پیسے والے ضرور ہیں مگر اتنے بھی نہیں جیسا کہ ان لوگوں نے اپنا لائف اسٹائل اپنا رکھا ہے۔ آغا کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ امریکہ میں تین بار شادی کر کے لڑکیوں کو چھوڑ چکا ہے۔ ڈرنکر ہے۔ ڈرگس استعمال کرتا ہے۔ حلقہ احباب بھی نامناسب ہے۔"

یہ وہ معلومات تھیں جو سائر کو حاصل ہوئی تھیں۔ اور وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔ حالت تو وقار صاحب کی بھی کچھ مختلف نہیں تھی اس صورت حال میں سب سے زیادہ فکر مند میرب تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اجیہ یہ سب کبھی نہیں مانے گی۔

"اب کیا کرنا ہے سائر! میرے تو اعصاب جواب دے رہے ہیں۔"

"کرنا کیا ہے..... مجھے تو پہلے ہی وہ لوگ کچھ خاص پسند نہیں آئے تھے میں تو انہیں اسی وقت صاف جواب دے دینا چاہتا تھا مگر آپ کی تسلی کے لیے میں نے بات آگے بڑھنے دی۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مگر اجیہ..... وہ کیسے یقین کرے گی اس بات پر؟" میرب بولی تو سائر نے بھنا کر اس کی طرف دیکھا۔

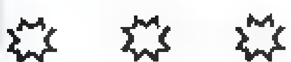
"کیوں نہیں کرے گی' کیا ہم اس کے دشمن ہیں؟" وہ خلاف عادت کافی برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اسے سمجھانے کی کوشش کرو میرب....." وقار صاحب تھکے تھکے سے لہجے میں بولے۔

"میں کوشش ضرور کروں گی بابا مگر۔" آگے وہ بول ہی نہیں سکی کہ سائر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور کر دیکھا۔

"مگر کیا؟"

"کچھ نہیں..... میں سمجھاؤں گی اسے۔" وہ مضبوط لہجے میں جلدی سے بولی تھی۔



"کہاں تھیں تم؟" مغرب کے بعد وہ گھر لوٹی تھی۔ وہ گنگناتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو بیڈ پر جمیل کے ساتھ سونو لیٹا سو رہا تھا۔ ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔

"اسے کیا ہوا؟" پرس رکھ کر قریب آتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے' تم کہاں تھیں؟" جمیل کے تیور اتنے خطرناک تھے کہ اسے خائف ہو کر جواب دینا پڑا۔

"میں اپنی فرینڈز کے ساتھ لیڈیز کلب میں تھی۔۔۔ آج پارٹی تھی وہاں۔" اس نے جمیل کو طنزیہ خود کو دیکھتا پا کر جلدی سے وضاحت دی۔

"تم وہاں روز جاتی ہو۔" وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"ہاں۔۔۔ شام کو ایک دو گھنٹوں کے لیے چلی جاتی ہوں۔" اس نے سنبھل کر کہا کہ فی الحال وہ اس سے پنگا لینے کی پوزیشن میں بالکل نہیں تھی۔

"سونو کے لیے میڈ ہے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اس کی ہر ذمے داری سے بری الذمہ ہو گئی ہو۔۔۔ تمہاری زندگی تمہاری ایکٹیویٹیز اپنی جگہ۔۔۔ مگر یہ گھر اور یہ بچہ بھی تو تمہاری ذمے داری ہے کہ نہیں۔ میں نے تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور آزادی دے رکھی ہے اس کے بدلے میں تم سے صرف اور صرف تمہاری محبت توجہ اور خیال کا طالب ہوں تو کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" وہ غصے میں تھا مگر نرمی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ ہی مارجن دے دیا کرتا تھا۔ عیش و آرام دینے والی بات پر چندا کو شدید اختلاف تھا اور وہ اس پر بہت کچھ بلا نقط کہہ بھی سکتی تھی مگر اس وقت صورت حال ذرا مختلف تھی اور چندا سب کچھ تھی مگر بے وقوف ہرگز نہیں تھی سو بولی۔

"ٹھیک ہے میں شام کو چلی جاتی ہوں مگر پورا دن تو اس کا خیال میں ہی رکھتی ہوں۔" وہ سونو کے قریب بیٹھ کر بولی۔

"بے شک رکھتی ہو گی آخر ماں ہو اس کی مگر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آئندہ اسے ہرگز بھی اکیلا مت چھوڑنا جہاں جاؤ اسے ساتھ لے کر ہی جانا۔" نیا آرڈر۔ چندا نے شدید الجھن محسوس کی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔ اب بندہ ہر جگہ بچوں کو لٹکا کر پھرے گا کیا؟" وہ ناراض ہو کر بولی۔

"ہاں۔۔۔ سب کا مجھے نہیں پتا مگر میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ آئندہ۔۔۔ تم جہاں بھی جاؤ گی۔ سونو تمہارے ساتھ جائے گا۔" وہ بے لچک لہجے میں دو ٹوک بولا۔ وہ بنا کچھ کہے ایک جھٹکے سے اٹھی تب ہی اس کا آنچل نیم غنودہ سونو تھام کر بولا۔

"مما آپ پلیز میرے ساتھ رہیں۔۔۔ یہاں سے مت جائیں نا' آئی لو یو مما۔"

"چھوڑو میرا آنچل۔۔۔ چینج کرنے دو مجھے۔" وہ درشتی سے بولی۔ تو جمیل تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر سونو کا ماتھا چوم کر بولا۔

"مما کو چینج کرنے دو۔۔۔ ابھی آتی ہیں تمہارے پاس۔"

"جاؤ چندا! کپڑے بدل کر فوراً" میرے بیٹے کے پاس آ کر بیٹھو۔" اس کے لہجے میں تنبیہہ چھپی تھی۔

"ہاں نوکر ہوں نا' اس کے باپ کی۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی ہوئی واش روم کی جانب بڑھ گئی۔



"یہ سب سائر بھائی نے بتایا ہے؟" میرب اس وقت اجیہ کے کمرے میں اسے سمجھانے کی نیت سے آئی تھی۔

"ہاں اجیہ۔۔۔ صرف ایک جگہ سے یہ معلومات حاصل ہوتیں تو یقین کرنا ذرا مشکل تھا مگر تقریباً" سب ہی جگہ سے یہی معلومات ملی ہیں۔" میرب کو نہایت افسوس سے یہ سب اجیہ کو بتانا ہی پڑا۔

"بکواس' جھوٹ۔۔۔ سراسر بہتان باندھ رہے ہیں سائر بھائی آغا پر۔" وہ یکدم بھڑک اٹھی۔

"اجیہ پلیز۔۔۔ اگر تم اتنا ہارش ری ایکٹ کرو گی تو بات کیسے بنے گی؟" وہ خائف ہو کر بولی۔

"بات بنے یا بگڑے' مجھے کچھ نہیں پتا" وہ بیڈ سے اٹھ کر غصے سے یہاں وہاں تیزی سے ٹہلنے لگی۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ سائر بھائی اور بابا کا پلان ہے۔ وہ میری شادی میری پسند سے ہونے دینا ہی نہیں چاہتے۔" وہ سراپا جھلس کر بولی۔ میرب بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اجیہ۔۔۔ اجیہ آرام سے بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ سے میری بات سنو۔ ایسا بالکل نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہی ہو اگر وہ تمہاری شادی وہاں نہیں ہونے دینا

چاہیے تو ان لوگوں کو گھر تک بلاتے ہی کیوں؟"

"مجھے کچھ نہیں پتا بھابھی' میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں آغا سے محبت کرتی ہوں اور وہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے مجھے قبول ہے۔ تب پھر ان لوگوں کو کیا پرابلم ہے۔" وہ بالکل کھرے انداز میں بولی۔

"تم گڑھے میں گروگی تو تمہیں تمہارے اپنے یوں گرنے نہیں دیں گے اجیہ۔" میرب اس بار سختی سے بولی۔

"ہونہہ.... میرے اپنے۔ بس بھابھی! آپ میرا منہ نہ کھلوائیں تو بہتر ہوگا مجھے اچھی طرح پتا ہے بابا کا' وہ اتنے ہی ظالم' بے حس اور کٹھور ہیں اپنی انا انہیں بہت عزیز ہے اور وہ اس کی خاطر کسی کی زندگی سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔" وہ زہرخند ہو کر بولی تو میرب اس کے اتنے سنگین الفاظ پر دم بخود رہ گئی۔

"اجیہ.... یہ سب تم بابا کے لیے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں' پورے ہوش و حواس میں ان ہی کے لیے کہہ رہی ہوں جنہوں نے آپ کو اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے.... یہ میری زندگی ہے۔ اس کے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا مجھے مکمل اختیار حاصل ہے اور میرا فیصلہ ہے کہ میں ہر حال میں شادی آغا ہی سے کروں گی وہ چاہیں یا نہ چاہیں' آپ جا کر انہیں بتا دیں۔" وہ بے باک ہو کر بدتہذیبی سے بولی۔

اور اس کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر اس کے کمرے کی جانب آتے وقار صاحب نے اپنی جواں سال بیٹی کے منہ سے نکلا ہر لفظ سنا تھا.... اور کاش وہ نہ سنتے.... کبھی کبھی ساری عمر کی تربیت خون کے آگے ہار جاتی ہے۔ اور آج وہ ہار گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ہو کہاں تم.... فٹافٹ ریڈی ہو جاؤ' بڑی شاندار پارٹی ہو رہی ہے گالف کلب میں۔" ستارہ کی کال ابھی ابھی چندا کو موصول ہوئی۔

"کہاں یار.... مصیبت۔ میرا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا ہے' میں نہیں آسکوں گی۔" دل تو اس کا بہت چاہ رہا تھا۔

"ارے یار! ایسی پارٹیاں روز روز نہیں ہوا کرتیں۔ قسم سے۔ بہت مزہ آئے گا۔" وہ چٹخارہ لے کر بولی۔

"یار.... اسے بھی لے کر آنا پڑے گا پھر۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" اس نے بے حد برا مانا' اسے اس کی میڈ کے سپرد کرو اور آجاؤ تم۔"

"یار.... کم بخت میرے شوہر کا حکم ہے یہ کہ اسے گھر پر اکیلا ہرگز نہیں چھوڑا جائے۔" اس نے جمیل کی نقل اتاری۔

"توبہ ہے یار! ان شوہروں سے بھی' خیر پارٹی ہوگی بڑی شاندار نگار پروڈکشن والے اپنی نئی فلم کی کامیابی کی پارٹی دے رہے ہیں۔"

"اچھا وہ.... اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور غور سے اس کی باتیں سنتے سونو کو اس سے اس کی آنکھوں کی چمک سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ کافی دیر سے وہیں صوفے پر بیٹھا بلاک پزل سے کھیل رہا تھا۔ ماتھے کی پٹی اتر گئی تھی البتہ زخم پلاسٹر سے کور تھا۔

"تو پھر ایسا کرتی ہوں' اس مصیبت کو بھی ساتھ لے آتی ہوں' بٹھا رہے گا وہیں پر۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ مگر سنو.... وہ رازدارانہ انداز میں بولی' کسی کو بھی یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وہ تمہارا بیٹا ہے' کہہ دینا بہن کا بیٹا ہے' بھائی کا بیٹا ہے وغیرہ۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ خوشی سے بولی' میں آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے یار! ایسا کرو۔ آج تو میرے پاس بھی گاڑی نہیں ہے۔ مجھے بھی تم ہی پک کر لینا۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔" اس نے کہہ کر فون رکھا اور بہ آواز بلند زینت بی کو پکار کر سونو کو تیار کرنے کا آرڈر دیا اور خود بھی تیار ہونے چل دی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا تھا نا...." گل اپنی بات کے سچ ثابت

ہو جانے پر مدبرانہ لہجے میں بولی۔

"اب کیا کروں میں امی... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بہت' میں بالکل اکیلی ہوں۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میری بچی... میرا دل کٹ رہا ہے تیری حالت دیکھ کر۔ کاش میں تیرے کچھ کام آسکتی۔" وہ دل گیر سی ہو کر بولی۔

"امی..." وہ اپنے آنسو پونچھ کر فیصلہ کن لہجے میں بولی' بس مجھے کچھ نہیں پتا' میں آپ کے پاس آرہی ہوں' اب وہیں رہوں گی آپ کے ساتھ۔ اور آغا تو مجھ سے شادی کر ہی لے گا تو پھر ہم دونوں یہاں سے اس کے ساتھ امریکہ چلے جائیں گے۔" اس کے کہنے پر گل بری طرح گڑبڑا گئی۔

"ارے نہیں... ایسے کیسے۔" وہ بوکھلا کر بولی' پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کے کہنے لگی۔

"بیٹا... ایسی کوئی غلطی کرنا بھی مت... تم نہیں جانتیں؟ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے اک اکیلی' غریب عورت کی بے بسی کا شاید تمہیں اندازہ بھی نہ ہو۔ تمہارے ایسے کسی بھی عمل کو وہ لوگ بہ زور طاقت روک سکتے ہیں۔ تب پھر تم کیا کرلوگی۔"

"تو میں ابھی بھی کر ہی کیا پا رہی ہوں۔" وہ پھر سے رو پڑی۔

"ایسے رو تو مت... تمہاری اس لڑکے سے بات ہوئی؟"

"ابھی نہیں ہوئی امی! مجھے تو اس بات کی بھی بہت ٹینشن ہے وہ سن کر نجانے کیا ری ایکٹ کرے گا؟"

"ہاں سو تو ہے' اچھا خیر میں کچھ سوچتی ہوں تم اتنی فکر مند مت ہو۔ میرا دل پھٹ جائے گا تمہارا یوں رونا سن کر۔" وہ نم آواز میں بولی۔ وہ اور کھل کر رونے لگی۔

"رو اور رو... یہ رونا تو اب تمہاری قسمت میں لکھا جاچکا ہے۔ اچیہ..." گل سفاکی سے سوچ رہی تھی۔



وہ لوگ جس وقت کلب کے پارٹی ہال میں داخل ہوئیں' محفل اپنے عروج پر تھی۔ ڈانس فلور پر تھرکتے وجود' بلوریں گلاسوں کی کھنکھناہٹ' سرکتے پلوؤں کی سرسراہٹ' بے باک نگاہیں' پیغام دیتے قہقہے... شام کے سارے لوازمات مکمل تھے۔

سونو سہم کر چندا کے مزید نزدیک ہو گیا۔

"اوفوہ... دور ہٹو بھئی' کیا مصیبت ہے۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر نخوت سے بولی۔ وہ بسورنے لگا۔

"او نو بے بی... آنٹی کو تنگ نہیں کرو' چلو شاباش باہر پلے ایریا ہے وہاں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلو۔" ستارہ نے اسے ہال سے باہر دھکیلا۔ اس کا ننھا سا دل کانپ کانپ اٹھا۔

"مما... مما!" وہ چندا کی جانب ہاتھ بڑھا کر خوف سے چلایا۔ بے ہنگم قہقہے' کان پھاڑ دینے والا میوزک' پرفیوم کی تیز دماغ کو چکراتی خوشبوئیں سب ہی مل کر اسے وحشت زدہ کر گئے۔

"جاہل' کمینہ... ایسے مما' مما چلا رہا ہے جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔" چندا نے دانت پیسے۔

"بہت ہی ال مینرڈ بچہ ہے تمہارا' خوامخواہ چیخ رہا تھا۔ میں اچھی طرح ڈانٹ کر آئی ہوں۔ وہاں کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔" ستارہ نزاکت سے بولی۔

"بہانے نہ... باپ نے بگاڑا ہے۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"ہاں چھوڑو۔ اوہ ہائے مسٹر کریم انصاری' چندا ان سے ملو' یہ ہیں کوہ نور انڈسٹریز کے ایم ڈی۔" انصاری نے پرشوق نگاہ چندا پر ڈالی۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مس...؟" اس نے اپنا جملہ سوالیہ طور پر ادھورا چھوڑ دیا۔

"چندا۔" اس سے قبل کہ چندا کچھ اور کہتی' ستارہ نے جملہ مکمل کیا اور کسی اور جانب بڑھ گئی۔

"آپ کا نام بہت خوب صورت ہے' بالکل آپ کی طرح۔" وہ فدویانہ انداز میں بولا۔ اور اس کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا۔ قریب سے گزرتے ویٹر کی ٹرے سے مشروب کے دو گلاس اٹھانے لگا تو وہ بولی۔

"نو تھینکس... میں نہیں پیتی۔" اس نے ایک

گلاس اٹھا کر دوسرا یونہی چھوڑ دیا۔
"اوکے... اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"
"کچھ خاص نہیں۔" وہ مصنوعی مسکراہٹ تراشیدہ لبوں پر سجا کر بولی۔
"آپ کو کبھی کسی پارٹی میں دیکھا نہیں۔" اس نے مشروب کا گھونٹ بھر... کر پوچھا۔
"جی بس... " اس نے کسی قدر ٹھہر کر کہا' میں زیادہ پارٹیز میں آتی جاتی نہیں ہوں۔"
"آپ کو جانا بھی نہیں چاہیے' نظر لگ جانے کا اندیشہ ہے۔" وہ مسکرایا' وہ بھی مسکرادی۔
لوگ اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے' اس کے ساتھ لنچ یا ڈنر کرنے کے خواہش مند ہوتے تو کچھ ڈائریکٹ مطلب کی بات پر اتر آتے۔
یکا یک ہی اس کا دل بیزار سا ہو گیا۔ سو وہ معذرت کر کے ایک طرف آبیٹھی اور ویٹر کو جوس لانے کا کہا۔
اسے ایک بار بھی اپنے ساتھ آئے ہوئے سونو کا خیال تک نہیں آیا جو جمپنگ کیسل پر اچھلتے بچوں کو دیکھ کر بہل تو گیا تھا مگر گھبرا گھبرا کر پارٹی ہال کے بند شیشے کے دروازے کے پار بھی دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں چندا اسے چھوڑ کے چلی تو نہیں گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ تھک کر گلاس وال سے ماتھا ٹکا کر اندر جھانکنے لگا اس کی متلاشی نگاہیں چندا کو ڈھونڈ رہی تھیں جو رقص کرنے کے بعد ٹیبل پر بیٹھ چکی تھی۔
چندا کافی دیر سے بیزار بیٹھی ستارہ کے فارغ ہونے کی منتظر تھی کہ واپس بھی اس نے چندا ہی کے ساتھ جانا تھا۔ تب ہی کوئی اس کے نزدیک آکر دھیرے سے پکارا۔
"چندا!" اور چندا نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا۔ یہ دنیا اتنی بھی بڑی نہیں کہ ایک بار کوئی کھو جائے تو واپس نہیں مل پاتا' آج چندا کو اس بات پر یقین آگیا تھا۔



"جب انسان کی عمر بھر کی کمائی انسان کی آنکھوں کے سامنے لٹنے والی ہو اور انسان کچھ نہ کر پا رہا ہو...

بس یہی کیفیت اس وقت میری ہے مہ پارہ۔ میں نے اپنے بچوں کو پیار دیا' تحفظ دیا ان کی ضروریات کا خیال رکھا مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کی ماں نہیں بن سکا' میں نے انہیں تعلیم تو دلوادی مگر شاید ان کی تربیت نہیں کر سکا۔" وقار بہتے آنسوؤں کے ساتھ شکست خوردہ آواز میں کہہ رہے تھے۔ مہ پارہ ان کی حالت پر سراسیمگی سے پوچھنے لگیں۔
"بھائی صاحب! آخر ایسا کیا ہوا ہے جو آپ اس قدر ٹوٹ گئے ہیں؟"
"مہ پارہ... میری بیٹی مجھے اپنی راہ کی رکاوٹ' خوشیوں کا قاتل سمجھ رہی ہے... بتاؤ اگر میں اسے تباہی سے بچانا چاہتا ہوں تو کیا میں غلط ہوں؟" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولے۔
"آخر ہوا کیا ہے؟" وہ از حد پریشانی سے پوچھنے لگیں تو انہوں نے محتاط لفظوں میں بتایا۔
"ہوں... تو یہ بات ہے۔" وہ بھی فکر مند سی ہو گئیں۔
"اب تم بتاؤ میں کیا کروں وہ کسی طور سمجھنے پر آمادہ نہیں۔ سائرہ سے ابھی ہم نے اس کی ہٹ دھرمی اور ضد کسی نہ کسی طرح چھپا رکھی ہے مگر کب تک... کب تک ہم اس سے یہ سب چھپا سکتے ہیں اور اس کے بعد اس کا ردعمل کیا ہوگا مہ پارہ میں سوچ سوچ کر ڈر رہا ہوں۔" وہ تشویش سے بولے۔
"آپ پلیز ریلیکس رہیں۔ کرتے ہیں کچھ آخر تو ہماری بچی ہے ہم اسے ایسے اپنی زندگی خراب کرنے کی اجازت بالکل نہیں دے سکتے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔
"اس کے تیور بڑے خطرناک ہیں مہ پارہ! وہ ہماری کسی اجازت کی محتاج نہیں۔" وہ انہیں معاملے کی سنگینی سے آگاہ کرنا چاہ رہے تھے۔ پہلی بار وہ حقیقتاً" متفکر ہو گئیں۔
"تب پھر کیا... کیا جائے؟" وہ غالباً" خود کلامی کر رہی تھیں۔ "کچا ذہن ہے اسے بہکانا بھی آسان ہوتا ہے اور بہلانا بھی... میرا خیال ہے کہ آپ فوراً" ہی

اسے کہیں اور انگیج کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا دھیان اس لڑکے کی طرف سے ہٹ جائے گا۔" وقار صاحب کو مشورہ صائب لگا۔

"مگر مہ پارہ! فوری طور پر رشتہ کہاں سے لاؤں۔" ان کا ذہن مفلوج سا ہو رہا تھا۔

"کہاں سے لاؤں کیا مطلب… بھئی' میرا حمزہ آپ کے سامنے ہے۔ میں نے تو بہت پہلے ہی سے یہ سوچ رکھا تھا بس اس کی تعلیم مکمل ہونے کی منتظر تھی۔" وہ کھنکتے لہجے میں بولیں۔

"ارے…! وہ بے ساختہ سرخوشی سے بولے مگر پھر یکدم ہی انہیں ڈھیروں شرمندگی نے آلیا۔

"میرا مطلب یہ ہر گز نہیں تھا مہ پارہ!" وہ جلدی سے بولے "تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بھانجی کی محبت میں اپنے اکلوتے بیٹے کی حق تلفی کر جاؤ۔" انہیں اندیشے لاحق تھے۔

"بھائی صاحب! آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں میں نے آپ کو بتایا نا کہ میرا تو شروع سے یہی ارادہ تھا۔" وہ انہیں مطمئن کرنے کو صاف اور واضح الفاظ میں بولیں۔

"مگر تمہارے بیٹے کی بھی تو کوئی پسند ناپسند ہو سکتی ہے آخر کو آزاد ملک کا پروردہ ہے پھر تمہارے دیگر بہن بھائی… وہ نجانے کیا سوچیں۔" ان کی فکریں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

"اپنے بیٹے کی پسند میں اچھی طرح واقف بھی ہوں اور اس پر اعتماد بھی پورا ہے کہ وہ میری پسند سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا اور رہا بڑی آپا اور بھائی جان کا سوال تو کیا آپ بھول گئے ان دونوں ہی کی بیٹیاں میرے حمزہ سے کئی سال بڑی ہیں بلکہ آپا کی ماہین کا تو نکاح بھی ہو چکا اور پھر میرا بیٹا ہے' میری مرضی کہ میں کسے بہو بناتی ہوں' کسے نہیں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولیں۔ تب وقار صاحب بالکل ہلکے پھلکے ہشاش بشاش سے ہو کر کہنے لگے۔

"تم نے تو میری ساری فکریں ہی دور کر دیں مہ پارہ! اللہ تمہیں اجر عظیم سے نوازے' تو پھر کب آ رہی ہو پاکستان؟" ان کا اگلا سوال اور نئی فکر۔

"میں آج ہی حمزہ اور اس کے پاپا سے بات کر کے آپ کو کنفرم کرتی ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے' اب رکھتا ہوں۔ اوکے' اللہ حافظ۔" انہوں نے کہہ کر ریسیور کریڈل پر ڈالا۔ اور تھک کر بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

ان کی عمر بھر کی کمائی ایک مرتبہ پھر داؤ پر لگی تھی مگر اس بار نہ وہ انجان تھے نہ بے خبر۔ سو وہ کچھ ایسا پلان بنانا چاہ رہے تھے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اور یہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" والا پلان اکثر ہی ناکام ہو جاتا ہے۔ سو جلد یا بدیر اس منصوبے کا بھی یہی انجام ہونا تھا۔



"تم دھوکے باز اور فریبی ہو' نہ تم عین وقت پر میرے ساتھ دغابازی کرتے اور نہ میں ان حالات کا شکار ہو کر اس الو کے پٹھے کے پلے بندھتی۔" وہ سینے پر دونوں ہاتھ باندھے منہ نفرت سے موڑے پچھلے کئی منٹ سے نان اسٹاپ کچھ اسی قسم کی باتیں اپنے سامنے بیٹھے آصف شیرازی کو سنا رہی تھی۔ آصف شیرازی کی واپسی اس کی زندگی میں بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ گالف کلب والی پارٹی میں اس روز چندا سے ملا تھا۔

"چندا… چندا' میری مجبوری… تم مجھے کیوں نہیں سمجھ پا رہی ہو' بتایا نا تمہیں کہ مالکان نے فراڈ کے کیس میں مجھے اندر کروا دیا تھا۔ سارا نام' مقام اور روپیہ ڈوب گیا۔ بھلا ان بڑے لوگوں سے بھی کبھی کوئی لڑ سکا ہے۔ دو سال کی جیل کاٹی اور پھر جیسے تیسے وکیلوں کو رشوتیں کھلا کر کچھ عرصہ قبل ہی باہر آیا ہوں۔"

"ایک تو تمہارے پاس ہر سوال کے جواب میں کسی نہ کسی مجبوری کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

تو وہ غم زدہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"بیگم صاحبہ بن گئی ہو نا' اب تو تمہیں غریبوں کی

مجبوریوں بھری داستان غم بن کر کوفت ہی ہوگی۔"

"خاک بیگم صاحبہ بن گئی ہوں۔" وہ مزید تپ کر بولی "تمہیں کہاں سے میں بیگم صاحبہ دکھائی دے رہی ہوں آصف... امت میرے زخموں کو کریدو اس طرح۔"

اور اس پر آصف بولا کچھ نہیں بس اک خاموش نگاہ اس کے کانوں ہاتھوں' انگلیوں اور گلے پر ڈالی جہاں اس کے شوہر کی محنت اور حق حلال کی کمائی اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ آصف ان دنوں واقعی اس کی زلفوں کا اسیر تھا مگر اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ محض اس محبت کی خاطر اس سے شادی کر رہا تھا۔ بالکل نہیں!

وہ اسے پوری طرح "کیش" کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ زندگی میں شارٹ کٹ مارنے کی کوشش کر رہا تھا' مگر شومئی قسمت... کہ اسے دولہا کے بجائے قیدی بننا پڑا کہ وہ "بیک اپ پلان" کے طور پر ایک بڑے اور نامور شخصیت کی بیگم کو رجھانے میں کامیاب ہو کر ان دنوں ان کا ہمدرد' غمگسار بن چکا تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ اس کے "حقیقی ہمدردوں" اور دیگر "غمگساروں" نے اس کے شوہر تک اس بات کی خبر پہنچادی اور اس کے بعد وہی ہوا جو "عموماً" ہوتا ہے۔

بڑی دقتوں سے رہائی ملی۔ کچھ عرصے کے لیے وہ واقعی شہر سے باہر چلا گیا۔ مگر اب "رزق کی تلاش" میں پھر واپس اسی شہر میں آچکا تھا۔ اور سوئے اتفاق اسے چندا دوبارہ مل گئی۔

"مما... گھر چلیں!" سونو نے اس کا مہکتا پلو کھینچا۔ وہ ان دنوں جمیل کی ہدایت کے بموجب ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ ہی پھر رہا تھا۔ جبکہ چندا اس سے شدید تنگ آئی ہوئی تھی۔

"مجھ سے ملنے آرہی تھیں تو کم از کم اپنی شادی شدہ زندگی کی اس نشانی کو تو گھر پر چھوڑ آتیں۔" وہ جو وارفتگی سے چندا کو تک رہا تھا' اس کے مما پکارنے پر شدید بے مزہ ہوا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تم سے ملنے نہیں آئی۔" وہ نخوت سے بولی "میں تو یہاں روز شام کو آتی ہوں اب تم ہی نے میرا تعاقب کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے تو میں کیا کروں؟" وہ شان بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی تو اس کے انداز پر آصف دلبرانہ انداز میں ہنس دیا۔

"بہ خدا... تم میں آج بھی وہی ادا اور نزاکت ہے جو چند سال پہلے تھی ایمان سے اگر تم اس اشتہار کو لے کر نہ پھرو اپنے ساتھ۔" اس نے انگلی اٹھا کر سہمے ہوئے سونو کی جانب اشارہ کیا۔ "تو کوئی مر کر بھی یقین نہ کرے کہ تم شادی شدہ ہو۔" اس کی بات پر چندا کی اکڑی گردن مزید تن سی گئی۔

جبکہ پہلے سے سہما ہوا سونو آصف کی خود پر جمی ناپسندیدہ نگاہیں محسوس کر کے مزید خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے؟" وہ بے پرواہ لہجے میں بولی۔

"زندگی میں بنیادی چیز ہوتی ہے ارادہ' اگر ارادہ کرلو تو سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔" اس کی آنکھیں عجیب طرح سے چمکنے لگی تھیں۔

"مثلاً"... کیا ارادہ کرلوں میں؟" وہ استہزائیہ بولی۔

"یہی... یہی کہ۔" وہ اس کی مذاق اڑاتی نگاہیں خود پر محسوس کر کے گڑبڑا گیا۔ "تمہیں دنیا کو تسخیر کرنا ہے۔" پہلے اس کا ارادہ مجھ سے شادی کرنا ہے کہنے کا تھا۔ مگر چندا کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس بات پر سوائے قہقہہ لگانے کے کچھ نہ کرتی۔

"صرف ارادہ کر لینے سے دنیا تسخیر ہو جاتی تو میں اب تک کر چکی ہوتی۔" اس نے سر جھٹک کر کہا گویا اپنی حماقت کا احساس ہو چکا ہو۔

"ارادہ کے بعد عمل بھی ضروری ہوتا ہے۔"

"اپنے طور پر کر کے دیکھ چکی ہوں۔" اس نے دھیمے بیزار کن لہجے میں کہا۔

"اچھا... ذرا بتانا کیا کیا ہے تم نے اب تک؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

""بج سنور کر خود کو پیش کیا ہے، پارٹیز، فنکشنز اٹینڈ کیے ہیں مگر حاصل کیا ہوا؟ ساتھ لنچ ڈنر کرنے کی آفرز، گھومنے پھرنے وقت گزارنے کی فرمائشوں کے علاوہ۔"

آصف کی آنکھیں گہرے رنج میں ڈوب گئیں۔

""چندا۔۔۔ تم نے یہ سب کیا؟"" وہ متاسف ہو کر پوچھنے لگا۔

""تو اور کیا کرتی، جو خواب تم میری آنکھوں میں سجا گئے تھے آصف! وہ بہت رنگین تھا۔ اس سے دست برداری اتنی آسان نہیں تھی سو مجھے جو سمجھ میں آیا کرتی گئی۔"" وہ بھی کسی قدر اداسی سے بولی۔

مگر یہ اداسی سوائے ناکامی کے کسی اور چیز کی نہیں تھی۔

""دچ چچ۔۔۔ میں تو تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہ ظالم وقت۔۔۔"" چندا نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر جانچتے لہجے میں پوچھا۔

""اب کیا کر سکتے ہو، یہ بتاؤ، کیا کرنا چاہتے تھے کا وقت گزر گیا ہے۔"" تب وہ یکدم خاموش ہو کر اس کی صورت تکنے لگا پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔

""تم صرف یہ بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو، تمہیں تمہاری چاہت تک پہنچانا اس دیوانے کا کام ہے۔"" چندا کے خوب صورت لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

""چلو دیکھتے ہیں کہ تم اپنے دعوے میں کس حد تک سچے ہو۔"" اس نے بے یقین لہجے میں کہا تھا۔

""مما! چلیں نا۔۔۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"" سونو سخت عاجز آیا ہوا تھا۔

""ایک تو تمہیں کوئی نہ کوئی مصیبت لاحق رہتی ہے، اٹھو۔"" وہ اسے بری طرح جھڑک کر اٹھی۔

""پھر کب ملو گی؟"" آصف بے تابانہ کھڑا ہوا۔

""روز تو آتی ہوں یہاں۔۔۔ یہیں اور کہاں۔"" اس نے اپنا بلیک پرس اٹھا کر کندھے سے ٹکاتے ہوئے کہا اور قدم بڑھا دیے۔ آصف بڑے معنی خیز انداز سے اس کی پشت تک رہا تھا۔



وقار صاحب نے میرب کو ساری بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب میرب اس کشمکش و پیچ میں تھی کہ اجیہ کو بتائے یا نہ بتائے۔۔۔ بتانے کی صورت میں اسے قابو کرنا مشکل ہو جاتا جب کہ نہ بتانے کی صورت میں بھی یہی صورت حال ہوتی۔ تب ہی اس نے ماریہ کو کال ملائی۔

""ایک تو مجھے سمجھ یہ نہیں آرہی کہ آخر اس پر اتنا بچپنا کیوں سوار ہے تم لوگ اس کے خیر خواہ ہو، وہ تم لوگوں ہی کو کیوں پریشان کر رہی ہے؟"" ساری صورت حال جان کر ماریہ غصے سے بولی۔

""یہی تو پرابلم ہے ماریہ، وہ اپنے بدخواہوں اور خیر خواہوں میں امتیاز نہیں کر سکتی۔"" میرب بے چارگی سے بولی ""وہ جذباتی ہے، قدرے لاابالی ہے اور پھر واقعی وہ کسی حد تک معصوم بھی ہے۔ اب ایسے میں اسے کیسے سمجھایا جائے؟""

""ہوں۔۔۔ مگر یار! تم تو اتنی ٹینشن مت لو، اپنی کنڈیشن دیکھو۔ ایسے میں اتنے تفکرات پالنا ٹھیک ہے کیا؟""

""یار اس گھر کی فکر اگر میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا؟"" میرب نے اسے لاجواب کر دیا۔

""خیر۔۔۔ ہو تو صرف یہی سکتا ہے کہ اسے پیار و محبت سے سمجھایا جائے۔ زور زبردستی تو یوں بھی خطرناک ہو گی۔""

""مسئلہ تو سارا یہی ہے کہ وہ پیار محبت سے بھی ہرگز نہیں مانے گی۔"" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

""تب پھر یہی ہو سکتا ہے کہ فی الحال تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور مناسب وقت کا انتظار کرو، جو کچھ ہو رہا ہے بالآخر اسے پتا چل ہی جانا ہے۔"" ماریہ نے کہا۔

""ہاں۔۔۔ یہی ٹھیک ہے، اور سناؤ۔۔۔ گھر میں سب کیسے ہیں؟""

"سب ٹھیک الحمدللہ۔ کل میں امی کے ساتھ کراکری لینے گئی تھی۔" اس نے خوشی سے بتایا تو گفتگو کا رخ اس کی شادی کی تیاریوں کی جانب مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

"کہاں کی تیاری ہے؟" آج خلاف معمول جمیل گھر پر ہی موجود تھا اور ہلکے پھلکے حلیے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ تب ہی چندا اپنے ازلی بیزار انداز میں کمرے سے باہر نکلی۔ اس کی تیاری دیکھ کر جمیل پوچھ بیٹھا۔

"اپنی دوستوں سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"آج میں گھر پر ہوں... مت جاؤ تم۔" اس نے اس کی جانب دیکھ کر چاہت سے کہا۔

"کیوں نہ جاؤں۔" وہ چمک کر بولی "گھر میں بیٹھ کر کیا ملے گا مجھے۔"

"میرا پیار... میری محبت۔" وہ اسے دیکھ کر نرمی سے بولا۔

"مگر مجھے نہیں چاہیے۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر "رفیق رفیق" چلانے لگی۔

"حق ہا..." جمیل نے مصنوعی تاسف سے سرد آہ بھری۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ آج تمہارے ساتھ گھوموں گا پھروں گا، تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔" اسے گویا لالچ دیا۔ وہ ایک پل کو ٹھہری۔ پھر اس کی جانب مڑ کر طنزیہ لہجے مگر میٹھے انداز میں بولی۔

"اچھا شاپنگ! مگر کہاں سے؟"

"جہاں سے تم چاہو؟" وہ فراخ دلی سے بولا۔

"دبئی... لندن، پیرس یا نیویارک؟ کہو کہاں لے جا سکتے ہو؟" اس کے یوں کہنے پر جمیل کھسیا کر ہنس دیا۔

"فی الحال تو یہیں کی کسی بھی اچھی سے اچھی اور مہنگی دوکان سے۔" اس نے کہا۔

"ہونہہ... وقت بدل رہا ہے جمیل صاحب! خود کو بدلیں... مجھے زمانے کی رفتار کے ساتھ دوڑنے والے لوگ متاثر کرتے ہیں۔ خیر میں جانتی ہوں کہ دوڑنا تو آپ کے بس سے باہر کی بات ہے۔ کم از کم تیز چلنا ہی سیکھ لیں۔" وہ اپنی رسٹ واچ کو دیکھ کر بولی۔

"آہستگی سے مگر مسلسل چلتے رہنا اونچائی پر چڑھنے کا درست طریقہ ہے، تیز دوڑنے والے یا تو جلد تھک کر گر پڑتے ہیں یا پھر پھسل جاتے ہیں۔" اس کا انداز اس کی بات کی گہرائی کی غمازی کر رہا تھا۔

"خیر... مجھے کوئی بحث نہیں کرنی تم سے۔" وہ زیادہ دیر تک آپ جناب کر نہیں پائی "رفیق... کہاں مر گئے ہو۔" اب کی مرتبہ اس نے جلالی آواز میں اسے پکارا تو وہ بوتل کے جن کی طرح "فوراً" نمودار ہو گیا۔

"جی بیگم صاحبہ؟" وہ ہاتھ باندھ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

"فوراً" سے پیشتر گاڑی نکالو... مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ تحکمانہ انداز میں کہہ کر خود بھی باہر نکلنے لگی۔

جمیل نے پھر دوبارہ اسے مخاطب نہیں کیا، خاموشی سے ایک مرتبہ پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ چلی گئی تب سونو اپنے کمرے سے باہر نکلا اور آ کر جمیل کے پاس آ کر جھجک کر کھڑا ہو گیا۔

جمیل نے چونک کر اسے دیکھا اور بانہیں پھیلا کر کہا۔

"بابا کے پاس آ جاؤ میرا بیٹا۔" وہ فوراً ہی اس کی گود میں آ کر بیٹھ گیا۔

"تم سو رہے تھے اندر؟ دیکھیں تو اب تمہارا زخم کیسا ہے؟" جمیل نے اس کا چہرہ اپنی جانب کر کے زخم دیکھا۔ ٹھیک تھا، تاہم نشان اب بھی باقی تھا۔ اس نے سونو کا گال پیار سے چوم کر چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"نہیں میں سو نہیں رہا تھا... اندر زینت بی سے اسٹوری سن رہا تھا اور مما کے جانے کا ویٹ بھی۔" وہ معصومیت سے بولا۔ جمیل چونکا۔

"مما کے جانے کا ویٹ کیوں؟ اچھا... اچھا۔" اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"آپ روز ان کے ساتھ جاتے ہو نا، مگر آج وہ آپ کو لے کر نہیں گئیں، بابا کی وجہ سے گھر پر چھوڑ دیا۔ اب ہم دونوں پارک چلیں گے ٹھیک؟"

"آپ مما کو تو نہیں لے کر چلیں گے نا؟"
"ارے بتایا تو آپ کو وہ تو چلی گئیں۔"
"بابا! مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔
"سونو!" اس نے تنبیہی انداز میں اس کا نام لیا تو وہ سہم گیا تب ہی وہ نرمی سے پوچھنے لگا۔
"بری بات بیٹا کیوں اچھی نہیں لگتیں وہ آپ کو؟"

"مجھے ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں، مجھے اسٹوریز بھی نہیں سناتیں۔ بابا! آپ کو پتا ہے میرے دوست شانی کی مما روز اسے لنچ بنا کر دیتی ہیں اور کھانا بھی اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہیں اور علی کی مما اسے گھمانے بھی لے جاتی ہیں۔" اس نے یوں بتایا گویا بڑے پتے کی بات بتائی ہو۔ جمیل جو اس کی بات پریشانی سے سن رہا تھا یکدم بولا۔
"گھمانے تو آپ کی مما بھی آپ کو لے جاتی ہیں۔"
"نہیں بابا... وہ مجھے رائڈز والی جگہ تھوڑی لے جاتی ہیں۔ بس اپنے فرینڈز کے ساتھ باتیں یا ڈانس ہی کرتی رہتی ہیں۔ وہاں جا کر مجھے ڈر لگتا ہے بابا۔" اس نے خائف ہو کر بتایا۔
وہ اس اطلاع پر چونکا اس لیے نہیں کیونکہ جمیل کو چندا نے بتایا تھا کہ وہ لیڈیز کلب جاتی ہے اور اگر وہاں جا کر وہ باتیں یا وزن کم کرنے کے لیے ڈانس وغیرہ کر لیتی ہے تو اس میں تو کچھ مضائقہ نہیں۔
"اچھا چھوڑو... اب مت جانا ان کے ساتھ۔ اب جاؤ زینت بی سے کہو تمہیں تیار کر دیں۔" اس نے اسے کہا اور خود اپنا ماتھا سہلانے لگا۔ جہاں تفکرات کا جال پھیلا ہوا تھا۔ سونو اپنی ماں سے دور ہو رہا تھا، خائف ہو رہا تھا۔
اور یہ بہت خطرناک بات تھی۔

☼ ☼ ☼

"آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ اس گھر میں چل کیا رہا ہے؟" میرب لالی کے ساتھ مل کر رات کا کھانا تیار کر رہی تھی تب ہی جھنجلائی ہوئی سی اجیہ نے کچن میں آ کر میرب سے یہ سوال کیا۔ وہ چونک کر مڑی پھر اجیہ کا جھلایا اور غصیلا انداز بغور دیکھ کر لالی سے بولی۔
"چکن کو تھوڑا بھوننے کے بعد ٹماٹر چوپ کر کے ڈال دینا اور ہاں اجیہ آؤ لاؤنج میں چل کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کرتے ہوئے بولی۔
"مجھے اطمینان کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ بابا نے ابھی تک آغا کے گھر والوں کو جواب کیوں نہیں دیا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ میرب کشمکش میں مبتلا ہو گئی کہ آخر اسے بتائے تو کیا بتائے۔ سمجھائے تو کیا سمجھائے؟
"دیکھو... اچھی طرح چھان بین کے بعد۔"
"وہاٹ چھان بین؟ کیا وہ کوئی غنڈہ موالی ہے جو اتنی تفتیش کی جا رہی ہے؟ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔" وہ بری طرح غصے میں آ کر چلائی تھی۔
"پلیز اجیہ! تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" میرب ملتجی ہوئی۔
"آپ لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں" وہ چبا چبا کر بولی۔ "یہ جو ڈرامے بازی یہاں چل رہی ہے، اسے جلدی ختم کر کے جلدی میری شادی کی تیاری شروع کر دیں تو آپ لوگوں کے لیے اچھا ہے ورنہ..." اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں ورنہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"ورنہ کیا...؟" اور کچن کے دروازے سے آتی اس آواز نے میرب کا خون تو خشک کیا ہی تھا۔ اجیہ بھی اس لہجے کی ٹھنڈک پر کانپ اٹھی۔
"ورنہ کیا... تمہارے ارادے کیا ہیں ذرا میں بھی تو سنوں۔" سائر ہنوز ٹھٹھرے ہوئے لہجے میں خون آشام نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ دونوں ہاتھ اس نے پینٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے۔
"سائر پلیز۔" میرب گھبرا کر جلدی سے آگے بڑھی "آپ چلیں اوپر۔" میرب نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر

منت بھرے انداز میں کہا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"جاؤ اجیہ... اب خاموش کیوں کھڑی ہو۔" وہ اچانک ہی بری طرح سے چلایا تو بے ساختہ اجیہ کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے ادھر؟" وقار صاحب نے آکر ڈپٹ کر پوچھا "کیوں چیخ پکار مچا رکھی ہے یہاں؟"

"پوچھیے اپنی لاڈلی سے؟ کیا کہہ رہی تھی یہ میرب سے؟" سائر نے وقار صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ میرب... تم اور اجیہ اپنے کمرے میں جاؤ اور تم۔" انہوں نے قدرے خفگی سے سائر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم آؤ میرے ساتھ۔" کچھ دیر بعد سائر اور وقار صاحب' وقار صاحب کے کمرے میں تھے سائر ہنوز طیش میں یہاں سے وہاں ٹہل رہا تھا جبکہ وقار صاحب کچھ پریشان فکر مند اور ناراض سے بیٹھے تھے۔

"آپ جانتے ہیں' وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔" وہ بولا۔

"نہیں جانتا... نہ جاننا چاہتا ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ میری بیٹی ہے اگر نادانی پر کمربستہ ہے تو اس کو سنبھالنا' صحیح راہ دکھانا میرا ہی کام ہے۔ زور زبردستی سے سوائے معاملے کے بگڑنے کے کچھ نہیں ہوگا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر قطعیت سے کہا۔

"یہ نہ ہو کہ آپ راہ ہی دکھاتے رہ جائیں اور وہ اپنی منزل پر پہنچ بھی چکی ہو۔" وہ تمسخرانہ بولا تو اب کی بار وقار صاحب نے بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہارا طرز فکر اتنا منفی کب سے ہو گیا؟"

"حقائق... بابا حقائق۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ "حقیقت پر مبنی منظر نامہ عموماً" مثبت نہیں ہوتا۔"

"اس سچویشن میں تمہارا طرز عمل کسی حد تک حق بجانب اور نیچرل ہے مگر بیٹا معاملے کو سلجھانا ہوتا ہے' ایسے غصے میں آکر الٹا سیدھا بولنے سے سوائے پچھتاوے اور شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"اچھا؟ تو آپ بتائیں ذرا پھر کیسے سلجھے گا یہ معاملہ؟"

وہ تڑخ کر بولا۔

"بات ہوئی ہے میری مہ پارہ سے' پرسوں تک آ رہی ہے' وہ پاکستان اپنے بیٹے کو لے کر۔ فی الحال صرف نکاح ہوگا پھر جیسے ہی اجیہ کے کاغذات تیار ہوں گے ویسے ہی رخصتی۔" وہ دھیمے اور مطمئن لہجے میں بتانے لگے۔

"کیا...؟" سائر نے خوشگوار حیرت میں گھر کر بے ساختگی سے کہا "کب ہوئی آپ کی بات؟" اس کے انداز پر وقار سکون سے مسکرا دیے۔

"کچھ روز قبل اور ہاں... تم اکلوتے بھائی ہو اجیہ کے' میں تم سے التجا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کی نادانی بھول جاؤ اور آگے کا سوچو' بن ماں کی بچی ہے دنیا کی اونچ نیچ کون سمجھاتا سو لڑکھڑا گئی۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سائر بھی عجیب مضطرب سا ہو گیا۔

"میں سمجھتا ہوں بابا... اور آپ بے فکر رہیں۔ مجھے خود سے زیادہ اس کی فکر ہے۔" اس نے گھٹنوں کے بل ان کے نزدیک بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھپتھپایا تو جواباً" وہ اس کے گھنے بالوں والے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"اپنی بھی فکر کرو بیٹا!" وہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھ کر فکر مندی سے بولے "اور میرب بیٹی کی بھی' وہ بہت پیاری بچی ہے۔ تمہاری نسل کی آبیاری کر رہی ہے اسے خوش رکھو' محبت دو۔ وقت دو۔ اس کا خیال رکھو تب ہی وہ اک صحت مند زندگی کو جنم دے پائے گی۔"

"اچھا!" وہ یوں کھڑا ہوا گویا کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "آپ آرام کریں۔ نکاح کے انتظامات کے سلسلے میں جو کچھ بھی کرنا ہو' مجھے بتا دیجیے گا۔" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بنا کمرہ عبور کر گیا۔ وقار نے تھک کر چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

"زندگی ہر موڑ پہ اتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی کیوں ہو جاتی ہے... آخر۔" وہ سوچ رہے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ انہوں نے سائر کو تسلی دے دی تھی مگر ان کا دل... نجانے یہ کم بخت کیوں دھڑکے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا

تھا کہ کچھ ہوگا... مگر کیا یہ نہیں معلوم۔



"آج وہ تمہارا ٹریڈ مارک ساتھ نہیں ہے؟" آصف نے مشروب کا گھونٹ بھر کر چندا سے یونہی استفسار کیا۔

"ہوں... آج اس کا باپ گھر پر تھا تو میں وہیں چھوڑ آئی۔" چندا نے ٹیبل پر رکھی اشیاء پر نگاہیں جما کر کہا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" آصف نے کرسی سے کمر ٹکا کر نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"چھوڑو بھی۔" وہ سخت اکتائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ "کوئی اور بات کرو اور وہ بھی کام کی۔" اس کا لہجہ تنبیہی ہو گیا۔

"یہ عشق و محبت بھی تو اک کام ہی ہے اور وہ بھی مسلسل۔" وہ ہنسا۔

"جملہ درست کرلو' یہ عاشقی داشتی ان کے لیے ہے جو اور کوئی کام نہیں کرتے۔" وہ کہہ کر گردن گھما کر دیکھنے لگی۔ کوئی لڑکی زرق برق کپڑوں میں ملبوس اچانک سے نمودار ہونے والے کیمرہ مین اور فوٹو گرافر کو بڑی کوفت اور نزاکت سے کچھ منع کر رہی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ موجود سوٹڈ بوٹڈ آدمی یکدم ہی گھبرا کر رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کون ہے یہ؟" اس نے جانچتی' تولتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ..." آصف سیدھا ہوا' خالد نیازی کو جانتی ہو' وہی جو اس کے ساتھ ہے۔ فلم پروڈیوسر ہے اس کی داشتہ ہے۔ اس کی فلم میں ہیروئن بھی آرہی ہے۔" اس نے معلومات بہم پہنچائیں۔

"کوئی خاص تو نہیں۔" چندا ناک چڑھا کر اس کے مصنوعی ناز و انداز دیکھ رہی تھی۔

"نہ ہو... مگر نیازی کی فلم کی ہیروئن بہرحال ہے تو یہی۔" وہ دل جلانے والی ہنسی ہنس کر بولا۔

اور واقعی نہ صرف چندا کا دل بلکہ جسم بھی دھڑ دھڑ جلنے لگا۔

"اس انڈسٹری میں سیدھے سادے طریقے سے بھی کچھ ہوتا ہے؟" اس نے جل بھن کر پوچھا۔

"ہوتا ہے میری جان... ہوتا ہے... مگر کن کے ساتھ؟ یہ بات صیغۂ راز میں رہنے دو۔" وہ نشے میں ڈولنے لگا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے' تم تب بھی ناکارہ تھے' اب بھی نکمے ہو۔ مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ اپنی مقرر کردہ حدود کے ساتھ تو اس فیلڈ میں آگے بڑھا جا نہیں سکتا۔" وہ اس لڑکی کو دیکھ کر فرسٹریٹڈ ہو گئی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے... یہ حدود وود تو سب بے کار' ناکام لوگوں کی باتیں ہیں' اپنی سوچ تو یہ ہے کہ اپنے اور کامیابی کے درمیان آنے والی ہر رکاوٹ کو خواہ جائز یا ناجائز کسی بھی طریقے سے دور کردو۔" وہ بے حد جذباتی ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر کہنے لگا اور اس کا ہلتا ہوا ہاتھ شیشے کے بیش قیمت اور نازک گلاس سے جا ٹکرایا' نتیجتاً" گلاس زمین بوس۔

ہال میں موجود سب ہی نے اک پل کو مڑ کر دیکھا۔ چندا نے خفت زدہ ہو کر آصف کو گھورا۔

"جب سنبھالی نہیں جاتی تو پیتے کیوں ہو؟" خوامخواہ گلاس کا نقصان کردیا' اب یہ خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔"

"آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو تم بھی مجھے طعنے دو لو" وہ لڑکھڑاتی گلوگیر آواز میں بولا۔ "مگر دیکھنا بہت جلد میں تمہارے سارے پیسے سود سمیت لوٹا دوں گا۔"

"بکواس بند کرو اور اٹھو... تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے' بے ہودہ' جاہل شخص ہو تم۔" وہ شدید غصے میں آگئی۔ اشارے سے ویٹر کو بلا کر بل لانے کے لیے کہا۔

"بدن پہ ستارے لپیٹے ہوئے" وہ اونچا اونچا گا رہا تھا۔ اور وہ بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور کوئی اور بھی انہیں دیکھ رہا تھا مگر انہیں خبر نہیں تھی۔



"کیا!" آغا فون پر تقریباً" دھاڑا تھا۔ اجیہ نے

روتے ہوئے اسے ساری بات من و عن بتادی تھی۔

مہ پارہ اپنے اکلوتے 'پڑھے لکھے' خوبرو بیٹے اور اپنے میاں کے ساتھ پاکستان آچکی تھیں اور گھر آکر انہوں نے جس والہانہ انداز میں اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا' وہ انداز اجیہ کو بری طرح کھٹک گیا تھا۔

تب ہی اس نے آغا کو ساری بات صاف صاف بتا دینے کا سوچا تھا۔

"پاگل تو نہیں ہو گیا تمہارا بھائی۔ اس کو کسی نے میرے متعلق ایسی خبریں پہنچائیں کیسے؟"

"مجھے کیا معلوم۔۔۔" اجیہ نے روتے ہوئے کہا "آغا پلیز کچھ کرو' میں نہیں رہ پاؤں گی تمہارے بغیر۔" وہ باقاعدہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

"کیا کروں میں اب۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی تمہارے بھائی اور باپ کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انکار کر دیں گے۔"

"ان کے انکار کرنے سے کیا ہوتا ہے' مجھے تو تم ہی سے شادی کرنی ہے اور بس۔" وہ کسی قدر دلیری سے بولی تو آغا نے پر سوچ لہجے میں پوچھا۔

"اس کا مطلب ہم کوئی بھی بولڈ اسٹیپ لینے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں ہوں۔۔۔ ٹھیک کہتی ہیں امی ابا' کہ بابا بہت سنگ دل' کٹھور بے رحم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت چالاک بھی ہیں۔ کس قدر مہارت سے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ خالہ جانی کو بھی انہوں نے ہی یہاں بلوایا ہے۔"

"تب تو تم تیار رہو۔۔۔ "ہمیں فوراً" ہی کچھ کرنا ہو گا۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ مگر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آغا۔" اس نے متوحش لہجے میں کہا۔

"وہ کیا کہتے ہیں کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" اس نے ہنس کر اسے حوصلہ دینا چاہا۔

"ہاں اچھا سنو' دروازے پر کوئی ہے۔ میں بعد میں بات کرتی ہوں۔" کہہ کر جلدی سے رابطہ منقطع کر دیا۔ آغا منہ بنا کر رہ گیا۔

"کیا ہو گا اب آغا؟" نتاشا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ دوران گفتگو وہ سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"ہونا تو وہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔" اس نے فون صوفے پر اچھال کر بے فکری سے کہا۔ اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر مطمئن انداز میں بیٹھ گیا۔

"کیا تمہیں اجیہ واقعی اچھی لگتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تو پھر اس سے شادی کیوں کر رہا ہوں؟" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

"وہ تو تم پہلے بھی تین کر چکے ہو۔" اس نے طنزیہ کہا۔ تو وہ ہنس پڑا۔

"ہاں۔۔۔ تو کیا ہوا' وہ بھی اچھی ہی تھیں' بری نہیں تھیں۔"

"مگر آغا۔۔۔ اجیہ بہت انوسینٹ ہے۔ میں تمہیں جانتی ہوں' کچھ روز بعد وہ تمہارے دل سے اتر جائے گی تمہیں تو یقیناً" کوئی اور پسند آجائے گی مگر وہ ٹوٹ جائے گی بیچاری۔" وہ افسوس کرنے لگی۔

"نہیں یار۔۔۔ پہلی کا تو پتا نہیں مگر یہ میری ڈیفی نیٹلی آخری محبت ہے۔" اس نے پر وثوق لہجے میں کہا۔

"تم ہر بار یہی کہتے ہو آغا۔" اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"ہر بار یہ دل کم بخت دغا دے جاتا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"تمہیں اس کو سب سچ بتا دینا چاہیے تھا' جب اسے ان سب باتوں کا پتا چلے گا تو بہت ہرٹ ہو گی وہ۔" اس نے کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا!" وہ بدک کر سیدھا ہوا۔ "خبردار اور تم بھی اسے یہ سب مت بتانا۔ وہ بہت مختلف مزاج کی لڑکی ہے' جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اس کے لیے یہ باتیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔"

"اور بعد میں اسے یہ سب پتا چل گیا تو؟" نتاشہ نے کہا تو وہ لاپروائی سے بولا۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی یار اور فی الحال' تم

مجھے خوامخواہ آنے والے وقت کے اندیشوں میں دھکیل کر بور مت کرو۔"
وہ ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر قدرے چڑ کر بولا تھا۔ یوں بھی نتاشا کو دیر ہو رہی تھی سو وہ بھی اس کے پاس سے اٹھ گئی۔



"ماشاء اللہ... ماشاء اللہ" مہ پارہ نے ہیروں کا سیٹ جو وہ اس کے لیے بطور خاص لائی تھیں اس کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ہنوز بے تاثر چہرہ اور خالی خالی نگاہیں لیے بیٹھی رہی۔
بالآخر وہ مناسب وقت آ ہی گیا تھا جب اجیہ کے علم میں ساری بات لائی جا رہی تھی اور یہ کام مہ پارہ بذات خود سر انجام دے رہی تھیں۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے میرب بھی موجود تھی اور وہ دونوں سامان اٹھائے اس کے کمرے میں کچھ دیر قبل ہی آئی تھیں۔
"کیوں اجیہ... زیورات اور اپنا نکاح کا جوڑا پسند آیا؟"
"نن... نکاح کا جوڑا۔" وہ ہکلا گئی "کس کا نکاح؟" اس نے عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھا تو وہ سنبھل کر کرنا شروع ہوئیں۔ میرب دل ہی دل میں مختلف قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی۔
"دیکھو میری جان... ہمیں بہت سی چیزیں اپنے لیے پسند آجاتی ہیں مگر کچھ اس میں سے ہمارے لیے نقصان دہ بھی ہوتی ہیں اور اولاد کو بچانا والدین کا فرض ہوتا ہے نا۔" وہ بہت نرم روی اور حلاوت سے کہہ رہی تھیں۔
"مگر مجھے یہ نکاح نہیں کرنا۔" وہ شدید ترین پریشانی میں گھری اسی قدر کہہ سکی۔
"کیوں بیٹا... ہم بڑے پیار سے، بڑی چاہ سے تمہیں اپنا رہے ہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ اور فکر اپنے دل میں مت پالو۔" وہ مسکرا کر بولیں۔
"اور دیکھو نا۔" میرب نے ان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خالہ جان تم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ کتنا خیال رکھتی ہیں تمہارا ارے بھئی ایسی ساس تو نصیبوں والی کو ملتی ہے۔" وہ لوگ یقیناً" اسے بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہے تھے اور اجیہ کوئی نادان بچی نہیں تھی جو سمجھ نہیں پاتی اور وہ کچھ بھی کہہ لیتی۔ کوئی بھی اعتراض کر لیتی مگر ان لوگوں نے اسے یونہی پیار محبت سے جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعے قابو کر لینا تھا۔ یہ بات وہ سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے سر جھکائے خاموش بیٹھی یہی سوچ رہی تھی۔
"کیوں بیٹا... کچھ کہو تو سہی... اچھا چلو یہ ہی بتا دو کہ اپنا ڈریس اور جیولری پسند آئی؟" مہ پارہ نے اس کی ٹھوڑی شرارت سے چھوتے ہوئے پوچھا۔
تو اس نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
مہ پارہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرب کو کچھ اشارہ کیا۔
"اچھا بھئی... اب تم آرام کرو، کل عصر میں تمہارا نکاح ہے میرے بیٹے حمزہ کے ساتھ اور رات میں یہیں لان میں چھوٹا موٹا نکاح کا فنکشن۔" وہ خوشی سے بتانے لگیں۔
وہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی میرب سرعت سے کمرہ عبور کر گئی۔ مہ پارہ بھی اس کا ماتھا نم آنکھوں سے چوم کر باہر چل دیں۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس قابو میں آئے اور ذہن سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو اس نے فوراً" سے پیشتر آغا کو کال ملائی۔
"ہیلو آغا... کل یہ لوگ میرا نکاح کر رہے ہیں۔" وہ بے قراری سے رو پڑی۔
"ہیل آن دیم... اور پلیز، یہ رونا دھونا بند کرو اور اب غور سے میری بات سنو۔" وہ اسے جلدی جلدی کچھ بتانے لگا۔ جسے سن کر اجیہ کی آنکھوں کی چمک لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی گئی۔



"یار! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ پلیز تم دیکھ لو۔" جمیل نے بے دلی سے ٹیبل پر موجود اہم دستاویز

کی فائل پرے کھسکا کر میز ہی پر تھکے تھکے انداز میں سر ٹکا دیا مقابل کرسی پر کوئی بزنس رسالہ دیکھتے ہمدانی نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے جمیل ۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟" اس نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"بس یار۔۔۔ عجیب سی تھکن اور بے نام سی اداسی اور الجھن ذہن و دل پر سوار ہے۔۔۔ سمجھ نہیں آرہا کیا کروں؟" اس نے سر ٹیبل سے اٹھا کر انگلیاں بالوں میں پھنساتے ہوئے کہا۔ ہمدانی بڑے عمیق نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دنوں سے جمیل اسے الجھا الجھا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ کام پر بھی اس کی توجہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اور یہ کاروباری نقطہ نظر سے کوئی اچھی بات نہیں تھی پھر یہ بھی تھا کہ جمیل سے کافی پرانی شناسائی تھی جو بعد ازاں دوستی اور اب بزنس پارٹنرز میں بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ جمیل ایک سیلف میڈ انسان تھا۔ کم عمری ہی میں اس پر ذمے داریوں کا کوہ گراں آگرا تھا۔ مگر وقت نے ثابت کیا کہ وہ اس ذمے داری کا واقعی اہل تھا۔ والد کی وفات کے بعد اس نے جس طرح چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالا وہ نہ صرف قابل ستائش بلکہ لائق داد و تحسین بھی تھا۔ بہنوں کو اچھی طرح بیاہ دیا۔ بھائی کو بھی سیٹل کر دیا' تب کہیں جا کر ایک دوست کے احساس دلانے پر اسے اپنا گھر بسانے کا خیال آیا۔ بہنوں کو کہا وہ آنا کانی کرنے لگیں' وہ خود غرضی سے سوچ رہی تھیں تب ہی ان کے دوست علی احمد ہی نے اس کا رشتہ اپنے دوست کی بہن سے لگا دیا' وہ پوری ایمانداری اور محبت کے ساتھ رشتہ نباہ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا۔ اس کی ضروریات بلکہ عیش و آرام تک کا خیال رکھتا تھا۔ یوں بھی اگر بیوی کم عمر ہو اور بے انتہا نازک اور خوب صورت ہو تو اک اوسط درجے کی پرسنالٹی رکھنے والے قدرے بڑی عمر کے شوہر کے پاس سوائے بیوی سے عشق کرنے یا شک کرنے کے کیا باقی رہ جاتا ہے؟

مگر شک کرنا جمیل کی فطرت نہیں تھی اور بات بات پر بیوی پر پہرے بٹھانا اس کی سرشت میں شامل نہ تھا۔ وہ نہ صرف روشن خیال بلکہ کسی حد تک لاپرواہ بھی تھا۔ جس شخص نے اپنی صوم و صلوٰۃ کی پابند باپردہ ماں کو دیکھا ہو' چار دیواری میں خود کو محفوظ تصور کرنے والی بہنوں کے علاوہ کسی عورت کو قریب سے نہ دیکھا ہو' شاید وہ عورت ذات کے متعلق اس سے زیادہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا کہ عورت وفا ہے' حیا ہے' **نغمگی** ہے' حسن ہے گھر کی زینت اور روح کا سکون ہے۔ اور یہی جذبات چندا کے لیے جمیل کے تھے اور ہمدانی اس کا اچھا دوست ہونے کے ناتے کسی حد تک اس کے خیالات سے واقف بھی تھا مگر۔۔۔۔

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ دن کی چھٹی لے کر بھابی کے ساتھ کہیں گھوم پھر آؤ۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کہاں لے کر جاؤں۔" وہ عاجز لہجے میں بولا۔ "وہ لندن' پیرس' نیویارک گھومنے کی بات کرتی ہے اور اسے وہاں لے جانا فی الحال میرے بس کی بات نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی یار۔۔۔!" ہمدانی اچنبھے سے بولا۔ "ڈائریکٹ اتنی اونچی اڑان؟"

"ہاں یار۔۔۔ وہ ایسی ہی ہے' ہر چیز اسے اعلا اور مہنگی سے مہنگی چاہیے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو آخر؟"

"کیا بتاؤں؟" جمیل نے اسے یوں دیکھا گویا کہوں یا نہ کہوں؟

"مجھے لگتا ہے' وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔" جمیل نے تاسف و بیچارگی کے ملے جلے لہجے میں بتایا۔

"اچھا! مگر کیوں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"پتا نہیں یار۔۔۔ وہ ہر وقت مجھے غریب ہونے کے' اپنی خواہشات کی تکمیل نہ ہونے کے طعنے دیتی رہتی ہے۔"

"حیرت ہے۔" وہ کسی قدر استہزاء سے بولا۔ "وہ خود کون سے ساؤنڈ بیک گراؤنڈ سے ہیں' میرے خیال سے تو وہ تمہارے گھر میں نہایت ہی عیش و آرام بلکہ ہر طرح کی آزادی سے رہ رہی ہیں۔" اس کی نگاہوں میں

وہ منظر گھوم گیا۔
"کہیں ان کی ناخوشی کے پیچھے کوئی اور وجہ تو نہیں؟"
وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔
"کیا مطلب؟" جمیل نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔
"کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں اعتراض اور مسئلہ تمہاری ذات پر ہو' میرا مطلب ہے کہ... کہ خیر جانے دو۔" وہ کچھ بولتے بولتے **جھجھک** کر خاموش ہو گیا۔
"جملہ مکمل کرو ہمدانی! کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔
"دیکھو بھابھی آزاد خیال ہیں' انہیں گھومنا پھرنا پسند ہے' ٹھیک ہے مگر ہمارے مذہب اور معاشرے کے بھی کچھ تقاضے ہیں کہ نہیں؟" وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔
"تمہیں چاہیے کہ وہ کہاں جاتی ہیں' کس سے ملتی ہیں' کہاں وقت گزارتی ہیں اس کے متعلق معلومات رکھو۔" وہ جو بات سیدھے طریقے سے نہیں کہہ پا رہا تھا' اسے گھما پھرا کر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کیا کہنا چاہ رہے ہو کھل کر کہو۔" وہ مکمل سنجیدہ تھا۔
"جو کہنا تھا کہہ چکا۔ اس پر غور کرو' اب میں چلتا ہوں' مجھے ذرا کام ہے۔" وہ کہہ کر چلتا بنا مگر کمرے میں اپنے الفاظ کی بازگشت چھوڑ گیا۔ اور اس پر غور کرتے جمیل کو بھی۔



رات کے کھانے کے بعد سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وقار صاحب اپنے ہم زلف اخلاق صاحب کے ساتھ ملکی حالات ڈسکس کر رہے تھے جبکہ سائر حمزہ کو کمپنی دے رہا تھا یہ اور بات کہ حمزہ کی نگاہیں مسلسل اجیہ کے روشن چہرے کے طواف میں مصروف تھیں۔ اجیہ' میرب اور مہ پارہ بلکہ میرب اور مہ پارہ ہی کل ہونے والے فنکشن اور نکاح کے متعلق محو گفتگو تھے جبکہ اجیہ مسلسل دیوار گیر گھڑی پر نگاہ جمائے ہوئے تھی جو کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ تب ہی اچانک اجیہ کھڑی ہوئی۔
"ارے کہاں چلیں؟" مہ پارہ نے تعجب سے پوچھا۔
"میں... وہ میں نے سوچا کہ سب کے لیے چائے بنالوں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔
"ارے تم رہنے دو... لالی سے میں نے کہہ دیا تھا' وہ بنا رہی ہو گی۔" میرب نے تسلی دی۔ اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔
"اچھا۔ میں چائے سرو کرنے میں اس کی مدد کروا دیتی ہوں۔" وہ کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ لالی ٹرے میں کپ سیٹ کر رہی تھی' اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔
"ارے بی بی آپ بیٹھیں ہمیں بس چائے لا ہی رہی تھی۔"
"تم ایسا کرو' میرے روم کی صفائی کر دو۔ میں چائے دیکھتی ہوں۔" اجیہ نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔
"مگر آپ کے روم کی صفائی تو صبح ہو چکی ہے۔" اس نے بتانا چاہا۔
"صبح ہوئی تھی تو کیا رات تک کمرہ گندا نہیں ہو سکتا؟ اور تم مجھ سے بحث کیوں کر رہی ہو' جاؤ جا کر روم صاف کرو۔" بالآخر اس نے مالکانہ رعب جمایا تو لالی سہم گئی' وہ یوں بھی اس کے مزاج سے گھبراتی تھی۔
"جی بی بی جی... جا رہی ہوں۔ بس یہ قہوہ تیار ہے' آپ گرم دودھ اور شکر' شکردان میں ڈال کر لے جائیے گا۔" جاتے جاتے اس نے کہا۔ اجیہ بیزاری سے کھڑی رہی۔ اور کوفت سے اسے جاتا دیکھنے لگی۔ جیسے ہی وہ کچن سے نکلی' اجیہ نے پھرتی سے پہلے ہی سے کچن میں چھپا کر رکھی نیند کی دوائی نکالی اور چائے میں ملا دی۔
"کیا کر رہی ہو بھئی۔" کوئی شوخ سی آواز ابھری تھی۔ اجیہ بری طرح گھبرا گئی صد شکر ہاتھ سے دوائی کی شیشی نہیں چھوٹی۔ اس نے سرعت سے مٹھی میں دبا کر ہاتھ پیچھے کر لیا اور چہرہ نووارد کی جانب۔

"تم نے مجھے ڈرا دیا حمزہ۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"حالانکہ میں اتنا بھی خوف ناک نہیں۔" وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"تم جا کر بیٹھو۔ میں بس چائے لا ہی رہی ہوں۔" اس نے اس کی نگاہوں پر دھیان نہیں دیا۔

"ارے واہ۔ کیوں بیٹھوں' میں تو وہاں بہانا بنا کر یہاں آیا ہی تمہارے لیے ہوں۔ لالی کو میں نے کچن سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔" وہ شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میرے پاس تم سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر پھر سے چائے کی جانب متوجہ ہوئی جو تیار ہو چکی تھی۔

"اچھا! وہ ہنسا۔ محظوظ مسکراہٹ "چلو بات نہ کرو مگر سن تو سکتی ہو۔ اب یہ مت کہنا کہ سننے کا بھی وقت نہیں۔" وہ خاموشی سے چائے کپوں میں انڈیلتی رہی۔

"سچ کہوں۔ پہلے مجھے امی کے فیصلے پر اعتراض تھا اور میں ان سے ناراض بھی تھا مگر امی کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ میری ناراضی کی پرواہ بھی قطعاً" نہیں کر رہی تھیں' ان کا یہی کہنا تھا کہ اجیہ تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے اور جب میں نے تمہیں دیکھا مجھے لگا واقعی۔ واقعی ان کا انتخاب نہ صرف بہترین بلکہ لاجواب ہے۔" وہ جذب سے کہہ رہا تھا مگر اجیہ کو اس کی داستان سے زیادہ چائے میں دلچسپی تھی۔

"آؤ حمزہ۔ تمہاری چائے میں وہیں لے جا رہی ہوں۔" اس نے حمزہ کو نظرانداز کر کے چائے کی ٹرے اٹھائی اور باہر چل دی۔

"ہا۔ مشرقی بیوی' تھوڑا صبر کر لے بیٹا! بس آج رات ہی کی تو بات ہے' کل تو اس کے جملہ حقوق تیرے نام ہو ہی جانے ہیں۔" وہ سرمستی سے سوچ کر مسکرایا اور واپس آ کر محفل کا حصہ بن گیا۔ اجیہ اپنی چائے اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرب نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکی نہیں۔ مہ پارہ اس کے انداز سمجھ رہی تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب اس کی چاہت کے برخلاف ہو رہا تھا اس نے کچھ ناراضی تو دکھانی ہی تھی۔ مگر وہ بہت اعلا ظرفی سے سوچ رہی تھیں۔ اسے مارجن دے رہی تھیں۔

اجیہ نے روم میں آ کر لالی جو کہ پہلے سے صاف کمرے کو مزید تندہی سے صاف ستھرا کرنے میں جتی تھی کو مخاطب کیا۔

"بس ہو گئی صفائی۔ اب جاؤ کچن کی سلیب پر تمہاری اور شیرو (چوکیدار) کی چائے رکھی ہے' تم دونوں لے لو اور ہاں اسے اپنے ہاتھ سے چائے دے کر آنا۔" اس نے تاکیدا" کہا۔

"ظاہر ہے' میرے علاوہ کس نے دینی ہے۔" اس نے دل میں سوچا اور محض سر ہلا کر باہر آ گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی اجیہ نے روم لاک کیا اور آغا کو کال ملانے لگی۔

"ہاں کہو۔ پلا دی سب کو نیند کی دوائی؟" اسے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"چائے میں ملا کر دے تو دی ہے۔ اب اللہ کرے سب پی ہی لیں۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"پی ہی لیں گے' بس تم ٹھیک ساڑھے تین بجے تیار رہنا۔ گلی کے کونے پر میں گاڑی لے کر کھڑا ہوں گا۔" وہ بتانے لگا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آغا۔" وہ ناخن چباتے ہوئے بولی۔

"ربش۔ مت ڈرو یار' بہادر بنو؟"

"آغا! ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے نا۔" وہ فکرمندی سے بولی تو اسے غصہ ہی تو آ گیا۔

"کیا غلط۔ ہاں بولو' جب وہ لوگ تمہاری جائز خواہش سیدھے سادے طریقے سے پوری کرنے کے موڈ ہی میں نہیں ہیں تو تم اور کیا کرو گی۔ تمہیں یہ سب کرنے پر ان لوگوں ہی نے مجبور کیا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" وہ ازحد معصومیت سے بولی۔ "ہم نے تو سیدھا راستہ ہی اپنایا تھا نا' انہوں نے ہی الٹی سیدھی باتیں کر کے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اچھا چھوڑو جانم۔ کچھ دیر ریسٹ کر لو مگر الرٹ

رہنا پھر کچھ دیر میں ملتے ہیں ہمیشہ کے لیے۔۔۔ بہت کچھ ہے دل میں تمہارے لیے، تمہیں سامنے بٹھا کر حکایت دل سنانی ہے۔" وہ مدھم آواز میں بولا۔ اجیہ کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ سج گئی۔

"اچھا اللہ حافظ۔" وہ لجا کر بولی۔

"او کے ۔۔۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر ملتے ہیں زندگی۔" کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

طے ہوا تھا کہ وہ دونوں بھاگ کر پہلے اسلام آباد جا کر نکاح کریں گے پھر اس کے بعد دبئی روانہ ہوں گے جہاں وہ نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ اجیہ نے اس منصوبے کے متعلق گل کو ہی بتا رکھا تھا۔

"امی سے بھی بات کرلوں۔" اس نے کال ملائی۔

"ہاں میری بچی" جذبات سے مغلوب آواز میں۔ تیرے ہی فون کی منتظر تھی۔"

"کیسی ہیں آپ؟"

"صدیوں کے پیاسے کو میسر دو بوند بھی چھن جائے تو اس کی حالت کیسی ہو سکتی ہے؟"

"امی پلیز۔" اس کے غم ناک انداز پر اجیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ بہت جلد میں آپ کو اپنے ساتھ ہی رکھ لوں گی۔"

"دیکھیں گے۔۔۔ بعد میں تم اپنے شوہر کے حکم کی محتاج ہو گی جو وہ کہے گا وہی کرنا پڑے گا تمہیں۔"

"میں آپ کو بتا تو چکی ہوں امی! کہ آغا ہرگز بھی ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا اور نیک دل ہے۔۔۔ میرے جذبات کا بہت خیال رکھتا ہے۔"

"وہ تو بعد ہی میں پتا چلے گا۔ مرد محبوب کی صورت میں جاں نثار ہوتا ہے جبکہ خاوند کی صورت میں جاں گسل۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"میں آپ کو بہت یاد کر رہی ہوں امی۔۔۔ کاش آپ ہماری زندگی میں شامل ہوتیں تو یہ لمحہ میری زندگی میں نہیں آتا۔" وہ یاسیت سے گویا تھی۔

"میں نے کہا نا، شوہر، بیوی کا حاکم ہے اور جب میرے حاکم نے چاہا، مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لیا جب جی بھر گیا زندگی سے نکال پھینکا، آخر کر ہی کیا پائی میں۔"

"مجھے نفرت ہے بابا سے، انہوں نے نہ صرف آپ کے ساتھ ظلم کیا بلکہ ہمیں بھی ماں سے محروم رکھا۔"

"اب جا کر تم ملی تھیں تو پھر کھو رہی ہو۔" اس کی سوئی پھر وہیں آ رکی۔

"امی آپ!" اجیہ نے بے بسی سے سرد آہ بھری۔ "اچھا ٹھیک ہے، مت کریں آپ آغا پر بھروسہ مگر مجھ پر تو کر سکتی ہیں نا، میں بھلا آپ کو تنہا چھوڑ سکتی ہوں۔"

"چھوڑو یہ باتیں اجیہ۔۔۔ تم اپنی نئی زندگی بساؤ، مجھے تو عادت ہے ان تنہائیوں کی بلکہ اب تو لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔"

"اف۔۔۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں، اچھا ٹھیک ہے، دیکھ لیجیے گا۔ وقت ثابت کر دے گا کہ میں اپنے قول میں کتنی صادق تھی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی تو گل جی ہی جی میں مسکرا دی۔

"ہاں۔۔۔ وقت تو ثابت کرے گا اور ضرور کرے گا کہ کون بازی جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔"

"اچھا بیٹی۔۔۔ اب آرام کروں گی، خدا حافظ۔" اس نے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اجیہ بیٹھی مختلف سوچوں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

سرورق کی شخصیت

ماڈل	انعم فیاض
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

عروج فاطمہ



"اٹھ بیٹی! خدا جانے تجھے کب عقل آئے گی۔ ہزار بار سمجھایا ہے کہ دن چڑھے تک بستر پر پڑے رہنا نحوست ہوتی ہے مگر مجال ہے جو تجھے میری بات کی پروا ہو۔"

"کیا ہے دادی، کیوں صبح صبح آکر شروع ہو گئی ہیں۔ آپ تو شکر کرتی ہیں کہ صبح ہو اور سنانا شروع کردوں۔" ریشم کی بات میں صبح کا لفظ سن کر دادی حضور کو مزید پتنگے لگ گئے۔

"کیا کہا تو نے صبح صبح۔ یہ کاہے کی صبح ہے۔ لو بھلا ذرا گھڑی دیکھ تو پتا چلے گا کہ صبح صبح ہے یا دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ غضب خدا کا یہ لڑکی نجانے کس دنیا میں رہتی ہے۔"

"بس کریں دادی اور آپ کی بڑی مہربانی جو آپ نے آکر مجھے ٹائم بتادیا ہے۔ ورنہ مجھے تو جیسے ٹائم کا پتا ہی نہ چلتا۔" ریشم اپنے بالوں کو پونی میں قید کرتے ہوئے بولی۔

"ارے زلیخا ادھر آ۔ ذرا اپنی بیٹی کے لچھن دیکھ آکر اسے تو ذرا چھوٹے بڑے کی تمیز اور حیا نہیں ہے۔ کیسے مجھے آنکھیں دکھا کر دوبدو جواب دے رہی ہے۔"

زلیخا نے جیسے ہی ساس کی آواز سنی تو باورچی خانے میں سے تیزی سے باہر نکلی اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ریشم کے کمرے میں آگئی جہاں دادی پوتی کی جنگِ عظیم چل رہی تھی۔

"کیا ہوا اماں جان؟"

"ارے ابھی کچھ ہونا باقی ہے کیا اوپر سے دوپہر ہو گئی ہے اور یہ بستر پر پڑی ہے ابھی تک۔ ناں تو بتا یہ اچھی لڑکیوں کے کرتوت ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آپ لوگ میرا پیٹ اپنی نصیحتوں سے ہی بھرنا چاہتے ہیں۔" وہ اپنے بیڈ پر آلتی پالتی مارے بڑے ڈھیٹ پن سے بیٹھی مخاطب تھی۔

ماں نے آنکھیں دکھانی چاہیں مگر بیٹی نے ماں کو فوراً کہہ دیا "اماں مجھے ناشتا چاہیے مزید لیکچر اور نصیحت نہیں۔ کیونکہ نصیحت کی کلاس میری ہو چکی ہے اس لیے پیریڈ آف ہو چکا ہے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے باتھ روم میں گھس گئی اور دادی لاحول پڑھتی باہر آگئیں۔

"زلیخا میری بات کان کھول کر سن لے بہتیری یہ لڑکی ضرور کوئی گل کھلائے گی اور خبردار جو تم نے اسے ناشتا بنا کر دیا تو۔ خود بنانے دیا کرو اسے۔ ارے بنائے گی تو آئے گا ناں، کب تک تمہارے ہاتھ کا بنا کھاتی رہے گی۔ آخر دوسرے گھر بھی جانا ہے۔ وہاں کیا ساس بنا بنا کر اسے کھلائے گی۔"

دادی حضور اب اماں کو سمجھانے لگی تھیں اور وہ سر جھکائے سن رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ قصور اس کی بیٹی کا ہے مگر بیٹی بھی ایسی تھی جسے سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر تھا۔

"سلام دادی اماں۔ کیسی ہیں آپ؟" "وعلیکم السلام اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" دادی نے رخسانہ جو کہ پڑوس میں رہتی تھی اور ریشم کی سہیلی تھی اسے مخاطب کیا۔

"یہ دادی جان! رسالہ ہے۔" رخسانہ بھی ریشم کی طرح دادی جان ہی کہتی تھی۔

"ہاں جانتی ہوں اسی منحوس مارے کی وجہ سے تو



ریشم کا یہ حال ہے۔ جب دیکھو یہی ہاتھ میں لیے گھومتی رہتی ہے۔ ساری ساری رات اسے پڑھتی ہے اور پھر سارا دن سوتی رہتی ہے۔ نہ کام نہ کاج بس میں نے کہہ دیا ہے اگر آج کے بعد تم نے یہ نحوست کی پٹاری لاکر ریشم کو دی تو میں تمہاری ماں سے تمہاری شکایت کردوں گی۔"

"مگر دادی جان یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں تو بہت ساری معلومات ہوتی ہیں اچھی اچھی ڈشز کی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ اس سے تو اپنی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔"

"تمہاری معلومات میں اضافہ ہوتا ہوگا مگر ریشم کی تو عقل پر اس نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ نہ ادب رہا ہے نہ تمیز۔" دادی جان اس رسالے کے سخت خلاف تھیں۔

"اچھا میں ذرا ریشم سے مل لوں۔" رخسانہ نے راہ فرار چاہی۔



"کیسی ہو ریشم؟" "میں مزے میں ہوں۔ تم سناؤ نیا شمارہ لائی ہو؟"

"ہاں لائی ہوں مگر اب یہ سمجھنا کہ یہ آخری دفعہ میں تمہیں لاکر دے رہی ہوں' اس کے بعد نہیں۔"

"مگر کیوں کیا ہوا؟"

"دادی جان نے منع کیا ہے۔ تمہاری حرکتوں کی وجہ سے تم نے تو ڈائجسٹ کو بدنام کردیا ہے۔"

"میں نے ایسا کیا کردیا ہے جو تم مجھ پر آکے برس رہی ہو۔ بس مجھے صرف کہانیاں اور ناول پسند ہیں اور میں ان کو انجوائے کرتی ہوں مجھے اور کسی شے سے مطلب نہیں ہے میں تو بس ناولز کی دیوانی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں ناولز پسند ہیں مگر زندگی میں انسان کو اور بھی بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ تم اس میں سے اور دوسری چیزیں بھی تو پڑھ سکتی ہو اور ان سے فائدہ بھی حاصل کرسکتی ہو اور اس طرح دادی جان کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوگا۔"

"اچھا ٹھیک ہے کوشش کروں گی۔" ریشم جانتی تھی کہ رخسانہ سے بحث کی تو پھر رسالے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اور ایسا وہ ہرگز نہ چاہتی تھی۔

"ریشم اٹھو ذرا پلاؤ بنالو۔ میں جمیلہ کے گھر جارہی ہوں۔"

"کیوں اماں' وہاں جانا ابھی ضروری ہے کیا۔ کھانا بنانے کے بعد چلی جانا۔"

"ارے وہ بیمار ہے۔ اس کے ساتھ اسپتال جانے والا کوئی نہیں اس لیے جارہی ہوں۔ اور اگر تم نے کھانا بنالیا تو قیامت تو نہ آجائے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے' بنالوں گی۔"

مجبورا" ریشم نے ہاتھ میں پکڑا رسالہ رکھا اور چاول بنانے کی تیاری کرنے لگی۔ اچانک ہی اسے رخسانہ کی بات یاد آئی کہ اس شمارے میں چاول بنانے کے نئے طریقے بتائے ہوئے ہیں مگر دوسرے ہی لمحے ریشم نے وہ خیال جھٹک دیا اور اسی عام سے طریقے کے مطابق بنانے لگی جیسا اس کی ماں نے سکھایا ہوا تھا۔

ادھر دادی اماں نے ریشم کے لیے رشتے تلاش کرنے شروع کردیے تھے اور پھر دادی کی کوششوں سے ریشم کا رشتہ طے ہوگیا۔ مگر شادی کے لیے ریشم کی ماں نے چھ ماہ کی مدت مانگی جو لڑکے والوں نے بخوشی قبول کرلی۔

مگراب ریشم کی ماں کو سخت فکر نے آگھیرا کہ ریشم تو خود کو بدلنا نہیں چاہتی تھی اور ان حرکات کے ساتھ سسرال میں رہنا ناممکن تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ریشم کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتیں مگر ریشم ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔

دادی کے حکم کے مطابق ایک وقت کا کھانا تیار کرنا ریشم کی ذمہ داری تھی۔ مگر ریشم دل سے کھانا نہ بناتی بس اس کا دھیان اپنی کہانیوں میں الجھا رہتا۔ الٹی سیدھی روٹیاں اور جلا بھنا سالن بنا کر پیش کردیتی جس پر دادی اس کو خوب صلواتیں بھی سناتیں۔ مگر ریشم پر کوئی اثر نہ تھا۔

"ارے کیا لائی ہو تم؟" دادی نے رخسانہ کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے دیکھی تو بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔

"دادی جان آج ہمارے گھر میں دعوت تھی، کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، میں نے کھیر اور قورمہ بنایا تھا۔ سوچا آپ کے لیے بھی لے جاؤں۔"

دادی نے جیسے ہی ڈونگے سے ڈھکن اٹھایا تو قورمے کی خوشبو سے ہی منہ میں پانی بھرنے لگا اور کھیر بھی کیا ہی مزے کی بنائی ہے۔

"ارے واہ بیٹا! کتنا مزیدار کھانا تیار کیا ہے تم نے۔ تمہاری ماں نے ہی سکھایا ہوگا۔ بہت اچھی عورت ہے وہ اور تم بھی اچھی سگھڑ لڑکی ہو جو ماں کے بتائے ہوئے پر عمل کرتی ہو۔ اسی لیے تو اتنی اچھی گھرداری کرلیتی ہو۔" دادی نے دل کھول کر تعریف کی۔

"جی دادی! امی نے بھی بہت کچھ سکھایا ہوا ہے۔ مگر آج کل میں نئی نئی چیزیں بنانے کی کوشش کرتی ہوں اور گھر میں سب ہی میرے بنائے ہوئے نئے کھانوں کو پسند کرتے ہیں۔"

"اچھا کہاں سے سیکھتی ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"گھر میں ہی سیکھنے کو مل جاتا ہے۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر ماہ رسالے میں مختلف قسم کی چیزیں بنانے کی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ وہ میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیتی ہوں۔"

دادی رخسانہ سے بہت خوش ہوئیں اور دعائیں دینے لگیں مگر ساتھ ہی ان کو ریشم پر بے حد افسوس ہوا کہ اتنی اچھی دوست سے بھی وہ کچھ نہ سیکھ سکی۔



ریشم کی رخصتی پر دادی نے بہت نصیحتیں کیں کہ وہ اپنے سسرال میں کسی کے آگے زبان درازی نہ کرے اور سب کے ساتھ گھل مل کر رہے۔ اور ساتھ ہی گھرداری پر خوب توجہ دے۔ جو ریشم نے بے دلی سے سنیں اور سسرال سدھار گئی۔

سسرال میں چند دن تو ریشم کی نند اور جیٹھانی نے ناز برداریاں کیں مگر اب ناز اٹھانے کے دن ختم ہو رہے تھے اور ریشم کی کھیر بنانے کی رسم کرنی تھی۔ اسے کھیر بنانا نہیں آتی تھی مگر ماں نے اسے شادی سے چند دن قبل ایک دن کھیر بنا کر بتائی اور وہ دیکھتی رہی تاکہ طریقہ یاد رہے۔ اسی طریقے کے مطابق وہ ڈرتے ڈرتے کھیر بنانے لگی کیوں کہ پہلے کبھی نہیں بنائی تھی اس لیے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر جیسے تیسے کھیر تیار کی۔ کھانے کے بعد جب کھیر کا دور چلا تو سب نے منہ بنانا شروع کردیا اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا جس پر ریشم کو سخت شرمندگی ہوئی مگر کچھ بول نہ پائی۔

ریشم جب ماں سے ملنے آئی تو کچھ خاموش اور افسردہ سی تھی مگر ماں سے کچھ نہ کہا۔ جانتی تھی کہ اس میں اس کی ماں کا کوئی قصور نہیں، قصور تھا تو صرف اپنا۔

ساس نے ریشم اور اس کی جیٹھانی کو اپنے پاس بلایا اور پھر گھر کے کام کاج کے بارے میں سمجھانے لگی۔

"آج سے ایک دن کچن کی ذمہ داری ریشم کی ہوگی اور دوسرے دن ایمن کچن سنبھالے گی۔ اور ایک ایک

دن گھر کی صفائی ستھرائی کی ذمہ داری ہوگی۔ اس طرح تم دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت بھی نہ ہوگی اور گھر میں سارے کام بھی آرام سے ہو جائیں گے۔"

ریشم کی ساس نے نہایت سمجھداری سے کام لیا اور اپنی دونوں بہوؤں کو کام بانٹ کر دے دیے مگر ریشم کی جان پر بن گئی کیوں کہ اسے پکانے سے اتنا لگاؤ کہاں تھا۔

اس نے ماں کے گھر صرف آرام کرنا ہی سیکھا تھا اور دادی کی کسی نصیحت کو وہ خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جب بھی ریشم کے پکانے کا وقت آتا تو اس سے کبھی بھی اچھا کھانا نہ بن پاتا۔ اس کے ہاتھ میں لذت بھی نہ تھی اور نہ طریقہ اچھا تھا اس کے برعکس ایمن کے بنے کھانے کی سب تعریفیں کرتے اور ایمن کا بنا کھانا جھٹ پٹ ختم مگر ریشم کا بنا کھانا یونہی پڑا رہتا۔

آخر تنگ آ کر ساس نے صاف صفائی ریشم کو سونپی اور باورچی خانے کی حکومت ایمن کو دے دی۔ جس پر ریشم کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ باورچی خانہ سنبھالنے کی اہل نہیں ہے۔ گھر کی صفائی بھی ریشم کی ساس اپنی نگرانی میں کرواتی تھی کیونکہ کونے اور بیچ کی جگہ کو ریشم صاف کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی مگر ساس نفاست پسند خاتون تھی، اور اب وہ ریشم کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھی۔

ریشم جب ماں کے گھر آئی تو اپنے کمرے میں پڑا ایک پرانا رسالہ اٹھایا اور اس کے آخر میں کچھ پڑھنے لگی۔ اچانک ہی رخسانہ بھی اس کے آنے کی خبر سن کر آ دھمکی۔

"ارے یہ تم کیا پڑھ رہی ہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ناں، سب ٹھیک تو ہے۔"

"اڑا لو میرا مذاق جتنا اڑا سکتی ہو۔ میں ہوں ہی اسی قابل کیوں کہ میں نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ اب سزا تو بھگتنی ہے ناں۔" رخسانہ نے ریشم کو اتنا سنجیدہ دیکھا تو خاموش ہو گئی اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا ہے ریشم کوئی مسئلہ ہے کیا۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"بتاؤں گی ایک تم ہی تو ہو جسے بتا سکتی ہوں اور نہ تو اماں سے کوئی شکایت کر سکتی ہوں نہ ہی دادی سے کہ میرے سسرال میں مجھے نوکروں کی طرح صرف اور صرف جھاڑو پوچا اور جالے اتارنے ہوتے ہیں۔ اور برتن دھونے کی ڈیوٹی بھی ہوتی ہے باقی کوئی مجھے کچن میں داخل نہیں ہونے دیتا کیونکہ میں ہر چیز اتنی بدمزہ بناتی ہوں کہ حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ اس لیے اب میں صفائی والی ماسی بن کر رہ گئی ہوں۔ مگر اب مجھے واقعی میں دادی کی ہر ہر نصیحت یاد آتی ہے اور اپنی لاپرواہی پر رونا آتا ہے۔ مگر اب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔"

ریشم کے خاموش آنسو اس کے رخساروں سے پھسلنے لگے تو رخسانہ نے اسے گلے سے لگا لیا اور تسلی دینے لگی۔

"دیکھو ریشم! تم اب بھی سب کچھ ٹھیک کر سکتی ہو۔" "وہ کیسے؟" ریشم نے بے اختیار پوچھا۔ "تم جب بھی اماں سے ملنے آیا کرو تو کوئی بھی ایک نئی ڈش بنایا کرو یہاں تمہیں کوئی خراب بننے پر طعنے بھی نہیں دے گا اور تمہاری پریکٹس بھی ہوتی رہے گی۔"

رخسانہ کا مشورہ واقعی میں کارگر ثابت ہوا اور اب، ریشم جب بھی آتی رخسانہ سے رسالہ منگواتی ضرور مگر پڑھتی صرف وہی حصہ جس میں کچن کے متعلق بتایا گیا ہو اور اماں سے کھانے پکانے کا سامان منگواتی اور طرح طرح کی ڈشز تیار کرتی۔ دادی اور اماں دونوں ہی اس کے اس عمل سے بے حد خوش تھیں۔ لیکن انہوں نے بیٹی کو کبھی بھی یہ نہیں جتایا کہ اگر تم پہلے بھی یہ سب کر لیتیں تو تمہیں اب اس طرح سے سسرال میں ذلیل اور شرمندہ نہ ہونا پڑتا کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا ہے۔

اور دادی اماں تشکر بھری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا لیتیں۔



نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں 'ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ 'سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر'سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے 'جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت وزندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔



جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیراں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنس اینڈ آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں نہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔' زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔ حنین کی بیسٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی اپیل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا تھا۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی

مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
جواہرات 'زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔
فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات 'زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔
ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔
وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔
اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔
تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔
حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔
سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔
سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔
"مثلاً" کون؟" زمر نے پوچھا۔
"مثلاً"... مثلاً" ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔
زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔
حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے۔ جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے۔ لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کولا جواب کردیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔ جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت

ہوگیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کردیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ

ہوتا ہے۔
اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہوجاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کردیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کرکے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کرلیتی ہے۔
زمر فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی' وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے' یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔
جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی' ڈاکٹر توقیر بخاری' ڈاکٹر ایمن بخاری (فارس کی سائیکالوجسٹ) اور دوسرے لوگ.... فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی کا انتقام لے گا۔
سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتادیا ہوگا۔
ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔
ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر' احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کیمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے۔ جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔
فارس' زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔
(1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کرکے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے' وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کرچکا ہے۔
تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔
حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتادیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک اوسی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہوسکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔
سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے' جہاں احمر شفیع' ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔ زمر اور فارس' حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔
ڈاکٹر ایمن بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آجاتے ہیں۔

حنین اور زمر ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔
ہاشم سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے' پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے' تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ "حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔" اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔
جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔
زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گردہ جو سعدی نے دیا تھا' ناکارہ ہو چکا ہے۔

اٹھارھویں قسط

بھاری ہے وہ سر... جو پہنتا ہے تاج

میری رعایا کے ہزاروں لوگ
کیسے اس گھڑی سو رہے ہوں گے!
اے نیند' اے میٹھی نیند! قدرت کی نرم طبیب!
کتنا ڈرتا ہوں میں تم سے کہ تم مزید اب میری آنکھوں کو بوجھل کر کے
میری حسیات کو نسیان میں نہیں دھکیلتیں!
اے سکون کی دیوی' کیونکر تم رہتی ہو
چھوٹی بستیوں کے گندے میلے بستروں میں
مگر شاہی پلنگ کو چھوڑ جاتی ہو؟
اے نیند' تم اس گستاخ گھڑی کسی بحری جہاز پہ بھیگے ہوئے لڑکے پہ تو مہربان ہو سکتی ہو
مگر اس پر سکون اور خاموش رات میں
ہر آسائش اور نعمت ہونے کے باوجود
ایک بادشاہ کے سپرد ہونے سے انکاری ہو؟
مگر اس لیے کہ
رہتا ہے بھاری وہ سر
جو پہنتا ہے تاج!
(ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے کنگ ہنری فور سے "کنگ ہنری" کا مکالمہ)

"خاور۔ کرنل خاور نے قتل کیا ہے تمہارے باپ کو!" جہاں جواہرات ششدر رہ گئی وہیں' ہاشم کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں۔ آنکھوں میں برہمی عود آئی۔

"تم خاور پہ اتنا بڑا الزام کیسے لگا سکتے ہو؟ ایک منٹ!" پتلیاں سکیڑے نفی میں سرہلاتے وہ بولا۔ "یہ کیا تمہارا کوئی نیا گیم ہے؟ تم مجھے اور خاور کو توڑنا چاہتے ہو؟ جانتے ہو ناکہ وہ میرا خاص آدمی ہے۔"
"نہیں صرف تمہیں اذیت دینا چاہتا ہوں' اور اپنی بات ثابت کرنے کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔ تحقیق تم کو خود کرنی ہے۔"
جواہرات سفید چہرے کے ساتھ نڈھال سی واپس بیٹھی۔

"کیا بکواس ہے یہ سعدی! بکچ' بیبیے' میرے لیے کام' وہ سب جھوٹ تھا جس کے بہانے تم نے مجھے یہاں بلایا۔" ہاشم نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ "اور میرے باپ کی موت صرف ایک حادثہ تھی۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ انہیں قتل کیا گیا تھا ہاں...؟"
"گواہ ہے میرے پاس۔" سعدی نے جواہرات کو دیکھتے ہوئے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ وہ جو دم بخود بیٹھی تھی' چونکی۔ "سعدی! تم یہ کیا....."
"مسز کاردار ہیں گواہ! کیوں مسز کاردار؟ کیا آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا' دو سال پہلے کہ آپ کو شک ہے خاور پہ؟"
ہاشم یک دم بالکل ٹھہر گیا۔ جواہرات کا سانس تک رک گیا۔

"ممی! آپ کو خاور پہ شک تھا؟" اس کی ٹون بدلی۔ چونک کر ماں کو دیکھنے لگا تھا۔

"آرام سے ہاشم۔ تم دیکھ نہیں رہے' وہ خوف زدہ ہیں۔" سعدی نے نرمی سے مداخلت کی۔ "میں بتاتا ہوں' تمہارے والد کی موت کے کچھ دن بعد' جب میں مسز کاردار کی خیریت پتا کرنے آیا تو انہوں نے مجھ سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ ان کو شک تھا کہ انہوں نے کھڑکی سے باہر کوئی سایہ سا باتھ روم سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا' وہ ان کے سب سے وفادار ملازم کا سایہ لگتا تھا مگروہ پریقین نہیں تھیں۔ میں نے اس وقت اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ مگر قید خانہ انسان کو غور و فکر کے لیے مواقع دیتا ہے۔"

وہ کہے جا رہا تھا مگر ہاشم ٹھیک سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ششدر بیٹھی ماں کے پاس آیا اور سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"ممی! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا واقعی آپ نے کچھ دیکھا تھا؟"

جواہرات نے سفید چہرہ اٹھایا۔ ایک نظر سعدی پہ ڈالی۔ گردن کی زنجیر تنگ ہوئی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب وہ سر اٹھا کر ان تمام الزامات سے انکار کر سکتی تھی اور اس متوقع بلیک میلنگ سے بچ سکتی تھی' مگر سر اٹھانے کے لیے بے داغ اعمال نامے چاہیے ہوتے ہیں۔ اس نے دھندلاتی' نم پڑتی آنکھوں سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ فکرمندی' اور برہمی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"وہ صرف ایک سایہ تھا' مجھے یاد نہیں کہ میں نے خاور کا نام لیا تھا۔" آنسوؤں سے اس کا گلا رندھا۔ ہاشم کے چہرے پہ جیسے کسی نے طمانچہ دے مارا تھا۔

"تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟" زور سے چلاتے ہوئے اس نے جوتے سے میز کو ٹھوکر ماری۔ میز چائے کے پیالیوں سمیت الٹ گئی۔ جہاں سعدی کی مسکراہٹ تھمی' دل زور سے دھڑکا' وہاں کچن میں کھڑی میری بھی کانپ گئی۔

"نہیں.... میں بوڑھی ہو رہی ہوں' شاید وہ نظروں کا دھوکا ہو' میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔" جواہرات ٹوٹے پھوٹے لفظ بول رہی تھی۔ بار بار انگلیوں کے پوروں سے چہرہ تھپتھپاتی۔ "میں تو اس بات کو بھول بھال گئی تھی۔" ایک ملامتی' بھیگی نظر سعدی پہ ڈالی۔ اس نے پلکیں بند کر کے سر کو خم دیا۔ گردن کی زنجیر اب کس گئی تھی۔

ہاشم اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ خاور میرا وفادار ہے۔ اس کا ڈیڈ سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔" وہ اب نفی میں سر ہلاتے ادھر سے ادھر ٹہلتے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں یا میرا اندازہ غلط ہو۔ تم پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر سے پوچھ لو۔" ہاشم گھوم کر اس کے پاس آیا۔ کالر سے پکڑ کر اسے کھینچ کر اٹھایا اور اپنے مقابل لا کر' سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے غرایا۔

"اگر یہ بات جھوٹ نکلی تو میں تمہیں وہ سزا دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ سمجھے تم!" جھٹکے سے کالر چھوڑا۔

"تمہارے باپ کو قتل کیا گیا ہے ہاشم۔ اگر خاور نے نہیں تو کسی اور نے۔ کس نے کیا ہے' یہ اب تمہیں خود کھوجنا ہے۔"

ہاشم ایک تیز مضطرب سی نظر اس پر ڈال کر "چلیں ممی!" کہتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا' وہ غصے میں لگتا تھا اور شدید بے سکون بھی۔ جواہرات بدقت اپنے قدموں پہ کھڑی ہوئی۔ ملامتی نظروں سے سعدی کو دیکھا۔

"اتنی اذیت کیوں دے رہے ہو مجھے اور میرے بیٹے کو؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ خاور نے یہ سب کیا ہے؟" مضبوط بنانے کی کوشش میں کمزور آواز مزید کپکپائی۔

"آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ جب تک آپ کے بیٹے آپ کے ساتھ ہیں' کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اس کے الفاظ پہ وہ اندر تک کانپ گئی۔

"اگر یہ جھوٹ نکلا تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا سعدی!" دروازے پہ کھڑا ہاشم انگلی اٹھا کر غصے سے تنبیہہ کر رہا تھا۔ سعدی نے سینے پر ہاتھ رکھے' سر کو خم دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ جیسے ہی کمرے میں آیا' میری پیچھے آئی۔

"یہ بہت برا آئیڈیا تھا سعدی۔" وہ شدید پریشان تھی۔ "جب خاور کے خلاف کوئی ثبوت ہے ہی نہیں تو وہ کیسے مجرم ثابت ہوگا؟"

وہ زخم خوردہ سا مسکرایا۔ "ثبوت مجھے نہیں ڈھونڈنے۔ ثبوت مسز کاردار خود پیدا کریں گی' کیونکہ ہاشم اس بات پہ یقین کرچکا ہے کہ اس کا باپ طبعی موت نہیں مرا۔ اب الزام کس کے سر آئے گا؟ یہ مسز کاردار نے طے کرنا ہے۔ اب وہی ثابت کریں گی کہ خاور اصل مجرم ہے۔"

"مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟" یہ سوال میری کو اب بھی الجھا رہا تھا۔

"دیکھتی جاؤ!" وہ گہری سانس لے کر بیڈ پہ بیٹھ گیا اور میری فکر مند سی باہر نکل گئی۔ وہ شدید ناخوش تھی۔



تو میرا حوصلہ تو دیکھ' داد تو دے کہ اب

مجھے شوق کمال بھی نہیں' خوف زوال بھی نہیں

لمحے بھر کے لیے ایک ہفتہ پیچھے جاتے ہیں۔

سنہری نرم گرم دھوپ جیل کے صحن میں بکھری تھی۔ فارس غازی سفید کرتے میں ملبوس' ایک سپاہی کی معیت میں چلتا آرہا تھا۔ لگ بھگ چھ سات ماہ بعد وہ اس جیل میں دوبارہ داخل ہوا تھا۔ راہداری پرانی اور گندی میلی تھی۔ دیوار میں سلاخیں لگا کر دروازے بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ فقرے' اشعار اور نام دیواروں پہ لکھے تھے۔ وہ تنے ابرو' اٹھی گردن کے ساتھ اور بے نیازی کے ساتھ قدم اٹھا رہا تھا۔ راستے میں چند جگہوں پہ اسے سلام کیا گیا۔ جس کا اس نے کبھی سر کے خم اور کبھی ماتھے کو ہاتھ سے چھو کر اسی بے نیازی مگر اپنائیت سے جواب دیا اور آگے چلتا گیا۔

وہ ایک طویل کھلا اور روشن سا کمرہ تھا۔ دونوں مخالف دیواروں کے ساتھ قطاروں میں میٹرس لگے تھے۔ ہر میٹرس کے اوپر دیوار پہ کھونٹی پہ متعلقہ قیدی کے کپڑے' سویٹر وغیرہ لٹک رہے تھے۔ کوئی بیٹھا تھا' کچھ گروہ کی صورت کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو کسی کی نگاہ ادھر پڑی' کسی نے اس کا نام لیا۔ گردنیں مڑیں۔ خاموشی ہر سو پھیلی۔ بہت سے سلام بلند ہوئے۔ وہ سر کے خم اور بڑبڑاہٹ سے جواب دیتا کونے تک آیا۔ یہ میٹرس اس کا تھا۔ وہ نیچے بیٹھا۔ سر جھکا کر جوتے اتارنے لگا۔

"تو ادھر دوبارہ کیسے غازی؟" کسی نے متفکر ہو کر پکارا تھا۔

"مرڈر!" دیوار سے ٹیک لگائے' اکڑوں بیٹھ گیا اور سامنے خلا میں دیکھنے لگا۔ چند مزید باتیں سنائی دیں پھر وہ سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ وہ اب نگاہ گھما کر ان در و دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر آنکھیں بند کیں۔

جب وہ پہلی دفعہ جیل میں آیا تھا تب وہ ایسا نہیں تھا۔ تب کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ مگر اس نے ذہن سے ان دنوں کو جھٹک دیا۔ اور گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ قیدی ابھی تک مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک گروہ نے کسی کو راستہ دیا اور ایک شخص ان کے پیچھے سے نکل کر سامنے آتا دکھائی دیا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں سکھوں کی مانند تھیں' آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر فارس اٹھ کھڑا ہوا۔

"غازی!" اس نے مصافحہ کے بجائے پنجہ بڑھایا جس کے ساتھ فارس نے پنجہ ملا کر جکڑا اور پھر اس سے گلے ملا۔ علیحدہ ہو کر اس نے مسکرا کر فارس کو دیکھتے اس کا شانہ تھپکا۔

"اداس نہ ہو یار! یہ بھی تیرا اپنا ہی گھر ہے۔"

فارس نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ ہلکے سے سر جھٹکا۔ "نہ یہ گھر ہے' نہ اپنا ہے۔"

"چل آ۔ تجھے کچھ نئے دوستوں سے ملواتا ہوں۔"

وہ اس کو دوستانہ انداز میں شانے سے تھامے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

اس کا نام محمد جلال الدین آتش تھا' مگر یہاں اسے صرف "آتش" کہا جاتا تھا۔ اس کی آنکھ کے قریب ایک گہرے زخم کا پرانا نشان تھا۔ چپ چاپ اس کے ساتھ چلتے فارس نے ایک خاموش نظر اس کی آنکھ کے نشان پہ ڈالی۔

یہ زخم اسے فارس نے ہی دیا تھا۔ کسی اور زمانے' کسی اور دنیا میں۔

اس منظر کو سات دن بیت چکے تھے۔ وکیل دفاع کو دیے گئے سات دن کی مہلت آج تمام ہوئی تھی۔ سو کل اسے پھر سے "حوالات" (گاڑی) میں ڈال کر عدالت لے جایا جاتا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی سنجیدہ اور خاموش تھا۔



سب ہی پریاں محبت کی جفا نے مار ڈالی ہیں
ایک آسیب آیا تھا' یہاں گلفام سے پہلے

سعدی کے پاس سے آکر ہاشم اپنے کمرے میں دائیں بائیں ٹہل رہا تھا' اور جواہرات مضطرب سی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ صرف ڈسٹرب تھا' پریشان' چونکا ہوا تھا' مگر جواہرات؟ اس کا چہرہ سفید اور جسم بے جان تھا۔ وہ بار بار لب کھولتی لیکن پھر ہاشم کے تیور دیکھ کر چپ ہو جاتی۔

ہاشم کو یہیں چھوڑ کر نچلے فلور پہ جاؤ تو کمروں کے بند دروازے راہداری کے دونوں طرف قطار سے لگے تھے۔ دفعتاً" ایک دروزہ کھول کر آبدار نکلی اور تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ گئی لفٹ نیچے اتری تو وہ کچن میں آئی اور وہاں سے سیدھی ہیڈ شیف کے سر پہ پہنچی۔

"مجھے نیچے جانا ہے۔" مقامی زبان میں سنجیدگی سے کہا۔ شیف نے تذبذب سے اسے دیکھا۔

"مجھے اجازت نہیں ہے مادام۔ فصیح صاحب کی غیر موجودگی میں۔"

اس نے اسٹینڈ سے ایک تیز چھرا اٹھایا اور اس کی نوک' شیف کے کاؤنٹر پہ رکھے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیانی خلا میں گاڑی' پھر تیکھی نظروں سے اس کا یک دم شل ہوتا چہرہ دیکھا۔ "تم مجھے بتاؤ' اگر میں تمہیں قتل کر دوں' تو کیا میں جیل جاؤں گی؟ تمہیں نہیں لگتا کہ میرے بابا مجھے فوراً" بچالیں گے؟"

شیف نے آہستہ سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سعدی کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ دستک دے کر دروازہ کھولا تو وہ ہنوز مضطرب سا' مگر سوچ میں گم بیڈ پہ بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر چونکا۔ پھر کھڑا ہوا۔ "میں نے وکیل کا نام بتا دیا ہے ہاشم کو۔ اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اندر آئی' دروازہ بند کیا اور بند دروازے سے پشت لگائے' چمک دار آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "ہامان کون ہے؟"

سعدی کی گردن میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ مگر آنکھوں میں سختی در آئی۔

"ماموں نے تمہارے ذریعے پیغام بھیجا' انہیں تم پہ اعتبار تھا' مجھے نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم سب بھول جاؤ۔"

"کون ہے ہامان اور کیا کرو گے تم اس کے ساتھ؟"

وہ پلکیں جھپکا کر' شیطانی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"کم از کم تمہاری طرح میں اس سر راہ نہیں پٹاؤں گا۔"

آبی کی مسکراہٹ تھمی۔ ابرو تعجب سے بھنچے۔

"تم نے اس روز بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔ کتنے جج مینٹل انسان ہو تم۔ تم نے خود سے فرض کر لیا

کہ نوشیرواں کو پٹوانے میں میرا ہاتھ تھا۔"

"محترمہ! آپ کے منگیتر نے خود نوشیرواں کو بتایا تھا کہ وہ آپ کا منگیتر ہے اور یہ کہ اگر اس نے دوبارہ آپ کو تنگ کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔ اس سے بھی انکار کردیں۔ اس لیے میں نے کہا نا' مجھے آپ پہ اعتبار نہیں ہے۔"

سوگوار کمرے میں ایک دم تناؤ سا در آیا۔ آبی لمحے بھر کو بالکل سن رہ گئی۔ متحیر۔ مبہوت۔ وہ بہت کچھ کہنے کے ارادے سے آئی تھی' سب بھول کر باہر کو لپکی۔ پھولے تنفس اور سرخ چہرے کے ساتھ تیز تیز اوپر آئی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر بیل بجائی۔ پھر بند مٹھی سے اسے بجایا۔ زور سے۔ جواب موصول نہ ہوا تو اونچی آواز میں بولی۔

"آبدار ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

اگلے ہی لمحے دروازہ اندر کو کھلا اور ہاشم کاردار سامنے نظر آیا۔ کوٹ اور ٹائی ندارد' آستینیں کہنیوں تک موڑے وہ ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ پس منظر میں کرسی پہ بیٹھی جواہرات دکھائی دے رہی تھی۔

"کیسی ہو ریڈ؟" جبراً" مسکرانے کی کوشش کی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ برہم نگاہیں اس پہ جمائے' سینے پر بازو لپیٹے ہوئے تھی۔

"ابھی میں... بات نہیں کر سکتا' بعد میں..." وہ واقعی اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"جب نوشیرواں مجھے یونی ورسٹی میں تنگ کر رہا تھا تو میں نے تمہیں کال کی تھی۔ صرف تمہیں اور تم نے میری شکایت کے جواب میں کہا تھا کہ تم سنبھال لو گے' کیسے سنبھالا تھا تم نے؟" ہاشم دروازہ بند کر کے راہ داری میں آکھڑا ہوا بولا۔ کچھ نہیں' بس اسے دیکھتا رہا۔

"ایک دن اچانک اس نے مجھے کالز کرنا چھوڑ دیا۔ دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہیں آیا۔ میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ کیوں؟"

"آبی...!"

"تم نے اپنے ہی بھائی کو پٹوایا ہاشم؟" وہ بے یقین تھی۔

"کس نے بتایا تمہیں؟ تمہارے نئے بیسٹ فرینڈ نے؟" ہلکا سا طنز کیا۔

"ہاشم! تم نے میرے کسی منگیتر کا کہہ کر اس کو پٹوایا؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟"

"سنو آبدار!" اب کے وہ سختی سے بولا۔ "میرا باپ میرا آئیڈیل تھا۔" کرب سے لمحے بھر کو آنکھیں بند کیں۔ "جب میں ہائی اسکول میں تھا تو میں کچھ غلط لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ میرے باپ نے مجھے ان کے ساتھ پولیس سے پکڑوایا اور تھانے میں ایک رات کے لیے بند کروا دیا۔ میں اس کے بعد کبھی ان لڑکوں سے نہیں ملا۔ میری پڑھائی ٹھیک ہو گئی۔ جیسے میرے باپ نے مجھے ہینڈل کیا تھا' میں نے بھی شیرو کو ویسے ہی ہینڈل کیا اور وہ بھی ٹھیک ہو گیا۔ وہ میرا بھائی ہے' اس کی حفاظت مجھے کرنی ہے کیسے؟ یہ صرف میں جانتا ہوں۔ گڈ نائٹ۔"

ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈال کر' اس کے منہ پہ دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ آبدار ابھی تک بے یقین کھڑی تھی۔

جواہرات اسے آتے دیکھ کر پریشانی سے اٹھی۔

"ہاشم! شاید ہم خوامخواہ سعدی کی بات کو سیریس..."

"میرا باپ قتل ہوا ہے ممی!" وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا قریب آیا۔ "مجھے اپنے باپ کی لاش دیکھ کر ہی سمجھ جانا چاہیے تھا مگر میں نے ڈاکٹر پہ بھروسا کیا۔ سعدی ٹھیک کہتا ہے' میرا تکبر مجھے دھوکا دے گیا۔ میرا ناقابل تسخیر باپ بھی قتل ہو سکتا ہے' میں یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ ورنہ ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے تھی۔" نفی میں سر ہلاتے' وہ نچڑی رنگت کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا۔

جواہرات مضطرب سی کھڑی رہی۔ "کیا خاور ایسا کر سکتا ہے؟"

ہاشم نے بند دروازے کو دیکھا' جس کے پار کچھ دیر

پہلے آئی کھڑی تھی۔

"ممی! خاور بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے بتائے بغیر۔" پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں۔ "مگر وہ میرے باپ کو نہیں مار سکتا۔"

"ہمیں اس ڈاکٹر سے بات کرنا چاہیے۔" جواہرات نے فورا" موبائل اٹھایا مگر اگلے ہی لمحے وہ ششدر رہ گئی جب ہاشم نے سختی سے موبائل اس کے ہاتھ سے چھینا۔

"کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا۔ صرف میں بات کروں گا اس سے۔ آپ بھی کسی کو کال نہیں کریں گی۔" انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

جواہرات کا سانس رک گیا۔ "میں تمہاری ماں ہوں ہاشم!"

"اور جو مرا ہے' وہ میرا باپ تھا۔ جو بات آپ نے سعدی کو بتائی' وہ مجھے نہیں بتائی ممی! اس وقت مجھے کسی پہ بھروسا نہیں ہے۔" گلابی آنکھوں کے ساتھ وہ دکھ سے کہتا اٹھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ "آپ پہ بھی نہیں۔" اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

جواہرات کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور چہرے پہ لڑھک گیا۔ ہاشم زور سے دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔



روز قیامت ہے میرا ہر روز حیات
حشر ہوں اور خود اپنے اندر برپا ہوں

اسلام آباد میں اگلی صبح سرد اور نم سی محسوس ہوتی تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپا تھا اور ان بادلوں کا رنگ گناہوں کی طرح سیاہ تھا گویا سارے شہر پہ اندھیرا سا چھایا ہو۔ ایسے میں کچہری کی سفید عمارت نکھری نکھری سی کھڑی تھی اور ایک وسیع اور بلند ہال کے اندر دیکھو تو راہ داریوں کے جنمی شور سے بے نیاز' وہاں عدالتی کارروائی جاری تھی۔ بلند چبوترے پہ اپنی اونچی کرسی پہ براجمان سیشن جج جناب جسٹس فخرالزماں صاحب' ناک پہ عینک جمائے' ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔

"فارس ظہیر غازی! کیا آپ نے بارہ اگست کی صبح ناظم فاروق کے ساتھ مل کر قمرالدین چوہدری کو اغوا کیا... اور....."

سامنے کٹہرے میں فارس گردن اٹھائے' ریلنگ پہ ہاتھ رکھے کھڑا' سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ صاف ستھرے سفید کرتے میں ملبوس' تازہ بنی شیو اور تازہ کٹوائے بالوں کے ساتھ وہ ہونٹوں کے زخم کے باوجود ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔

چبوترے سے نیچے اترو تو سامنے دونوں اطراف میں میزیں رکھی تھیں۔ ایک طرف سرکاری پراسیکوٹر بیٹھا تھا' ساتھ میں دو دو کلارک اور بھی تھے۔ دوسری میز کے پیچھے کرسی پہ ٹیک لگائے' قلم انگلیوں میں گھماتی زمر بیٹھی' سوچتی نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ ادھر جج صاحب فرد جرم پڑھ رہے تھے۔

"اور لاش کو کار میں ڈالا اور ناظم فاروق کے ساتھ اسے مقتول کے گھر لے آئے' پھر اسے گھر کے باہر پھینکا اور اسی کار میں فرار ہو گئے۔" جج نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کیا آپ ان جرائم کا اقرار کرتے ہیں؟"

"نہیں یور آنر... میں بے قصور ہوں۔ میں نے یہ اغوا اور قتل نہیں کیا۔" زمر نے نگاہ سامنے رکھے کاغذ پہ ڈالی۔ اس پہ یہی سوال و جواب لکھے ہوئے تھے۔ روٹین کی کارروائی جاری تھی۔

"کیا آپ کو تیرہ اکتوبر کی رات آپ کے گھر سے گرفتار کیا گیا اور آپ سے مذکورہ پستول برآمد کیا گیا؟"

"نہیں یور آنر... میری گرفتاری کے وقت میرے پاس میری گن نہیں تھی۔ جس پستول کی برآمدگی لکھی گئی ہے وہ پولیس نے میرے اوپر ڈالی ہے' وہ پستول نہ میرا ہے' نہ میرے پاس سے ملا ہے۔" وہ سنجیدگی سے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

"آپ کس طرح پلیڈ کریں گے؟"

"I Plead innocent" وہ اسی میکانکی

انداز میں بولا تھا۔

زمر نے آخری سوال پہ نظر دوڑائی جو کاغذ پہ لکھا تھا۔ ایک سطر کا سوال (کیا آپ اپنے خلاف گواہ کے طور پہ پیش ہونا چاہیں گے؟) اور اس کا ایک لفظ "نہیں" جج صاحب بھی اب وہی پوچھ رہے تھے۔

"فارس طہور غازی... کیا آپ کریمنل کورٹ پروسیجر سیکشن 340 کے تحت اپنے خلاف گواہ کے طور پہ پیش ہونا چاہیں گے؟"

زمر ہونٹوں میں قلم چباتے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ لحظے بھر کو رکا۔ پھر اسی طرح گردن اٹھائے بولا۔ "جی یور آنر۔"

(قانون کے تحت اعتراف جرم کے لیے ملزم کو نہیں بلایا جاسکتا۔ ہاں اگر وہ خود چاہے تو اپنے گواہ کے طور پر خود کو پیش کر سکتا ہے اس صورت میں پراسیکیوٹر اس سے سوال جواب جرح کر سکتا ہے اور اس کو حلف اٹھا کر سچ جواب دینا ہو گا)

زمر بجلی کی تیزی سے کھڑی ہوئی۔ "یور آنر' مجھے اپنے کلائنٹ سے بات کرنا ہے۔" جج نے ایک گہری نظر فارس پہ ڈالی دوسری زمر پہ۔

"آپ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے وکیل سے کنسلٹ کر لیجیے۔" گویا تنبیہہ کی مگر وہ ویسے ہی مطمئن کھڑا رہا۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں' یور آنر... میں اپنا گواہ بننے کو تیار ہوں۔ کیونکہ میں بے گناہ ہوں۔" اور ایک اچٹتی نظر نیچے کھڑی زمر پہ ڈالی جو ایک دم پریشان سی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے... آپ کو ٹرائل کا حق دیا جا رہا ہے۔ گیارہ نومبر کو استغاثہ عدالت میں اپنے..." وہ آرڈر جاری کرتے ہوئے کہہ رہے تھے اور زمر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کا ہتھوڑا اٹھا کر فارس کو دے مارے۔

کارروائی ختم ہونے کے بعد وہ اس کے ساتھ چلتی باہر آئی اور جس وقت پولیس اہلکار اس کو ہتھکڑی لگا رہے تھے' وہ بہت ضبط سے بولی تھی۔

"فارس! تم گواہی نہیں دے سکتے۔" آنکھوں سے تنبیہہ کی۔ وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا' پھر ذرا سا مسکرایا۔

"میں بے گناہ ہوں' گواہی دے سکتا ہوں۔"

"وہ تم سے 28 اگست کی رات کے بارے میں پوچھیں۔"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" ہتھکڑی بند ہوئی اور وہ اسے لے کر مڑ گئے اور زمر... بیر پیچ کر رہ گئی۔

وہ شدید پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اس کے لیے عدالت میں ایک ہزار جھوٹ بول سکتی تھی اور عدالت میں اکثر یہی تو کیا جاتا ہے مگر کٹہرے میں کھڑے ہو کر گواہ کے طور پہ قسم اٹھا کر جھوٹ... یہ جھوٹی گواہی تھی اور وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا فارس بھی جھوٹ نہیں بولے گا اور ہاشم کو بھی معلوم تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا' اسی لیے تو سارا کھیل ترتیب دیا تھا' قاتل نہ سہی... اس کا آگ لگانا ہی کھل جائے! اف وہ اس آدمی کا دفاع کیسے کرے جو خود اپنا دفاع نہیں کرنا چاہتا تھا؟

بہت برے موڈ کے ساتھ وہ واپس پلٹی تھی۔

شہر کے دوسرے حصے میں قائم قصر کاردار کی اونچی کھڑکیوں سے باہر صبح کا سیاہ آسمان نظر آرہا تھا۔ لاؤنج کی ایک کھڑکی کے قریب کرسی پہ نیم دراز' پیر چھوٹی میز پہ رکھے' نوشیرواں رات والے کپڑوں اور بکھرے بالوں میں... تازہ تازہ نیند سے جاگا' موبائل پہ مصروف تھا۔ انگلی سے اسکرین اوپر نیچے کرتے' بےزاری اور سستی سے نیوز فیڈ دیکھتے' وہ ایک دم ٹھہرا' ذرا چونکا۔ سستی غائب ہوئی۔ اطلاع موصول ہوئی تھی۔

"علیشا کاردار نے آپ کی دوستی کی درخواست قبول کر لی ہے۔"

نوشیرواں نے ٹھوڑی پہ فرنچ کٹ داڑھی کھجائی۔ ایک دم اپنا آپ چغد سا لگا۔ اس حرکت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کیوں کیا ایسے؟ قنوطیت کا دوسرا دورہ پڑنے لگا تو ابرو اکٹھے ہوئے۔ خفگی سے علیشا کی

پروفائل کھولی اور دوستی ختم کرنے کے نشان کو کلک کرنے ہی لگا تھا کہ علیشا کا پیغام موصول ہوا۔ سرخ نشان ابھرا' شیرو نے اسے دبایا۔ ”نوشیرواں کاردار؟ تم نے مجھے ایڈ کیوں کیا؟“

اس کی انگلیاں بنا سوچے سمجھے کی پیڈ پہ چلنے لگیں۔
”کیوں؟ کیا میں تمہیں ایڈ نہیں کرسکتا؟ کیا ہم فیملی نہیں ہیں؟“ ساتھ ہی کندھے بھی اچکائے تھے۔

”واہ... پچیس سال بعد تمہیں یاد آگیا کہ ہم فیملی ہیں۔“

”اگر میری جگہ ہاشم بھائی نے تمہیں ایڈ کیا ہوتا تو تم شاید کسی اور طرح جواب دیتیں... ہے نا؟“

”ہاشم کو مجھے ایڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے فون کرلیتا ہے اور وہ میری فیس بھی ادا کررہا ہے' اس کے بدلے میں مجھے صرف تمہارے خاندان سے دور رہنا ہے۔ اس لیے مجھے اسی طرح جواب دینا چاہیے... بائے...“ اور وہ آف لائن ہوگئی۔

نوشیرواں کو غصہ نہیں آیا' وہ اسی طرح عجیب سے احساس میں گھرا بیٹھا رہا۔ تب ہی باہر ہلچل کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ چونکا اور گردن موڑ کر دیکھا۔ کھڑکی کے پار رکتی کاریں... کھلتے دروازے... آوازیں... تیز تیز گھر کی طرف بڑھتا ہاشم... پیچھے جواہرات... سب دکھائی دے رہا تھا۔ شیرو نے ایک دم جلدی سے فیس بک بند کی اور فون پاکٹ میں گویا چھپاتا' اٹھا۔

”ہیلو بھائی... آپ جلدی آگئے۔“ ہاشم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو شیرو جبراً مسکراتا سامنے آیا۔

ہاشم سنجیدہ ایک سپاٹ نظر اس پہ ڈالتا تیزی سے کنٹرول روم کی طرف چلا گیا۔ شیرو نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا' پھر پیچھے آتی مضطرب سی جواہرات کو۔ تب ہی فینو نا سامنے آئی' ادب سے ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔

"خاور کہاں ہے؟" جواہرات نے اسی اضطراب سے پوچھا تھا۔

"مسٹر خاور کو کل ہاشم صاحب نے فون کر کے سندھ جانے کا حکم دیا تھا' وہاں پلانٹ پہ کچھ کام تھا۔ غالباً" دو تین روز میں آجائے گا۔"

"اچھا..." جواہرات آدھی بات ان سنی کرتی ہاشم کے پیچھے گئی۔ فیونا تو اثر لیے بنا کھانا لگانے کا حکم دینے کچن کی طرف چلی گئی' البتہ نوشیرواں قدرے اچنبھے' قدرے خفگی سے ماں کے پیچھے آیا۔

"آپ لوگوں کا موڈ کیوں خراب ہے؟" کنٹرول روم کے دروازے پہ آیا تو اگلے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ ہاشم مختلف درازاور خانے کھول کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ جواہرات اس کے سر پہ کھڑی پریشان کہہ رہی تھی۔

"کچھ دیر آرام کرلو' شام کو ڈاکٹر واسطی کو گھر بلا کر بات کریں گے۔"

ایک کاغذ دراز سے نکال کر وہ اسے جیب میں اڑستا اٹھا۔ "میرے باپ کی موت کو اس نے مذاق بنا کر رکھ دیا اور آپ کہتی ہیں' میں آرام کرلوں؟" ایسے چیخ کر بولا تھا کہ جواہرات چپ رہ گئی۔

"کیا ہوا بھائی؟" نوشیرواں چونکا تھا۔

"ہم ڈاکٹر واسطی کی طرف جا رہے ہیں' کپڑے بدلو۔" سختی سے کہہ کر فون پہ کال ملانے لگا۔ نوشیرواں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔ جواہرات نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"رئیس! تم پہنچے نہیں اب تک؟" وہ اب فون پہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ماحول کا تناؤ ہر گزرتے پل بڑھتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نہ کوئی سمت' نہ منزل' سو قافلہ کیسا؟
رواں ہے بھیڑ فقط' بے قیاس لوگوں کی

کاردار ز کو وہیں چھوڑ کر سبزہ زار عبور کرکے' انیکسی کے اندر آؤ تو دوپہر کے باوجود' موسم کے باعث اندر اندھیرا سا تھا اور ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ کچن کی

گول میز کے گرد ندرت بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں اور حنین ساتھ میں مونگ پھلی کے شاپر سے مونگ پھلیاں نکال کر کھا رہی تھی۔

"ہزار دفعہ کہا ہے' چھلکے اسی صاف مونگ پھلی والے شاپر میں نہ ڈالو۔" اس کے مسلسل چھلکے اندر ہی پھینکنے پہ ندرت نے ٹوکا۔ حنہ سرہلا کر اب چھلکے میز پہ رکھنے لگی۔ ندرت کو پھر تاؤ آیا۔

"حنین! کوئی تمیز ہے تم میں؟ دوسروں کی بیٹیاں دیکھیں ہیں؟ سگھڑ' سلیقہ شعار' ہر کام میں طاق' کیا کیا نہیں ہوتیں؟ تم کب سیکھوگی؟"

"امی! پہلی بات' ماموں کے نہ ہونے کا غصہ مجھ پہ نہ نکالیں' دوسری بات..." پھلی منہ میں ڈالتے چباتے چباتے سنجیدگی سے ان کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "دوسروں کی بیٹیاں میری طرح پڑھائی میں اچھی اور کمپیوٹر جینئس نہیں ہوتیں۔"

"لڑکیوں کے کام پہ کمپیوٹر نہیں آتے۔"

"یار امی! میں نہ سلائی کڑھائی کر سکتی ہوں' نہ مجھے دس قسم کی چٹنیاں بنانی آتی ہیں۔ مجھ سے نا آپ سگھڑاپے کی توقع چھوڑ دیں۔" مونگ پھلی پھانکتے بہت ادب سے اطلاع دی۔

"تمہیں لگتا ہے سگھڑاپا دس قسم کی چٹنیاں بنانے اور سلائی کڑھائی کرنے کا نام ہے؟" آواز پہ حنہ چونکی' گردن موڑ کر دیکھا۔ بڑے ابا وہیل چیئر کھسیٹتے ادھر آرہے تھے چہرے پہ نرم مسکراہٹ تھی۔ ندرت اٹھ کر چولہے کی طرف چلی گئیں۔ فارس کے ذکر سے وہ رنجیدہ ہو گئی تھیں۔

"ہاں نا... ڈائجسٹوں میں وہی ہوتی ہیں سگھڑ لڑکیاں جو کہانیوں میں گھر کے بنے کباب' سموسے تل کر مہمانوں کے سامنے رکھتی ہیں اور ساتھ میں گھر کی ہی چٹنیاں... اور فلاں ٹانکے سے کڑھائی شدہ میز پوش بچھاتی ہیں۔" وہ مزے سے بتا کر ہنسنے لگی' ابا نہیں ہنسے۔

"وہ سگھڑ نہیں ہوتیں... وہ ٹیلنٹڈ ہوتی ہیں۔ یہ تو ٹیلنٹس ہیں مگر سگھڑاپا اس کا نام نہیں ہوتا۔"

"اس سے پہلے کہ دادا حضور! آپ مجھے بتائیں کہ میں پھوہڑ ہوں' میں آپ کو بتاتی چلوں کہ آپ کی صاحب زادی کو بھی وکالت کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ نہ وہ کھانا بناتی ہیں' نہ سلائی کڑھائی کر سکتی ہیں۔" مدافعانہ انداز میں اطلاع دی۔

"بالکل۔۔۔ زمر کوکنگ نہیں کرتی۔ تمہیں تو دو چار انواع و اقسام کی ڈشز بھی بنانی آتی ہیں' اسے وہ بھی نہیں آتیں۔ سادہ روٹی چاول اور دو ایک سالن کے علاوہ وہ کچھ نہیں بنا سکتی۔ سلائی کڑھائی کو تو اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا مگر پھر بھی حنہ' وہ پھوہڑ نہیں ہے' سوچو کیوں؟"

"کیونکہ آپ اس وقت مجھے نصیحت کرنے کے موڈ میں ہیں؟" اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"نہیں۔۔۔ کیونکہ تمہیں پھوہڑ کی اصل تعریف نہیں معلوم۔"

حنہ نے آنکھیں تیکھی کر کے ابرو اٹھائے۔

"پھوہڑ وہی ہوتی ہے جو دس قسم کی چٹنیاں نہ بنا سکے' میز پوش اور ٹی کوزی پہ کڑھائی نہ کر سکے۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ پھوہڑ وہ لڑکی ہوتی ہے' جو صاف ستھری نہ ہو اور جو آرگنائزڈ نہ ہو۔"

حنین نے کندھے جھٹک کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

"میں تو صاف ستھری بیٹھی ہوں ابا۔" اس کے کپڑے واقعی صاف' استری شدہ تھے' بال بھی سلیقے سے فرنچ چوٹی میں گوندھے تھے۔ چہرہ بھی دھلا' نکھرا نکھرا تھا۔

"پھوہڑ کا دائرہ ایک لڑکی کا اس کے گھر سے تعلق کے گرد پھیلا ہوتا ہے۔ پھوہڑ لڑکی وہ ہوتی ہے۔ جس کا باتھ روم' ٹوتھ برش والا کپ اندر سے صاف نہ ہو۔۔۔ جس کی کچن کیبنٹ کی اوپری سطح پر گریس کی تہیں نہ جمی ہوں۔۔۔ جس کے پردوں کی راڈ کے اندرونی طرف جالے نہ ہوں۔۔۔ جس کے کچن سنک کی نل والی دیوار (بیک اسپلیش) صاف نہ ہو۔۔۔ اور بتاؤں؟ یا پہلے تم یہی چیزیں چیک کر آؤ' کیونکہ تمہاری امی بہت سلیقہ مند اور سگھڑ ہیں مگر پچھلے تین ہفتے سے فارس کی گرفتاری کی وجہ سے وہ گھر پہ توجہ نہیں دے پا رہیں' تو یہ چیزیں تمہاری ذمہ داری میں آتی ہیں۔ جاؤ چیک کر کے آؤ۔" وہ دھیمی آواز میں کہہ رہے تھے۔

حنین نے مونگ پھلی کا لفافہ پرے دھکیلا اور چمک کر ان کو دیکھا۔

"صفائی صداقت کرتا ہے۔" ذرا رکی۔۔۔ "ٹھیک ہے امی' اب پہلے کی طرح سر پہ کھڑی ہو کر نہیں کرواتیں صفائی مگر میرا باتھ روم اور ہمارا کچن چمک رہا ہوتا ہے ہمیشہ۔۔۔" کرسی دھکیل کر اٹھی اور "یو تو بروٹس" والے دکھ سے ابا کو دیکھتی۔ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

پہلے اپنا بیڈ روم دیکھا۔ صاف ستھرا پڑا تھا۔ طمانیت کا احساس ہوا۔ پردے ہٹائے اور اندرونی راڈز دیکھیں۔ دل ایک دم دھک سے رہ گیا۔ جالے! (مگر بڑے ابا تو کبھی اوپر نہیں آئے۔) باتھ روم میں آئی۔ تازہ تازہ دھلا تھا۔ فنائل کی خوشبو' صاف' لش چمکتا باتھ روم۔ ذرا خوش ہوئی۔ پھر ٹوتھ برش کپ ہولڈر سے نکالا اور اندر جھانکا۔ اخ تھو۔۔۔ کراہ کر سنک میں پھینکا۔ اندر بیلا پانی جمع تھا۔ اف۔۔۔

سب کی یہ جگہیں میلی ہوتی ہیں' اچھا۔۔۔ خود کو تسلی دی' پھر جلدی سے زمر کے کمرے میں آئی' چپکے سے پردے ہٹائے' صاف راڈز۔۔۔ باتھ روم میں ٹوتھ برش کپ میں جھانکا۔ اندر سے نکھرا صاف ستھرا کپ۔

"ایں؟ وہ جز بز ہوئی۔۔۔ سارا گھر صداقت صاف کرتا تھا' پھر فرق کیوں؟ اس نے زمر کی الماریاں کھولیں۔ درازیں کھول کر دیکھیں' ہر شے سلیقے سے تہ شدہ رکھی تھی۔ ایک اس کی الماری کھولتے یہ کپڑے باہر کو کیوں ابلتے تھے؟ درازیں کیوں زلزلے کے بعد کے علاقوں کی طرح لگتی تھیں۔

"اونہوں! ابا بھی نا۔۔۔" دھپ دھپ کرتی نیچے آئی اور خفگی سے ان کے سامنے بیٹھی۔ انہوں نے مسکرا کر اطمینان سے اسے دیکھا۔

"کتنی چٹنیاں اور مربے ملے میری بڑی بیٹی کی الماریوں سے میری چھوٹی بیٹی کو؟" انہوں نے سادگی

سے سوال کیا۔

"دیکھیں۔۔۔ میں جیسی ہوں' ٹھیک ہوں کوئی کسی چیز میں اچھا ہوتا ہے' کوئی کسی میں۔ پھر مجھے نہ اتنا ٹائم ملتا ہے نہ موقع کہ گھر کے کام کروں۔" ابا رازداری سے قریب ہوئے اور آہستہ سے بولے۔ "ساری ست نکمی اور پھوہڑ لڑکیاں یہی کہتی ہیں۔"

حنہ نے شدید ناراضی سے ان کو دیکھا تھا۔ وہ اب وہیل چیئر موڑ رہے تھے۔



تمام عمر بگولوں کی فصل کاٹے گا
کہا تھا کس نے کہ صحرا کی آبیاری کر

اس تاریک سی دوپہر ڈاکٹر واسطی جو سرکاری اسپتال میں ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے' اسپتال کے پارکنگ ایریا کی طرف جا ہی رہے تھے کہ ایک سیاہ شیشوں والی کار ان کے سامنے آ رکی اور سوٹ میں ملبوس دو افراد باہر نکلے۔

"آپ کے گھر پہ ہاشم کاردار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور کار کا دروازہ کھول دیا گویا اندر بیٹھنے کا اشارہ ہو۔ ڈاکٹر واسطی کا چہرہ ایک دم سفید پڑنے لگا تھا۔

جس وقت وہ ان افراد کے ہمراہ اپنے ہی گھر میں کسی یرغمال کی طرح داخل ہوئے سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور بڑے صوفے پہ ہاشم کاردار براجمان نظر آ رہا تھا' گرے سوٹ میں ملبوس' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' وہ دو انگلیوں میں خشک سگار گھما رہا تھا۔ سامنے میز پہ ڈاکٹر واسطی کے سگار کا ڈبہ کھلا پڑا تھا۔

"آؤ۔۔۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" جس طرح وہ سلگتی پر تپش نظریں ان پہ گاڑے بولا تھا' ان کے قدم سست ہوئے۔ ساتھ جواہرات بیٹھی تھی۔ سیاہ لمبی کافتان شرٹ اور سفید ٹائٹس میں سیدھے بھورے بال چہرے کے ایک طرف گرائے اور لبوں پہ سرخ لپ اسٹک لگی تھی۔ وہ بھی ان کو ان ہی تپتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کونے میں نوشیرواں گھٹنے ملائے بالکل خاموش شل بیٹھا تھا۔ وہ ڈھیلے قدموں سے چلتے سامنے آئے۔ رئیس نامی سوٹ میں ملبوس اونچے لمبے مرد نے ایک کرسی پٹخنے کے انداز میں ہاشم اور جواہرات کے مقابل رکھی اور انہیں کندھے سے پکڑ کر گویا اس پہ دھکیلا۔ پھر تمام گارڈز باہر چلے گئے۔

"ہاشم! کیا ہوا' آپ لوگ اتنے۔۔۔" ڈاکٹر واسطی نے بولنے کی کوشش کی مگر ہاشم ایک دم اٹھا' ایک کاغذ ان کے سامنے پٹخا۔

"یہ وہ بکواس ہے جو میرے باپ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ پہ تم نے لکھی تھی۔" غصے سے وہ غراتے ہوئے ان کے سامنے میز کے کنارے پہ آ بیٹھا۔ "اب مجھے بتاؤ' میرا باپ کیسے مرا تھا' کس نے مارا ہے میرے باپ کو؟ بولو۔" ایک دم ان کا کالر پکڑ کر جھٹکا دیا تو ڈاکٹر واسطی ہکا بکا رہ گئے۔

"ہاشم! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کاردار صاحب کی موت گرنے کے باعث۔۔۔"

ہاشم نے زور کا طمانچہ ان کے منہ پر جڑا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ گریبان سے پکڑ کر ان کو اپنے سامنے کھڑا کرتا' جواہرات اٹھی اور ہاشم کے دونوں کندھوں پہ دباؤ ڈال کے اسے تھمنے کو کہا۔ شیرو اب بھی شل گم صم بیٹھا تھا۔

"ہاشم! تم واپس بیٹھو' ان سے بات میں کروں گی۔ ہاشم' یہ میرا حکم ہے۔" وہ جو غصے میں پاگل ہو رہا تھا' بس نہیں چلتا تھا کہ ڈاکٹر کو دبوچ کر مار ہی دے' بمشکل اٹھا اور صوفے تک گیا مگر بیٹھا نہیں۔ اس کی رنگت سرخ تھی اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اب کے جواہرات اسی اطمینان سے ڈاکٹر واسطی کی طرف متوجہ ہوئی جن کا چہرہ تھپڑ کے باعث بائیں جانب کو لڑھک گیا تھا اور اب وہ کھانستے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ڈاکٹر واسطی۔۔۔ میں جواہرات کاردار ہوں۔ گردن اٹھاؤ اور مجھے دیکھو۔۔۔ دیکھو کہ میں کون ہوں۔" جواہرات نے تحکم سے کہا تھا۔ کھانستے کھانستے نقاہت زدہ سرخ چہرہ انہوں نے اٹھایا اور ملکہ کو دیکھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل سامنے

کہ ہاشم عقب میں چھپ گیا تھا۔

"میں جواہرات ہوں۔۔۔ اورنگ زیب کاردار کی بیوی' ہاشم کاردار کی ماں' میں ہوں مالک اس ساری ایمپائر کی۔" سینے پہ ایک انگلی سے دستک دیتی وہ کہہ رہی تھی۔ "میں ڈائریکٹر ہوں' میں چیف ایگزیکٹو ہوں۔ میں ہوں ملکہ!" شعلہ بار نظریں ڈاکٹر کے چہرے پہ جمائے وہ اب ان کی کرسی کے گرد گول چکر میں ٹہلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر واسطی کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا' ایک جارہا تھا۔ بار بار کچھ کہنے کو لب کھولتے' پھر بے چارگی سے بند کردیتے۔

"اس وقت ڈاکٹر واسطی! اس کمرے میں ساری طاقت کی مالک میں ہوں۔ یہاں سب میرے حکم پہ چلتے ہیں۔ سب میرے پابند ہیں اور جو دھوکا تم نے ہمارے خاندان کو دیا ہے وہ دراصل تم نے مجھے دیا ہے۔" گھوم کر ان کے سامنے آتی' وہ چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔ ہاشم ابھی تک بھرا کھڑا غصے سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ شیرو کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پہ جمی تھیں اور لب سلے تھے' مہربند۔

"اس وقت اگر تمہیں کوئی سزا دے سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اس وقت تمہیں اگر کوئی فنا کرسکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ تمہارے اوپر صرف میں قہر ڈال سکتی ہوں۔" ان کے گرد چکر میں گھومتے' وہ بلند آواز میں بول رہی تھی اور ڈاکٹر واسطی نم آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے۔

"اگر اس وقت تمہارے خاندان کو تمہاری زندگی کو کوئی برباد کرسکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اگر اس وقت تمہاری اولاد کو تمہارے سامنے لاکر کوئی مار سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے۔ جہنم بھی میں ہوں' قہر بھی میں ہوں۔"

ڈاکٹر نے پیشانی کف سے رگڑی۔ چہرہ جھکالیا۔ ہاشم سر جھٹک کر کچھ بڑبڑایا تھا۔ جواہرات اسی طرح طواف میں گھومتی بول رہی تھی۔ "اور اگر اس وقت تمہیں کوئی بچاسکتا ہے تو وہ میں ہوں۔"

"ممی! میں اس کو۔۔۔" ہاشم ایک دم غرانے لگا مگر جواہرات نے سختی سے اسے گھورتے تھم جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بمشکل ضبط کرپایا۔

"اگر اس وقت تمہیں کوئی معاف کرسکتا ہے تو وہ بھی میں ہوں۔ تمہیں صرف میں ہی اس عذاب سے نجات دلاسکتی ہوں۔ صرف میں تمہیں اپنے بیٹے کے قہر اور اپنے شوہر کی روح سے بچاسکتی ہوں۔ صرف میں تمہارے خاندان کو اس وقت اس شخص سے بچاسکتی ہوں جس کے کہنے پہ تم نے رپورٹ بدلی۔ صرف میں۔۔۔ صرف میں تمہاری ڈھال بن سکتی ہوں۔" اونچا اونچا غرانے کے انداز میں کہتی وہ ہنوز ان کے گرد طواف کررہی تھی۔ ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ گرالیا۔

"میں ہی رحم ہوں' میں ہی مرحمت ہوں' میں ہی قہر ہوں' میں ہی تمہاری ناخدا ہوں اس وقت۔۔۔ سو۔۔۔" سات چکر مکمل ہوئے وہ اب ان کے سامنے میز کے کنارے پہ آٹکی اور تنی گردن کے ساتھ ان کو دیکھا۔ "سو اب مجھے بتاؤ۔۔۔ کس کے کہنے پہ تم سے جھوٹ بولا تھا؟"

ڈاکٹر واسطی نے چہرہ اٹھایا۔ سفید رنگت اور نم آنکھوں سے اس شیرنی کو دیکھا' پھر پیچھے کھڑے ہاشم کو جس کا چہرہ ابھی تک سرخ تھا۔

"کرنل خاور!" بدقت الفاظ ڈاکٹر واسطی کے لبوں سے نکلے۔ آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹوٹ کر گرا۔ "کرنل خاور نے مجھے دھمکایا تھا' میں نے ڈر کے باعث اپنے خاندان کی حفاظت کے لیے۔۔۔ کیا یہ سب۔۔۔"

جواہرات کے لبوں سے اطمینان انگیز سانس نکلی۔ گردن مزید تن گئی۔ مڑ کر ہاشم کو دیکھا۔ جس نے لمحے بھر کو آنکھیں میچ لی تھیں' پھر نڈھال سا صوفے پہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کو وہ بالکل لاجواب ہوگیا تھا۔

کسی نے محسوس نہیں کیا کہ۔۔۔ خاموش سا نوشیرواں اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

"ہم کیسے مان لیں کہ تم سچ بول رہے ہو؟ کرنل خاور ہمارا وفادار ملازم ہے۔" جواہرات اب بلند آواز میں ڈاکٹر کو مخاطب کررہی تھی۔ ہاشم بھی چہرہ اٹھا کر

دیکھنے لگا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں' اس نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔" وہ بے چارگی سے بولے تھے۔

"کیا ثبوت ہے اس کا کہ وہ تمہیں دھمکا رہا تھا؟"

"ثبوت..." وہ ٹھہرے۔ باری باری دونوں کی صورتیں دیکھیں۔ "اس نے کام کے بعد میرے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر کیے تھے۔"

"تم نے وہ پیسے رکھ لیے؟" جواہرات نے آنکھیں نکالیں۔

"مجھے معاف کردیں مسز کاردار! میں مجبور تھا۔ میں نہ رکھتا تو وہ مجھ پہ شک کرتا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"جو تم کہہ رہے ہو' اس کی میں... خود... خود تصدیق کرواؤں گا اور اگر یہ جھوٹ نکلا تو یاد رکھنا' میں تمہاری جان لے لوں گا۔ خیر' چھوڑوں گا تو میں تمہیں اب بھی نہیں۔" ہاشم تن فن کرتا وہاں سے نکل گیا۔

جواہرات نے ایک فاتحانہ مگر آسودہ نظر ڈاکٹر پہ ڈالی جنہوں نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ پھر وہ اسی اعتماد کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"ہم آنکھیں بند کرکے اس کی بات نہیں مان سکتے ہاشم... تم تصدیق کرواؤ... بغیر تصدیق کے خاور کو الزام دینا..." باہر وہ بڑے سبھاؤ سے کہہ رہی تھی' جب ہاشم نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"مگر آپ اس وقت مجھے بتاتیں تو میں دیکھتا خاور میری ناک کے نیچے یہ سب کیسے کرتا ہے مگر آپ نے ممی..." ملامتی نظروں سے اسے دیکھتے اس نے سر جھٹکا۔ "آپ نے سعدی کو بتایا مگر مجھے نہیں۔" اور رخ موڑ لیا۔ جواہرات بالکل لاجواب بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

نئی اک داستاں لکھیں گے ہم نے سوچ رکھا ہے
ختم کردیں گے سب ہی قصے مگر آرام سے پہلے

جب وہ گھر کے سامنے اتری تو ٹیکسی کی طرف سے زمر چلی آرہی تھی۔ سفید لباس اور سیاہ کوٹ میں ملبوس گویا ابھی سماعت سے لوٹی تھی۔ ہاشم اور شیرو اندر چلے گئے مگر جواہرات رک گئی۔ زمر قریب آئی' نرمی سے مسکرا کر اس سے ملی۔

"مسز کاردار! مجھے آپ سے ایک کام ہے۔"

"شیور ہنی' بولو!" وہ بھی نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے اسے سبزہ زار پہ آگے لے آئی۔

"میں نے فارس کو بمشکل قائل کیا ہے کہ وہ اپنے گواہ کے طور پہ خود پیش ہو۔"

"اوہ... مگر یہ تو اچھا آئیڈیا نہیں ہے۔"

"مسز کاردار!" زمر نے مسکرا کر اس کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھے۔ دونوں سبزہ زار پہ آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ اوپر سیاہ بادل ابھی تک بوجھل تھے اور ہلکے گرج بھی رہے تھے۔ "آپ بھول گئیں' میں نے فارس سے کیوں شادی کی تھی؟"

جواہرات ذرا چونکی' پھر مسکرائی۔ "تم اس کو اسی کی گواہی میں پھنسانا چاہتی ہو؟ تو کیا تم ہی نے اس کو اس مقدمے میں..."

"نہیں' یہ صرف اتفاق تھا' اس کے اور دشمن بھی ہیں لیکن میں اس موقع کو کھونا نہیں چاہتی۔"

"مگر وہ عقل مند ہے' گواہی محتاط طریقے سے دے گا۔" جواہرات نے بظاہر لاعلمی ظاہر کی۔ زمر قدرے قریب ہوئی اور مسکرائی۔ "نہیں' وہ نہیں دے گا' کیونکہ عین اس وقت وہ کہیں اور کسی اور جرم میں ملوث تھا۔ میں اس کو پھنسالوں گی' اپنا انتقام لے لوں گی مگر یہ صرف تب ہی ممکن ہے جب وہ گواہی کے لیے کٹہرے میں آئے۔"

"وہ راضی ہے تو کیا مسئلہ ہے؟"

"مسز کاردار! میں نے بہت اداکاری سے اسے قائل کیا ہے۔ اب مجھے اس کی گواہی کے وقت تک خود کو اس کا مخلص وکیل ثابت کرنا ہوگا مگر وہ... وہ ڈیفنس وٹنس ون (DW1) (دفاع کے گواہ) کے طور پہ پیش ہوگا۔ خود سوچیے' ابھی تمام پراسیکیوشن witness (pws) پیش ہوں گے۔

کورٹ witness (cw) پیش ہوں گے۔ اس کے بعد Dw1 کی باری آئے گی۔ مہینے لگتے ہیں اس کارروائی میں۔" پھر اپنائیت سے اس کا ہاتھ دبایا۔
"آپ نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا' پلیز میری مدد کریں۔ میں زیادہ عرصہ اداکاری قائم نہیں رکھ پاؤں گی۔ مجھے ڈر ہے وہ جیل توڑ کر بھاگ جائے گا۔ کورٹ کا آپ کو معلوم ہے' لمبی تاریخ دے دیا کرتے ہیں' سوائے..."
ذرا رکی۔ "سوائے ان کیسز کے جن کو وہ خود تیزی سے چلانا چاہیں۔ آپ صرف چند ڈوریاں ہلا دیں تو ہمیں تاریخ جلدی مل جایا کرے گی۔"
بادل زور سے گرجے' سیاہ دوپہر میں بجلی بھی کڑا کے کی چمکی۔ جواہرات نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ گردن مزید تن گئی' آنکھیں چمکی تھیں۔
پہلے خاور اور اب فارس۔ اس کے دشمن خود بخود پسپا ہو رہے تھے۔ بارش کی پہلی بوند اس کے اوپر گری تو وہ اسی آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گئی۔ اب صرف دو پیادے رہ گئے تھے۔ سعدی اور میری۔ جب تک زمر ٹیکسی کے دروازے پہ پہنچی' بارش ایک دم تڑ تڑ برسنے لگی تھی۔ وہ گھنگھریالے بالوں کو ہاتھوں سے جوڑے میں لپیٹتی اندر آئی۔ لاؤنج میں ٹیوب لائٹس جلی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈا سا اندھیرا پھر بھی محسوس ہوتا تھا۔ سب اپنے کمروں میں تھے۔ وہ اوپر آئی تو کمرے میں حنین صوفے پہ بیٹھی' بیر جھلاتی سوچ میں گم تھی۔
"آپ کدھر گئی تھیں؟" اسے آتے دیکھ کر وہ خیال سے چونکی۔
"میں اس امر کو یقینی بنانے گئی تھی کہ فارس کے مقدمے کی تاریخیں جلد از جلد ملا کریں۔ دیکھنا' اب پراسیکیوشن خود اس مقدمے کو تیز چلائیں گے۔" وہ بات کرنے کے ساتھ اپنی چیزیں اور پرس جو آتے ہی ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھ کر چلی گئی تھی' اب اٹھا کر ان کی جگہوں پہ رکھ رہی تھی۔ حنین غور سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھے گئی۔ اب وہ بستر کی طرف آئی اور اسے جھاڑنے لگی۔
"آپ کے باتھ روم کی صفائی کون کرتا ہے؟"
حنین اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔ کمبل کرتے زمر کے ہاتھ رکے' قدرے اچنبھے سے اس سوال پہ اسے دیکھا۔
"صداقت کرتا ہے' کبھی میں خود کرتی ہوں۔"
"میں نے تو آپ کو کبھی صفائی کرتے نہیں دیکھا۔"
"صفائی میں دو منٹ تو لگتے ہیں کیوں؟" اس کی سمجھ نہیں آیا تھا۔ حنین چپ ہو گئی۔ چند منٹ میں وہ کمرہ درست حالت پہ واپس لا چکی تھی۔
(مجھے کسی بات کا پتا نہیں چلتا۔ نہ میں اس فلیش کو ابھی تک کھول سکی۔ نہ میں فجر پہ نماز کے لیے اٹھ سکتی ہوں۔ نہ میں آرگنائزڈ ہوں' نہ نیک اور تابعدار۔ میں ایک failure (ناکام لڑکی) ہوں۔ صرف فیلیئر!) وہ مایوسی سے سوچتی رہی۔ کھڑکیوں پہ بارش تڑ تڑ برستی رہی۔



میں کس زباں سے گھر کو گھر کہوں کہ مجھے
صدف صدف میں ہجوم شرر نظر آئے
شہر کی مصروف شاہراہ پہ وہ طویل قامت عمارت تنی ہوئی کھڑی تھی۔ اوپری منزل کے اس کشادہ آفس میں مدھم بتیاں روشن تھیں۔ آبنوسی میز کے پیچھے بیٹھے ہارون عبید' کچھ کاغذات پہ باری باری دستخط کر رہے تھے۔ سیکرٹری جلدی جلدی ان کو کچھ بتاتے ہوئے کاغذ پلٹ کر اگلے صفحے سامنے لا رہی تھی۔ تب ہی دروازہ ذرا سا بج کر کھلا۔ ہارون نے چہرہ اٹھایا اور ریڈنگ گلاسز کے پیچھے سے جھانکا۔ چوکھٹ میں جینز اور ہائی نیک سویٹر میں ملبوس' سنجیدہ چہرے والا احمر شفیع کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔
"آؤ احمر! آؤ..." انہوں نے اسے آنے کا اشارہ کیا اور دستخط کرتے کہنے لگے۔ "تمہارے ساتھ ایک آئیڈیا ڈسکس کرنا تھا۔"
"سر!" اس نے ادب سے کاغذ ان کے سامنے

رکھا۔ ہارون نے ایک سرسری نظر ڈالی مگر پھر ٹھہر گئے۔ چونک کر کاغذ کو دیکھا' پھر احمر کو۔

"استعفیٰ؟" قلم کا کیپ بند کیا' عینک اتاری اور پیچھے ہو کر بیٹھے۔ سر کے خم سے لڑکی کو جانے کا اشارہ کیا اور اسے بیٹھنے کا۔

"سر! میرا کانٹریکٹ آپ کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ آپ کو اگلے ماہ سینیٹر بنایا جا رہا ہے' سو میرا کام بھی ختم۔"

"ہوں!" وہ قلم ہاتھوں میں گھماتے غور سے اسے دیکھنے لگے۔ "تم خفا ہو کسی بات پہ؟"

"نہیں سر! مجھے بس ایک بہتر جاب مل گئی ہے۔" وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"اچھا گڈ۔۔۔ کس کے ہاں؟"

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے' میں جوائن کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔"

اس بات پہ ہارون نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ "میں نے تمہارے جیل والے دوست کے لیے سفارش کردی تھی' میری بیٹی بھی بالخصوص اس کے لیے وہاں گئی تھی' تم شیور ہو کہ تم ہم سے خفا نہیں ہو؟"

"جی سر! میری اتنی اوقات نہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔"

"کانٹریکٹ ری نیو کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں میں۔" وہ قائل نہیں ہوئے تھے سو اسے پیش کش کی۔

"سر! آپ جب بلائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا مگر میں اس دوسری جگہ واقعی جاب کرنا چاہتا ہوں۔" احمر متانت بھری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔" سر اثبات میں ہلاتے وہ اس کاغذ پہ دستخط کرنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔

جب وہ اس عمارت سے نکل کر زیر زمین پارکنگ ایریا میں اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کے قریب ایک لمبی' سیاہ شیشوں والی کار آرکی۔ تہ خانے میں اونچے گول ستونوں پہ کھڑے اس پارکنگ لاٹ میں خالی کاریں دور دور تک کھڑی تھیں۔ روشنی کم تھی۔ ویرانی اور خاموشی۔۔۔ ایسے میں احمر نے ویران نظروں سے اس سیاہ لمبی کار کو دیکھا' جس میں سے گارڈ نکل کر باہر کھڑے ہو گئے تھے اور پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔

اندر کھلی سی جگہ تھی اور نشستیں آمنے سامنے بنی تھیں۔ ایک نشست خالی تھی اور دوسری پہ تمکنت سے بیٹھی جواہرات مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو اگین احمر!" احمر نے سر کو خم دیا اور اندر اس کے سامنے آ بیٹھا۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا' دونوں تنہا رہ گئے۔

"تمہارا شکریہ' ڈاکٹر واسطی والے معاملے کے لیے۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئی۔

ہاشم نے جواہرات کو اس کا سیل فون اسی روز واپس کر دیا تھا مگر اس نے باہر جا کر ایک پے فون سے احمر کو کال کی تھی۔ ہوٹل کا فون' اپنا ملازم' اسے کسی پہ بھروسا نہ تھا۔ احمر سے اس نے مدد مانگی تھی۔ بدلے میں ایک آفر دی تھی۔ ایک کام ہو چکا تھا' دوسرا ہونے جا رہا تھا۔

"زیادہ مشکل نہیں تھا۔ آپ خاور کو ہاشم کی نظر میں معتوب ثابت کرنا چاہتی تھیں' میں نے پچھلی تاریخوں میں ان دونوں کے اکاؤنٹس میں ہیر پھیر کروا دی ہے۔ ہاشم چیک کرے گا تو سارا کام جینوئن ملے گا۔ بینک ڈیٹیلز میں دونوں کے فون بلز میں بھی ردوبدل کی گئی ہے۔ میں ایسے الگورتھمز استعمال کرتا رہتا ہوں۔ وہ فون ریکارڈ بھی نکلوائے گا۔ مجھے صرف یہی ثابت کرنے کو کہا تھا آپ نے کہ خاور نے ڈاکٹر کے ساتھ ملی بھگت سے کوئی کام کروایا ہے۔ تاریخ پونے دو سال پہلے کی دی آپ نے مگر یہ نہیں بتایا کہ معاملہ کیا تھا؟"

"تم جانتے ہو وہ میں نہیں بتاؤں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنے ایئر رنگ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ "کیوں نا ہم اس آفر کے بارے میں بات کریں جو میں نے تمہیں دی تھی؟" احمر نے گہری سانس لی۔

"میں نے یہ سب اسی جاب کو حاصل کرنے کے

لیے کیا ہے مگر مسز کاردار' میں خاور کی طرح کا سیکورٹی آفیسر نہیں بن سکتا۔"

"احمر! مجھے صرف ایک پی آر او چاہیے' میرا ایک ذاتی نائب اور تم قابل اعتبار ہو۔ خاور کا نعم البدل میں اس سے بہتر رکھنا چاہتی ہوں۔"

"خاور کا نعم البدل آپ کو کبھی نہیں ملے گا۔ وہ آل ان ون تھا۔ ہاں دو تین لوگ مل کر اس کا کام سنبھال سکتے ہیں۔ میں یہ جاب لینا چاہوں گا۔" اب کے وہ مسکرایا۔ "مگر پیسے سے زیادہ مجھے تحفظ چاہیے' میرا کوئی مقام ہونا چاہیے۔ میں کسی کی کمین نوکر کی طرح نہیں رہنا چاہتا۔"

"احمر! تمہارے اندر سب سے پرکشش بات معلوم ہے کیا ہے؟" وہ مسکرا کر اسے دیکھتی محظوظ انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تمہارے اندر کا شر' تمہاری فراڈ' اور شیطانیت۔ طاقت کی خواہش۔ کنٹرول کی آرزو۔ تم (ambitious) ام بیشس (اولوالعزم) ہو۔ مجھے ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے۔"

"پھر میں آپ کے لیے کام کرنے کو تیار ہوں' مسز کاردار!" سر اٹھا کر ایک عزم سے وہ بولا تھا۔ جواہرات نے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ احمر نے سر کو خم دیتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کاردارز کا حصہ بننے پہ خوش آمدید!" مسکرا کر وہ بولی تھی۔ وہ بھی بھاری دل سے مسکرایا۔



دیکھ آکر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے

اس صبح جب سارے شہر کو سرما کی نرم گرم دھوپ نے اپنے پروں میں سمیٹ رکھا تھا' زمر ڈاکٹر قاسم کے آفس میں ایک لمبی ملاقات کے بعد قدرے ناخوش سی کرسی سے اٹھ رہی تھی۔

"میں سوچ کر بتاتی ہوں آپ کو..." وہ بھی ساتھ ہی اٹھے۔

"آپ جو بھی فیصلہ کریں' جلدی کیجئے گا۔ ڈونر کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اس نے خاموشی سے اثبات میں سرہلایا اور پرس کی اسٹریپ کندھے پہ ڈالی۔

"زمر... کسی دوست سے اپنا مسئلہ شیئر کیجئے گا۔ اس طرح آپ بہتر فیصلہ کر سکیں گی۔" وہ فقرہ اس کے ذہن میں اٹک گیا۔ وہاں سے نکل کر' بے مقصد سڑکوں پہ کار چلاتے' وہ لب کاٹتے ہوئے اسی فقرے میں اٹکی رہی۔

"اتنے سال بعد احساس ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔" سگنل پہ کاروں کے ونڈ اسکرین کے پار پر سوچ نظریں جمائے خود سے بڑبڑائی۔ "صرف سعدی تھا۔ میں اس سے ہر بات کر سکتی تھی' باقی اسکول کالج کی فرینڈز ہیں مگر ان سے... ان سے وہ دل کا تعلق کبھی نہیں بن سکا اور پچھلے چار سال... جب سعدی ساتھ نہیں تھا... تو بھی میں نے کوئی نیا دوست نہیں بنایا' جس سے بغیر کسی ڈر یا جھجک کے میں اپنا حال دل کہہ سکوں۔ میں کیا کروں؟ کس سے کہوں؟" اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب کھولیں تو خود کو اس ملاقاتی کمرے میں پایا جہاں وہ میز پہ ہتھیلیاں رکھے' کرسی پہ بیٹھی تھی اور اس کے سامنے فارس بیٹھ رہا تھا۔ وہ وہاں کیوں آئی' کیسے آئی' کیا لینے آئی' اسے کچھ معلوم نہیں تھا' بس دل نے کہا کہ یہی ٹھیک ہے تو سوچا' شاید واقعی دل ٹھیک ہو۔

"کہیے..." وہ سنجیدگی مگر قدرے لاپروائی سے اسے مخاطب کر کے بولا تو زمر ذرا چونکی۔ خالی خالی نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ وہ باہم انگلیاں پھنسا کر میز پہ رکھے آگے ہو کر بیٹھا' اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کچھ سوالات پوچھنے تھے ناظم کے بارے میں۔" اس نے اپنی فائل کھول کر سامنے رکھی اور لہجے کو مصروف بناتے ہوئے چند نکات پوچھنے لگی۔ دوسری طرف خاموشی چھائی رہی تو زمر نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

وہ پتلیاں سکیڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں روشن دان سے تیز سنہری دھوپ چھلک

رہی تھی اور شعاعیں فارس کے اردگرد سے نکل کر میز کو روشن کر رہی تھیں۔ ایسے میں فارس کا چہرہ تاریکی میں لگتا تھا' زمر کو بھی آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھنا پڑ رہا تھا۔

"گھر میں سب خیریت ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں؟" زمر نے آہستہ سے قلم کا ڈھکن بند کیا۔ چہرہ جھکائے چند لمحے سوچتی رہی۔

"میں احمر کے ساتھ اس ہوٹل میں تمہارے معاملے کی کھوج لگانے گئی تھی' یہ معلوم کر لیا تھا تم نے' پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ اسپتال اپنے ڈاکٹر سے بار بار ملنے کیوں جا رہی تھی؟"

نظر اٹھا کر فارس کو دیکھا تو وہ ایک دم چونکا تھا' پھر مزید آگے ہوا۔

"آپ نے کہا تھا روٹین کا چیک اپ ہے' ڈاکٹر آتا نہیں ہے' اس لیے بار بار جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے یقین کر لیا تھا کیوں؟ کیا ہوا؟ کیا کوئی اور بات ہوئی ہے؟" وہ ایک دم فکر مند لگا تھا۔

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اسے واقعی نہیں معلوم تھا۔ زمر اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ گئے دنوں میں کیا گیا وہ ریسٹورنٹ ڈنر... موم بتی کا ٹمٹماتا شعلہ... زرتاشہ کا ذکر... وہ سب ایک دم سے درمیان میں حائل ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کورٹ میں ملاقات ہو گی۔" وہ جانے لگی مگر اس نے تیزی سے زمر کی کلائی پکڑی۔ وہ رکی۔ نظر اٹھا کر فارس کو دیکھا' جس نے صرف ابرو کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کو کہا تھا اور پھر... دور کھڑے ڈیوٹی اہلکار کو۔ ہولے سے کلائی چھڑاتی وہ واپس بیٹھی۔

"میرا ڈونیٹڈ کڈنی ضائع ہو چکا ہے۔" خبرنامے کی خبر کی طرح اطلاع دی۔ نظریں فارس کے چہرے پہ جمی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" بولا تو آواز دھیمی تھی۔

"بتانے لگی تھی' اس رات ریسٹورنٹ میں مگر تم نے زیادہ اہم باتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔" جیسے اپنے ہی زخموں پہ نمک چھڑکا۔ سس... درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔

"زمر... میں..." وہ جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گہری سانس لی اور سنجیدگی و فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

"آپ... ڈاکٹر نے کیا کہا' اب کیا ہو گا؟"

"ٹرانسپلانٹ کروانا ہے' ڈونر مل گیا ہے' وہ غریب آدمی ہے' عمر میں کافی زیادہ ہے' بہت صحت مند بھی نہیں ہے' میں اس سے بھی ملی تھی' ففٹی پرسنٹ سے زیادہ چانس ہے کہ میرا جسم اس کے گردے کو ریجیکٹ کر دے اور وہ گردہ لگتے ہی ضائع ہو جائے مگر مسئلہ یہ نہیں ہے۔"

"پھر...؟"

"اس آدمی کو اسی ماہ ٹرانسپلانٹ کروانا ہے اور پھر ملک سے باہر چلے جانا ہے۔ اگر مجھے نہیں دے گا تو کسی اور کو دے دے گا۔ سارا مسئلہ ٹائم لائن کا ہے۔ اگر میں ابھی سرجری کے لیے چلی گئی... تو مجھے ری کور ہونے میں بھی اتنا وقت لگے گا... تمہارا ٹرائل متاثر ہو گا۔" بے بسی سے فائل کی طرف اشارہ کیا۔ فارس "ہوں" کہتا پیچھے کو ہو کر بیٹھا۔ "کیا ڈونر رک نہیں سکتا؟ اس کا بندوبست ڈاکٹر نے کیا تھا یا آپ کا کوئی جاننے والا ہے؟"

"نہیں' ڈاکٹر نے ہی ڈھونڈا تھا۔ وہ نہیں رک سکتا' اس کی بھی مجبوری ہے' مجھے خود بھی زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں دو ڈاکٹرز کے پاس گئی ہوں دونوں یہی کہتے ہیں۔"

"اور آپ کو اپنی صحت کا انتخاب کرنا ہے یا میرا... ہے نا؟" وہ کچھ دیر بعد اسی سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو آپ کس کو چوز (منتخب) کریں گی؟"

زمر چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ چار سال... وہ فون کال... نکاح نامہ... موم بتی کا ٹمٹماتا شعلہ... ہیرے کی لونگ... ہر شے درمیان سے نکل گئی۔

"میں ٹرائل نہیں چھوڑ سکتی' کسی بھی قیمت پہ نہیں لیکن اگر میں نے اس ڈونر کو جانے دیا تو مجھے بعد

میں ڈونر کیسے ملے گا فارس۔۔۔؟" تھک کر جیسے اس نے سر جھٹکا۔ "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ کم از کم کچھ عرصہ میں اور جینا چاہتی ہوں۔"
وہ خاموش سا اسے دیکھے گیا۔
"تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"
"آپ یہ ٹرانسپلانٹ مت کروائیں۔" بہت دیر بعد وہ اس کی آنکھوں پہ نگاہیں جمائے بولا تو لمحے بھر کو زمر کا دل ڈوبا۔ کوئی آس سی ٹوٹی۔ شاید اسے امید تھی کہ وہ کہے گا' وہ اس کی فکر نہ کرے' اپنا علاج کروائے مگر وہ اسے خود کو منتخب کرنے کا کہہ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔" زمر نے نظریں جھکالیں۔
"زمر!" وہ قدرے آگے ہوا۔ شعاعیں ہنوز اس کے اطراف سے نکل کر میز پہ گر رہی تھیں اور اس کا چہرہ ابھی تک اندھیرے میں تھا۔ "میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ میں خود غرض ہوں۔ بلکہ وہ ڈونر۔۔۔ وہ صحت مند نہیں ہے' رسک بہت زیادہ ہے' پھر میں بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوں گا' میں ادھر ہوں' گھر میں سب الگ ڈسٹرب ہیں۔ ابھی آپ سرجری والا رسک مت لیں۔" لمحے بھر کو رکا۔ زمر نے اس کی سنہری آنکھوں کو دیکھتے اثبات میں سرہلایا۔
"آپ کی شکل سے لگ رہا ہے' آپ دل سے راضی نہیں ہیں۔" ذرا دیر بعد وہ مدھم سا بولا۔ زمر نے تردید نہیں کی۔ "آپ کو مجھ پہ اعتبار ہے؟"
"ہے مگر۔۔۔"
"آپ بس مجھ پہ اعتبار کریں۔ مجھے یہاں سے نکلنے دیں۔ میرا وعدہ ہے' میں آپ کا یہ مسئلہ حل کردوں گا۔"
"تم نہیں کرسکتے۔ ڈونر اب نہیں ملے گا۔"
فارس لمحے بھر کو چپ ہوا۔ "نہیں۔۔۔" وہ جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر رک گیا۔ "آپ کو ڈونر کڈنی چاہیے نا؟ میں ایک ڈونر کے بارے میں جانتا ہوں' آپ کا ٹرانسپلانٹ ہوجائے گا۔ بس مجھے یہاں سے نکلنے دیں۔" وہ چونکی۔
"کون۔۔۔؟" اس کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ "اور تمہیں کیسے پتا اس کا کڈنی مجھے میچ کرے گا؟"
"زمر۔۔۔ جس کڈنی ڈونر کو میں جانتا ہوں' اس کا کڈنی کبھی آپ کا جسم ریجیکٹ نہیں کرے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے' پلیز۔۔۔!" آگے کو ہوئے' میز پہ ہاتھ رکھے' وہ قدرے بے چینی اور فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔ "آپ صرف مجھ پہ بھروسا کریں' کریں گی نا؟" وہ الجھ گئی تھی' فارس کس کی بات کررہا تھا۔
مگر۔۔۔ اس نے اس کی آنکھیں دیکھیں اور پھر ساری مزاحمت' سارے شکوک دم توڑ گئے۔ "ٹھیک ہے' جب تم نکلو گے تو ہم یہ مسئلہ تب حل کریں گے۔"
فارس کے لبوں سے ایک اطمینان بخش سانس نکلی۔ وہ اٹھ گئی تو وہ دھیرے سے بولا۔ "جو کچھ میں نے اس رات ریسٹورنٹ میں کہا' وہ۔۔۔"
"نہیں فارس!" زمر ایڑیوں پہ گھومی اور ہاتھ اٹھا کر ایک دم سختی سے اسے روکا۔ "اس جگہ مت جاؤ' وہ جو بھی تھا وہ ذاتی تھا' وہ جہاں تھا' وہیں ہے اور یہ۔۔۔" اس کی فائل کی طرف اشارہ کیا "یہ ٹیم ورک ہے۔ اس میں اگر ہم امن سے کام کررہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "وہ" سب دھندلا گیا ہے۔ وہ جہاں تھا' وہیں ہے۔"
تنبیہہ کرکے وہ مڑ گئی اور وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔



خبر ہوتی اگر بعد از محبت یہ جنوں ہوگا
تو ہم رستہ بدل لیتے برے انجام سے پہلے

اس چمکیلے دن جہاں اب بھی سڑکوں اور سبزہ زاروں گزشتہ روز کی بارش کا پانی ہلکا ہلکا ٹھہرا نظر آتا تھا' وہ اونچی کوٹھی اپنے ستونوں پہ کھڑی' بالکل خشک اور نکھری سی کھڑی تھی۔ گیٹ کھلے تھے اور اندر دو گاڑیاں یکے بعد دیگرے داخل ہوئی تھیں۔ کھٹ کھٹ' دروازے کھلے۔ گارڈ نکلے۔ ہاشم بھی باہر نکلا۔ سن گلاسز اتارے' اور ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں

دوڑائی۔ پھر سب کو وہیں رہنے کا اشارہ کرتا تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اندر لابی تھی۔ پھر لاؤنج۔ دیوار پہ شہری اور سونی کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ اسی دیوار سے لگے صوفے پہ سونی بیٹھی' سر جھکائے' ٹیب پکڑے گیم کھیل رہی تھی۔ ایک ملازمہ قریب ہی الرٹ سی بیٹھی تھی۔ اسے یوں آتا دیکھ کر فوراً" اٹھی۔

"سونی!" بھاری آواز میں سنجیدگی سے اس نے بیٹی کو مخاطب کیا تو سونی نے چہرہ اٹھایا۔ آنکھیں چمکیں۔ "بابا۔" ٹیب چھوڑ کر اٹھی اور بھاگ کر اس کے پاس آئی مگر ہاشم نہیں ہلا۔ نہ ہی بچی کو گلے سے لگایا۔ بس ملازمہ کو مخاطب کیا۔ "سونی کا سامان کار میں رکھواؤ اور اسے بھی کار میں بٹھاؤ۔ شہری کہاں ہے؟"

ملازمہ اس غیر متوقع حکم پہ قدرے تذبذب کا شکار ہوئی۔

"وہ اپنے کمرے میں۔" ہاشم سنے بغیر تیزی سے اس کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازہ پیر کی ٹھوکر سے کھولا' تو وہ جو سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی کانوں میں ایئر رنگ پہن رہی تھی' اکتاہٹ سے سخت سست سنانے لگی تھی' مگر آئینے میں اپنے پیچھے نظر آتے ہاشم کو دیکھ کر چونکی۔ پھر پوری اس کی طرف گھومی۔ چھوٹے بالوں کی اونچی پونی بنائے' ست رنگی شرٹ' سفید پینٹ پہنے' وہ میک اپ لگائے' تیار نظر آرہی تھی۔

"تم ادھر کیسے؟" اچنبھے سے اس نے پوچھا تھا۔ ہاشم نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور تیزی سے اس کے سر پہ آپہنچا' اسے گردن سے دبوچ کر دیوار سے لگایا۔ ایئر رنگ چھناکے سے زمین پہ جاگرا۔

"ہاشم۔ تم کیا۔" وہ ہکابکا اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کا گلا بھینچ رہا تھا' آنکھیں ابل رہی تھیں۔

"تمہارے سیف میں نیلے رنگ کے لفافے میں ایک سی ڈی ہے' ہے یا نہیں؟" چبا چبا کر بولتے وہ اس پہ نظر گاڑے ہوئے تھا۔

"ہاشم۔ چھوڑو۔" اس نے مزید زور سے گلا دبایا' شہرین کا سانس رکنے لگا۔

"ہے یا نہیں؟" سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ غرایا تھا۔

"ہے۔ ہے۔ مجھے چھوڑو!" مگر ہاشم نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچے زور بڑھایا۔ اس کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

"کہاں سے آئی ہے وہ تمہارے پاس۔؟"

"سعدی۔ سعدی نے دی تھی۔ مجھے چھوڑو میں بتاتی ہوں۔" ہاشم نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی اور پھر گردن پہ ہاتھ رکھے کھانستے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھتی گئی۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ پھر چہرہ اٹھا کر صدمے اور نفرت سے اسے دیکھا۔

"تم انسان نہیں جانور ہو۔"

وہ پھر اس کی طرف بڑھا تو شہری جلدی سے پیچھے کو ہٹی۔ "سعدی۔ سعدی نے دی تھی۔ میں نے اس کو ایک کام کہا تھا' اس نے۔ یہ رکھوائی تھی۔"

بری طرح کھانستے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب کھانسی سنبھلی تو اس نے اٹھ کر لاکر کھولا اور اندر سے وہ نیلا لفافہ نکال کر ہاشم کو تھمایا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"یہ encrypted ہے اور میرے پاس اتنا وقت اور دماغ نہیں ہے کہ اسے کھولتی پھروں۔ اس نے کہا تھا اگر مجھے کچھ ہوا تو یہ میڈیا کو دے دینا۔"

"میں نے کیا کرنا تھا کسی کو دے کر؟ ایک دو دفعہ کھولنے کی کوشش کی' نہیں کھلی تو چھوڑ دیا۔ میں تو اسے بھول بھال بھی گئی تھی مگر تمہیں کس نے بتایا اس بارے میں؟" ہنوز گلے پہ ہاتھ رکھے وہ حیرت اور ناگواری سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر خیال آیا۔ "وہ لیٹ می گیس۔ سعدی نے بتایا ہوگا۔"

"کیا کام کہا تھا تم نے اسے؟" وہ بلند آواز میں گرجا۔

''نہیں بتاؤں گی اور... ابھی کے ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔'' بازو لمبا کر کے دروازے کی طرف اشارہ کرتی وہ چلائی تھی۔

''تم نے یہ ویڈیو لیک کی ہے شہری اور میں یہ جانتا ہوں مگر میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ابھی' کیونکہ تم سے بڑے مسائل ہیں فی الحال میرے پاس لیکن اس کے بعد...'' ویڈیو والا پیکٹ ہاتھ میں ہلاتے' تنبیہہ کرتے بولا تھا۔ ''اس کے بعد میں تمہیں دیکھ لوں گا اور اس دفعہ میں تمہیں کوئی رعایت نہیں دوں گا۔''

''گیٹ آؤٹ!'' وہ بے بسی سے چلائی۔ ہاشم ایک سخت نظر اس پہ ڈالتا باہر نکل گیا۔



ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابش
جو کناروں کو ملاتے مر جاتے ہیں

راستے میں اس نے سونیا سے کوئی بات نہیں کی۔ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ سونی کو گھر ڈراپ کر کے وہ آفس آیا اور ایک آئی ٹی کے لڑکے کو بلایا۔ دس منٹ بھی نہیں لگے اسے انکرپشن کو کھولنے میں اور جب وہ کھلی تو اندر ایک ہی ویڈیو تھی۔ جج کی ویڈیو۔ تاریخ اسٹیمپ بھی کوئی ڈیڑھ پونے سال پرانی تھی۔ سعدی نے یہ واقعی ان ہی دنوں شہری کو دی تھی۔

سو فارس نے ویڈیو لیک نہیں کی تھی۔ شہری نے کی تھی۔ وہ اب آفس میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اور اس کے بعد شہری میرے پاس آئی تھی' کمپنی میں شیئرز کی بات کرنے۔ سعدی سچ بول رہا تھا۔

اس نے میز پہ رکھی ایک دوسری فائل کھولی۔ اندر چند کاغذات رکھے تھے۔ ہر وہ شے جو ریس ڈھونڈ سکا تھا' خاور اور ڈاکٹر کے تعلقات کے بارے میں۔ سعدی یہاں بھی سچا تھا۔ ہاشم پیشانی کو مسلتے' بند آنکھوں سے کتنی ہی دیر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر فون اٹھایا۔ نمبر ملا کر سعدی سے بات کروانے کو کہا۔

''کہو ہاشم... میری یاد کیسے آئی؟''

''تم سچ کہہ رہے تھے۔'' وہ تھکان سے بولا تو دوسری طرف سعدی نے بے اختیار تھوک نگلا۔

''تمہاری دونوں باتیں سچ تھیں۔ میرے ساتھ میرے اپنوں نے دھوکا کیا ہے۔''

''کوئی گھنٹی بجی؟''

''ہاں... بج رہی ہے' عرصے سے بج رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی سے بات نہیں کر پا رہا' میرا اپنے باپ سے بہت گہرا رشتہ تھا' کسی نے ایک ہی وار میں ختم کر دیا۔ سوچتا ہوں میری بیٹی سے بھی کوئی مجھے چھین لے گا۔ وہ کیسے سروائیو کرے گی؟''

''تمہیں یہ سب بہت پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا تھا۔ ہاشم کتنے ہی لمحے خاموش رہا۔ کرسی سے ٹیک لگائے' آنکھیں موندے' فون کان سے لگائے وہ گہرے دکھ کے زیر اثر تھا۔

''کیا کوئی نجات کا راستہ ہے سعدی؟ کیا میرے لیے کوئی معافی اور توبہ کا راستہ ہے؟''

سعدی کو آگ لگ گئی تھی۔ ''تم جیسے لوگوں کے لیے کوئی معافی' کوئی توبہ نہیں ہوتی' اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ قتل معاف نہیں ہوا کرتا۔''

''اچھا...'' وہ ہلکا سا ہنسا۔ ''تمہارا خدا اتنا ظالم ہے کیا؟''

''ہاں وہ ظالموں کے لیے شدید العقاب ہے۔ اتنی زندگیاں تباہ کر کے تم معافی اور توبہ کی امید نہیں رکھ سکتے۔''

''کیا میرے لیے کوئی اچھائی کا راستہ نہیں ہے؟ کیا میں اس دلدل سے نہیں نکل سکتا؟ کیا تمہارے خدا کے پاس ذرا سی گنجائش بھی نہیں ہے میرے لیے؟''

''نہیں ہے۔ سن لیا تم نے؟ نہیں ہے۔'' وہ چلایا تھا۔ اندر بہت کچھ ابلنے لگا تھا۔

''کیا تم میرے لیے دعا کرو گے سعدی کہ میرے لیے کوئی راستہ نکل آئے؟ اس گلٹ' اس دلدل' ان جرائم سے نکلنے کا راستہ؟'' وہ آنکھیں بند کیے مدھم اور گیلی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''تم جیسا دل کا اندھا آدمی اس قابل ہے کہ کوئی تمہارے لیے دعا کرے؟'' اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ہاشم نے سست روی سے فون میز پہ ڈال دیا۔

دوسری طرف سعدی فون پٹخ کر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دماغ کھول رہا تھا مگر سکون... سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا جو کہا تھا مگر... پھر کون سی آواز تھی جو بار بار ذہن پہ دستک دینے لگی تھی۔ جب اس نے ذہن کے کواڑ بند کر لیے تو وہ دل کو کھٹکھٹانے لگی اور دل کے کھٹکے سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔ وہ مضطرب سا بیڈ کے کنارے بیٹھا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ آواز اب بلند ہو گئی۔ قرآن کی... سورہ عبس!

''وہ ترش رو ہوا۔''

اور منہ پھیر لیا۔

کہ اس کے پاس آیا ایک اندھا۔

اور کیا چیز سمجھائے تجھ کو۔

شاید کہ وہ سدھر جائے۔

یا نصیحت پکڑ لے۔

اور فائدہ دے اس کو نصیحت۔

(مختلف آیات ضمیر پہ کوڑے برسانے لگیں۔)

بلکہ بے شک وہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔

تو جو کوئی چاہے یاد کرے اس کو۔

جو مکرم صحیفوں میں ہے۔

بلند اور پاکیزہ ہیں۔

ہاتھوں میں ہیں لکھنے والوں کے۔

جو معزز ہیں' نیک ہیں۔

''نہیں اللہ تعالیٰ!'' اس نے سر اٹھا کر بے بسی بھرے غصے سے اوپر دیکھا۔ ''اتنا سب کچھ ہونے کے بعد... میرا خاندان' ہماری زندگیاں برباد ہونے کے بعد بھی آپ مجھے کیسے بتا سکتے ہیں کہ اس کی معافی اور توبہ کی امید...؟ نہیں... ہرگز نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بار بار اس بات کو جھٹلا رہا تھا۔

''شاید کہ وہ نصیحت پکڑ لے... شاید کہ...'' الفاظ ذہن پہ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ بالآخر وہ اٹھا اور گارڈ کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے کمرے کے کونے میں زمین پہ اکڑوں بیٹھا فون کان سے لگائے سر جھکائے ہوئے تھا۔

''بولو سعدی... کیا کہنا رہ گیا تھا؟'' اس کے لہجے میں تکان اب بھی تھی۔

''جب میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا تھا تو ایک بات پہ میں سخت الجھن کا شکار رہتا تھا۔''

''سعدی...''

''میری بات سنو... میں کبھی پریشان' کبھی خفا اور کبھی متحیر رہ جاتا تھا کہ وہ کتاب' جس میں اللہ مجھ سے بات کر رہا ہے' جس کا موضوع ''انسان'' ہے اور جو اربوں' کھربوں انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے سب سے بڑا نور' سب سے بڑی سپورٹ ہے' اس میں تو اللہ اور انسان کی بات ہونی چاہیے نا۔ پھر یہ ہر چند ورق الٹنے کے بعد... بار بار... موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں آ جاتا ہے؟ اچھا ٹھیک ہے' وہ کلیم اللہ تھے' اللہ سے باتیں کرتے تھے' فرعون کے سامنے کلمہ حق کہا تھا' اپنی قوم کے لیے لڑے تھے اور ہمیں اچھے سے یاد ہیں نا یہ واقعات' پھر اللہ کیوں... کیوں بار بار... آپ فرماتے ہیں کہ یاد کر موسیٰ کو اور فرعون کو۔ دنیا کی سب سے عظیم کتاب میں سب سے زیادہ جس انسان کا نام لیا گیا' وہ موسیٰ ہیں' اتنی دفعہ بار بار... کیوں؟ میں اکثر اللہ سے یہ سوال پوچھتا تھا اور مجھے اس کا جواب قید کے ان چند ماہ میں مل گیا ہے۔'' وہ سر جھکائے کہے جا رہا تھا۔

''موسیٰ علیہ السلام پتا ہے کون تھے؟ وہ بہت بڑے دل کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ فرعون نے جو بھی کیا' ان کی قوم کے مردوں کو جس طرح ذبح کیا' ان کا اور ہارون علیہ السلام کا مذاق اڑایا' ان کو جادوگر کہا' ان کے معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا اور پھر جب یکے بعد دیگرے سات قسم کے عذابوں میں فرعون مبتلا ہوا تو ہر عذاب اترنے پہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو کہتا تھا... موسیٰ...'' اس کی آواز نم ہوئی۔

''اے موسیٰ! دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ

وہ اسے ٹال دے ہم سے 'تو پھر ہم ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰ ہر دفعہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیا کرتے تھے مگر وہ لوگ آفات ٹلنے کے بعد بھی ایمان نہیں لایا کرتے تھے۔ تو پتا ہے کون تھے موسیٰ؟ وہ بہت بڑے دل کے 'بہت عظیم انسان تھے۔ ان کا ظرف بہت بڑا تھا۔ انہوں نے انتہا تک پہنچنے کے باوجود فرعون پہ give up نہیں کیا تھا' اس کو امید دکھانا نہیں چھوڑی تھی۔ اسی لیے وہ موسیٰ تھے۔ اسی لیے ان کا ذکر ہمیشہ کے لیے امر رہے گا۔"

آنکھیں بند کیے گہری سانس اندر کھینچی۔

"مگر میں ہاشم! میں موسیٰ نہیں ہوں۔ میرا اتنا ظرف اور اتنا دل نہیں ہے کہ میں تمہارے لیے دعا کروں۔ جو کچھ تم نے میری بہن کے بارے میں کہا' جو جانیں تم نے لیں' اس کے بعد میں تمہارے لیے دعا نہیں کر سکتا' مگر ہاں... راستہ ہے۔"

دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ اسے محض ہلکی ہلکی ہاشم کے تنفس کی آواز آ رہی تھی۔ "اگر تم نے سو قتل بھی کیے ہوتے' تب بھی راستہ ہے۔ اللہ ہر چیز معاف کر سکتا ہے۔ ہر گناہ' ہر قتل' ہر شرک۔"

"جب تم میرے آفس میں آئے تھے تو تم نے کہا تھا کہ قتل کے بارے میں دو مسالک ہیں اور تم اس کے ساتھ ہو جو کہتا ہے کہ قتل معاف نہیں ہوتا۔"

"میں اب بھی اسی کے ساتھ ہوں مگر وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے' جو توبہ کیے بغیر مر جاتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے اگر وہ مشرک نہیں تھے تو اللہ روز قیامت ان کو معاف کر دے گا' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' اگر انہوں نے توبہ نہیں کی تھی تو معاف نہیں ہوں گے لیکن تم ابھی زندہ ہو... اگر تم توبہ کر لو تو تمہارا ہر گناہ معاف ہو جائے گا۔"

"اور کیا مجھے خود کو قانون کے حوالے کرنا پڑے گا؟ سارہ اور فارس اور زمر سے معافی مانگنی پڑے گی؟"

سعدی نے تکلیف سے آنکھیں میچیں۔ اگلے الفاظ کہنا زیادہ کٹھن تھا۔

"تمہارا پہلا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ایکسپوز ہونے سے پہلے توبہ کر کے تم اپنا معاملہ ٹھیک کر سکتے ہو۔ اگر اللہ تمہیں معاف کر دے تو وہ لوگوں کے دلوں میں سے تمہارے لیے نفرت اور دشمنی خود بخود نکال دے گا۔"

"بس؟" ہاشم نے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے اچنبھے سے ابرو اچکائے۔ "کیا یہ اتنا آسان' اتنا سادہ ہے؟"

"یہ منحصر ہے اس پر کہ تم توبہ کو کیا سمجھتے ہو۔ توبہ صرف گلٹ محسوس کرنے اور آئی ایم سوری کہہ دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ راستے کا نام ہے۔ تمہیں تمام غلط کام چھوڑنے ہوں گے۔ ایک اچھا آدمی بننے کی کوشش کرنی ہوگی۔ راستہ درست کرنا ہوگا۔ سو قتل کرنے والے کو عالم نے صرف یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری معافی ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ جا کر فلاں بستی میں رہو' وہ نیک لوگوں کی بستی ہے تاکہ وہ شخص اپنی اصلاح کر سکے۔ تمہیں اپنے منفی کو مثبت کرنا ہوگا۔ جن کی زندگیاں تباہ کی ہیں' اب ان کی زندگیاں آباد کرو۔ اس ملک کے لیے کچھ کرو۔ اپنے اربوں روپے کے بجلی کے بل جو تم لوگوں نے کئی سال ادا نہیں کیے' ادا کرنا شروع کرو۔ نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں۔ اگر انسان بڑے گناہ چھوڑ دے تو اس کی چھوٹی چھوٹی بری عادتیں اللہ خود چھڑوا دیتا ہے لیکن اگر تم یہ نہیں کرتے اور اپنے گناہوں کو جسٹی فائی کرتے رہتے ہو' اگر تمہیں صرف افسوس ہے اپنے گناہوں پر مگر شرمندگی نہیں ہے' غور سے سنو' افسوس اور شرمندگی دو الگ چیزیں ہیں اور اگر تمہیں شرمندگی نہیں ہے' تو تم کبھی اپنی اصلاح نہیں کرو گے اور اصلاح کے بغیر توبہ نہیں ہوتی۔ سو قتل کرنے والا بھی اصلاح نہیں کر سکا تھا مگر وہ اس راستے پہ چل پڑا تھا جو نیک لوگوں کی بستی کی طرف جاتا تھا۔ سو اگر تم لوگوں سے اپنے مظالم کی معافی مانگتے ہو اور وہ تمہیں معاف نہیں کرتے' تو بھی... تمہاری کوشش دیکھی جائے گی' اگر انسان واقعی نادم ہو اور خود کو بدلنا چاہتا ہو اور اس کے لیے کوشش بھی کرے' تو کوشش کی ناکامی یا

کامیابی نہیں دیکھی جائے گی' صرف کوشش دیکھی جائے گی۔ سو کوشش کرو' اور میں بھی کوشش کروں گا کہ تمہارے لیے دعا کر سکوں۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے آہستہ سے فون بند کر دیا۔ پھر وہیں گھٹنوں میں سر دیے' آنکھیں بند کیے' اندھیرے میں بیٹھا رہا۔



وہ چاہتا تھا کہ دیکھے مجھے بکھرتے ہوئے سو
اس کا جشن بصد اہتمام میں نے کیا

سرما کی ایسی ہی ایک دوپہر میں دھوپ کمرہ عدالت کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر گر رہی تھی۔ راہ داریوں سے آتے شور میں بند دروازوں کے باعث قدرے کمی محسوس ہوتی تھی۔ جج صاحب اپنے اونچے بینچ کے پیچھے بیٹھے' سامنے دیکھ رہے تھے۔ جہاں دائیں طرف سیاہ کوٹ میں ملبوس زمر بیٹھی تھی اور مسلسل دو انگلیوں سے کان کی لو مسلتا فارس۔۔۔ سنہری آنکھیں سکیٹر رکھی تھیں۔ تازہ شیو بنی تھی۔ بال بھی تازہ کٹے تھے' اٹھی مغرور ناک اور پیشانی پہ ہلکا سا بل لیے وہ ازلی بے زار بیٹھا تھا۔ البتہ آج اس نے سفید شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ زمر کے اصرار کے باوجود وہ ٹائی پہننے پہ راضی نہیں ہوا تھا۔ اب بھی دوسری میز کے پیچھے کھڑے پراسیکیوٹر کو بولتے اور جج کو بغور سنتے دیکھ کر وہ استہزائیہ مایوسی سے سر جھٹک کر منہ میں کچھ بڑبڑایا تھا۔

You Lawyers! زمر نے گردن موڑ کر اس پہ ایک گہری نظر ڈالی۔ وہ ناخوش لگتا تھا۔ پھر وہ کھڑی ہوئی۔ بال کیچر میں باندھے' زرد چہرے مگر اٹھی گردن کے ساتھ وہ کہنے لگی۔

"مجھے کچھ کہنا ہے یور آنر۔ آئی ایم سوری پراسیکیوٹر صاحب۔۔۔" دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے معذرت کی جو ابرو بھینچ کر اسے روکنے ہی لگا تھا۔ "مجھے ابھی نہیں بولنا چاہیے' مگر اتنی پروفیشنل کرٹسی تو آپ مجھے دکھائیں گے کہ اگر میں ابھی بطور ایک انسان کچھ کہنا چاہوں' کیونکہ اپنی باری پہ اپنے دلائل میں' میں جو کچھ کہوں گی وہ بطور ایک وکیل کے ہوگا تو آپ پانچ منٹ تو مجھے دے دیں گے۔"

پراسیکیوٹر عمران نے سر کو خم دیا اور واپس بیٹھ گیا۔ جج صاحب نے زمر کو بات جاری رکھنے کی اجازت دی تو وہ اسی طرح اٹھی گردن کے ساتھ مضبوط ہموار آواز میں کہنے لگی۔

"میں ایک وکیل ہوں اور میں ایک پراسیکیوٹر رہی ہوں' پبلک پراسیکیوشن آفس ایک بھاری ذمہ داری کا نام ہے' جس کو میں نے کئی سال اٹھایا ہے۔ انسان کے سر پہ جتنی بھاری ذمہ داری ہوتی ہے اتنی زیادہ پوچھ گچھ ہوتی ہے مگر ایک پراسیکیوٹر سے پہلے میں ایک انسان بھی ہوں اور بطور ایک گواہ نہ کہ ایک وکیل میں نے۔۔۔" جج صاحب کو دیکھتے ہوئے وہ بولی تو آواز لمحے بھر کو کانپی۔ "فارس طہیر غازی کو ساڑھے چار سال پہلے جیل بھجوایا تھا۔"

کان کی لو مسلتا' وہ بے نیاز' بے زار بیٹھا شخص ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا' وہ کہہ رہی تھی۔

"کیونکہ میرے نزدیک وہ ایک مجرم تھا مگر یہ میری غلطی تھی۔ جج منٹ کی غلطی اور ہم میں سے ہر ایک ایسی غلطیاں کسی نہ کسی کیس میں کر چکا ہے مگر اس کے باوجود میری غلطی جسٹی فائی نہیں کی جا سکتی۔ میں۔۔۔ غلط تھی جب میں نے فارس غازی کو بلیم کیا تھا۔ (الزام لگایا تھا) دو ماہ قبل مجھے معلوم ہوا کہ فارس غازی بے گناہ تھا اس کیس میں۔ وہ کسی بھی جرم میں ملوث نہیں تھا۔"

وہ آہستہ سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔ بنا پلک جھپکے وہ گردن اٹھائے دم بخود اسے دیکھ رہا تھا۔ عدالت میں سکتہ چھا گیا تھا۔ جج کے چہرے پر حیرانی تھی اب وہ میز کے پیچھے سے نکل کر جج کے چبوترے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ایسی جگہ جہاں کھڑکی سے چھن کر گرتی سورج کی روشنی بہت تیز پڑ رہی تھی۔

"میں نے دو ماہ قبل یہ جانا کہ وہ صحیح تھا اور میں غلط تھی' اسی لیے آج میں یہ اعتراف اس جگہ کھڑے ہو کر

کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ لکھا جائے۔" ایک نظر سامنے بیٹھے کورٹ رپورٹر پہ ڈالی جو کھٹا کھٹ ٹائپ کیے جارہا تھا۔ "اور یہ اس کیس کی فائلز میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا جائے کیونکہ ایک دفعہ مجھ سے فارس غازی نے پوچھا تھا کہ اگر میں نے یہ جان لیا کہ وہ بے گناہ ہے تو میں کیا کروں گی؟"

گردن موڑ کر اس نے اسی اٹھی گردن کے ساتھ فارس کو دیکھا۔

"تو میرا جواب یہ ہے کہ میں یہی کروں گی! میں اس کے ساتھ کھڑی ہوں گی اور اس کو انصاف دلاؤں گی۔"

وہ روشنی میں کھڑی تھی' تیز روشنی میں اور اس کے بھورے بال چمک کر اخروٹی لگ رہے تھے اور جب اس نے چہرہ موڑ کر فارس کو دیکھا تو بھوری آنکھیں سنہری نظر آئی تھیں۔ وہ بالکل خاموش سا اسے دیکھے گیا۔ گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری تھی۔

پراسیکیوٹر سے مزید برداشت نہیں ہوا تو اٹھا۔ "مسز زمر! آپ سب کچھ ابھی کہہ دیں گی تو اوپننگ آرگومنٹ میں کیا کہیں گی؟ جج صاحب! مسز زمر کی بات بجی ہے مگر عدالت کو یہ امر مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ وہ فارس غازی کی بیوی ہیں اور ہر محبت کرنے والی بیوی کی طرح۔۔۔"

"مجھے اپنے شوہر سے کوئی محبت نہیں ہے۔" وہ مڑے بغیر جج صاحب کو دیکھتے ہوئے اسی اٹھی گردن کے ساتھ اسی روشنی کے ہالے میں کھڑی بولی تھی۔

"نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ ان فیکٹ میں اپنے شوہر کو پسند بھی نہیں کرتی اور بہت دفعہ میں اپنے شوہر کو جان سے مار دینا چاہتی تھی۔" (وہ ہلکا سا مسکرایا۔) ان فیکٹ گرفتار ہونے سے ایک دن پہلے وہ مجھے طلاق دینے کی بات کررہا تھا۔"

فارس نے قدرے بے چینی پہلو بدلا۔

"مگر یہ فیملی کورٹ نہیں ہے جہاں ہم کھڑے ہوکر ذاتیات کے بارے میں بات کریں اور ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ اچھالیں' نہ میں ایسی عورت ہوں مگر یہ سب کہنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ٹرائل کے دوران میری کہی کسی بات کو۔ "شوہر کے دفاع" کے زمرے میں لینے کے بجائے موکل کا دفاع سمجھا جائے۔ تھینک یو یور آنر۔"

سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ وہ تیز روشنی میں کھڑی تھی' چمکتی ہوئی' جیسے سونے کے پتنگے آس پاس گر رہے ہوں۔ نہ کوئی ٹوٹا بکھرا وجود تھا' نہ آنکھوں میں آنسو نہ ندامت سے جھکا سر۔۔۔ نہ معافی کے لیے ہاتھ بندھے تھے مگر اعتراف جرم بھی کرلیا تھا' اعتراف ندامت بھی ہوگیا تھا۔ سر بھی اٹھا رہا تھا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ فارس غازی نے سوچا تھا۔۔۔' وہاں نیت صاف تھی۔ جو بھی کیا تھا' سچ کا ساتھ دینے کے لیے کیا تھا۔ پہلے بھی۔۔۔ اب بھی۔۔۔"

"اب پراسیکیوٹر صاحب بڑے آرام سے دلائل کا آغاز کرسکتے ہیں' جن کے بعد ایسے لگے گا جیسے میرا کلائنٹ قمرالدین چوہدری کے ساتھ ساتھ نائن الیون حملے میں بھی ملوث تھا۔"

وہ سادگی سے کہہ کر واپس آکر بیٹھی' کمر کرسی کی پشت سے لگائی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی' گردن موڑ کر فارس کو دیکھا۔ اس کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ ان چند لمحوں میں بہت سی کیفیات سے ایک دم گزر گیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے اعتراف سے تمہیں خوش نہیں کرسکی' نہ میں روئی' نہ پیروں میں گری' نہ ہاتھ جوڑے۔" وہ دھیرے سے بولی۔ وہ بس اسے دیکھے گیا۔ وہ اس وقت کیا محسوس کررہا تھا۔ وہ بیان نہیں کرسکتا تھا۔ پھر وہ سامنے دیکھنے لگا۔ پراسیکیوٹر دلائل کا آغاز کرچکا تھا۔ فارس کی آنکھیں اُدھر جمی تھیں مگر گردن کی گلٹی بار بار ظاہر ہوکر معدوم ہوتی تھی۔

"آپ کو کب معلوم ہوا؟" وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسے واقعی اندازہ نہیں تھا۔

"جس رات مجھے استھما اٹیک ہوا تھا۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

فارس نے نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا۔ سنہری

آنکھیں بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہیں چند لمحے' چند سانسیں' جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر... بولا تو صرف اتنا۔

"کیا میں آپ کو "تم" کہہ کر بلا سکتا ہوں؟"

زمر لمحے بھر کو لاجواب ہوئی۔ پھر خفگی سے گردن اکڑائی۔ "ہرگز نہیں۔"

وہ ہلکا سا مسکرا کر اس کی طرف جھکا اور تابعداری سے سر کو خم دیا۔ "ٹھیک ہے' جیسے تم چاہو۔"

اب اگر وہ ڈسٹرکٹ کورٹ کا کمرہ نہ ہوتا اور ان کے پیچھے وکلا نہ بیٹھے ہوتے تو زمر یوسف کی ہیل فارس غازی کے پیر کو بتاتی کہ اس کے چاہنے کا کیا مطلب ہوتا ہے مگر... وہ خفگی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھنے لگی۔



ان کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

کولمبو کی بھیگی فضاؤں میں اس رات بارش نے مزید نمی گھول دی تھی۔ کرنل خاور مظاہر حیات نے جب ہوٹل کی لابی میں قدم رکھا تو اس کا کوٹ نم تھا اور بال قدرے بھیگے ہوئے تھے۔ اپنے تنومند جسم پہ کوٹ کے کالر برابر کرتا وہ ریسپشن تک آیا اور شناسا سا انداز میں ری سیپشنسٹ سے پوچھا۔

"ہاشم کاردار کون سے روم میں ہیں؟" جب وہ لڑکی اسے مطلوبہ معلومات فراہم کر رہی تھی تو اس کی پشت دیوار پہ آویزاں باکسز کی چمکتی دھات میں خاور کا عکس جھلک رہا تھا۔ قدرے بھاری مگر فٹ جسامت کا حامل' اونچا لمبا سا آدمی' جس کے بال کریو کٹ میں کٹے تھے' ایرانی طرز کی سیاہ مونچھیں تھیں اور گھنے ابرو تلے سیاہ گہری آنکھیں۔ پیشانی پہ مستقل پڑے دو بل اور گندمی رنگت۔ دیکھنے میں وہ پینتالیس سے اڑتالیس سال کا لگتا تھا اور کم و بیش یہی اس کی عمر تھی۔

چند گھنٹے قبل ہاشم نے اسے کال کر کے جلد از جلد کولمبو پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ کراچی میں جن کاموں میں پھنسا تھا' ان سب کو چھوڑ کر فوراً" ادھر آ پہنچا تھا اور اب لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ یقیناً" اس امر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ہاشم نے اس سے ڈسکس کرنا تھا۔ ہاشم نے کہا تھا' بات اہم تھی۔ خاور متجسس تھا اور پرجوش بھی' جو بھی مسئلہ ہو وہ اسے حل کر لے گا۔ ہاشم کے لیے وہ سب سنبھال لے گا' کیونکہ صرف وہی تھا جو ہاشم کے تمام مسئلے سنبھالتا آیا تھا۔

کمروں کے بند دروازوں سے سجی راہ داری میں وہ مطلوبہ دروازے تک رکا' بیل بجائی۔ پھر دیکھا' دروازہ قدرے کھلا تھا۔ اس کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ احتیاط سے دروازہ دھکیلا' ایک ہاتھ بیلٹ میں اڑسے پستول پہ رینگ گیا۔

پٹ کھلتا گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ صرف ایک زرد لیمپ جل رہا تھا۔ خاور نے ادھر گردن گھمائی۔ ایک طرف دیوار گیر کھڑکی تھی جس کے شیشے پہ پانی کی بوندیں تڑاتڑ برس رہی تھیں اس کے سامنے کرسی ڈالے ہاشم بیٹھا تھا۔ خاور نے اطمینان کی سانس خارج کی' جیب تک رینگتا ہاتھ سیدھا ہو گیا۔ وہ "سر" کہتا قریب آیا۔ ہاشم کی اس طرف پشت تھی۔ آہٹ پہ بغیر چونکے سر موڑا' اسے دیکھا' ہلکا سا مسکرایا اور اٹھا۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے خاور نے گرمجوشی سے تھاما۔

"سب ٹھیک ہے سر؟" خاور کو وہ دیکھنے میں بالکل نارمل لگا تھا۔ (اہم مسئلہ؟)

"لیس... آف کورس!" ہاشم نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ ہاتھ ملا کر چھوڑا۔

"میرا دل چاہ رہا تھا میں کسی سے بات کروں' سو تمہیں بلا لیا۔" کہتے ہوئے وہ ساتھ رکھی میز تک آیا۔ سیاہ پینٹ پہ سلور گرے شرٹ پہنے اور کف کہنیوں تک موڑے وہ مطمئن لگ رہا تھا۔ دو گلاسوں میں اس نے مشروب انڈیلا' ایک خاور کو تھمایا' دوسرا خود تھامے سامنے آ کھڑا ہوا' گلاس بلند کیا۔

"کس کے نام؟" خاور نے اپنا گلاس بلند کرتے پوچھا۔

"جولیس سیزر کے نام!" اس نے خاور کے گلاس سے گلاس ٹکرایا' پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا واپس

کرسی پہ آ بیٹھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر رخ کھڑکی کی طرف موڑے گھونٹ بھرا۔

خاور اس کے سامنے ذرا ترچھی کر کے کرسی پہ بیٹھا۔ قدرے آگے کو ہوا۔ گھونٹ بھرا۔ تابعدار آنکھیں ہاشم پہ جمی تھیں جو شیشے پہ برستی بوندیں دیکھ رہا تھا۔

"جولیس سیزر... رومن ڈکٹیٹر۔ آج کل میں اس کے بارے میں اکثر سوچتا ہوں۔" گھونٹ بھرتے ہوئے باہر دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ "چوالیس سال قبل از مسیح... پندرہ مارچ کے دن... سیزر کے اوپر اس کے اپنے سینیٹرز نے حملہ کیا تھا اور ان میں شامل تھا' مارکس جونیئر بروٹس' سیزر کا دوست اور Protege ۔کہتے ہیں پہلے سیزر جوانمردی سے لڑا مگر جب اس نے..." نگاہیں یک ٹک باہر جمائے گلاس لبوں سے لگا کر نیچے کیا۔ "جب اس نے بروٹس کو دیکھا تو اس نے دکھ سے کہا۔"

"Ettu Brute Then Fall Caeser"

(تم بھی بروٹس؟ تو پھر ڈھے جاؤ سیزر۔) اور یہ کہہ کر وہ ڈھے گیا۔ ایک اور چھوٹا سا گھونٹ بھرنے کو وہ رکا۔ "Et tu Brute ... لاطینی زبان کا وہ ننھا سا فقرہ جو انگریزی میں You too Brutus کہلاتا ہے' اس کو شہرت شیکسپیئر کے قلم سے ملی... ورنہ خاور... اگر شیکسپیئر یہ فقرہ اپنے پلے (ڈرامے) میں جولیس سیزر کو بولتے نہ دکھاتا تو کون جان پاتا اس فقرے کو مگر جانتے ہو لوگ اس کا مطلب ٹھیک سے نہیں سمجھتے۔ قیاس کرتے ہیں کہ یو ٹو بروٹس کا مطلب ہے کہ سیزر دکھ سے "یعنی کہ تم بھی بے وفا نکلے بروٹس؟" کہہ رہا تھا مگر یہ ایک نامکمل مطلب ہے۔"

خاور نے درمیان میں کئی دفعہ لب کھولے اور پھر ادب سے بند کر لیے۔ وہ اس بے کار کہانی کو تحمل سے آخر تک سن سکتا تھا مگر جانے اس نیم روشن شاہانہ بیڈ روم کی نرم گرم فضا میں ایسا کیا تھا جو ٹھیک نہیں تھا۔

وہ اندر سے الجھتا خاموشی سے گھونٹ بھرتا رہا اور اسے سنتا رہا' وہ کہہ رہا تھا۔

" Suetonius کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں سیزر کے آخری الفاظ تھے۔ "کائے سے تمکفون؟" یعنی تم بھی بچے؟ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے کہا تھا' تم بھی میرے بچے؟" وہ ہلکا سا ہنسا۔ "تاریخ دان یہ بھی کہتے ہیں کہ بروٹس' سیزر کا ناجائز بیٹا تھا۔ خیر..." کھڑکی کو دیکھتے شانے اچکائے۔ خاور اب دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "اس زمانے میں قدیم روم میں ایک محاورہ بولا جاتا تھا۔ "تم بھی میرے بچے' طاقت کا مزہ چکھو گے۔" شاید سیزر بھی یہی کہہ رہا تھا' جب اس نے کہا' تم بھی بروٹس... تم بھی تاج پہنو گے۔ یہ دکھ کا اظہار نہیں تھا۔ یہ ایک بددعا تھی۔" اب کے نگاہیں خاور کی طرف پھیریں۔ خاور بری طرح ٹھٹکا۔ یہ وہ آنکھیں نہیں تھیں جن کو وہ پہچانتا تھا۔ سیاہ' سرد' پتھر جیسی آنکھیں۔ "سر کیا ہوا ہے؟"

"یو ٹو... جب سیزر نے یہ کہا' تم بھی بروٹس' تو اس نے کہا' تمہاری بھی باری آئے گی بروٹس! اور یہ کہہ کر وہ ڈھے گیا اور بعد میں بروٹس بھی تو ایسے ہی مرا تھا۔ مگر پتا ہے کیا۔" اس نے خاور پہ نظریں جمائے گلاس دائیں طرف میز پہ رکھا۔ "یہ سب لوگوں کی باتیں ہیں' ورنہ تاریخ کہتی ہے کہ سیزر نے مرتے وقت کچھ نہیں کہا تھا۔"

خاور نے آہستہ سے گلاس اسی میز پہ رکھنا چاہا' مگر رکھ نہیں سکا۔ گلاس لڑھک گیا۔ بے اختیار اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھاما۔ اس کی رنگت بدل رہی تھی' چہرے پہ پسینہ نمودار ہو رہا تھا۔ "سر... سر کیا ہوا ہے؟" حیرت زدہ نگاہیں اٹھا کر تنگ ہوتے گلے کو پکڑے وہ بمشکل بول پایا۔

"مؤرخ کہتے ہیں' سیزر کو مرتے وقت ایک لفظ کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ خاموشی سے مرا تھا۔ بالکل خاموشی سے۔ ایسے بڑے بڑے الفاظ شیکسپیئر لکھتا تھا۔ یہ اسی کے الفاظ ہیں۔" اس نے خاور کو دیکھتے ہوئے ایک اور گھونٹ بھرا۔

"سر... میں نے... کچھ نہیں..." وہ چلانا چاہتا تھا مگر گلا پکڑے پکڑے گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گیا۔ منہ یوں کھولا جیسے قے کرنا چاہتا ہو مگر آج اندر سے کچھ نہیں نکلنا تھا۔ سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔ سامنے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھا اسے سرد نظروں سے دیکھتا ہاشم اسی دھند میں گم تھا اور دوب... کسی کنویں سے ٹکراتی آواز کی طرح اس کی آواز گونج رہی تھی۔

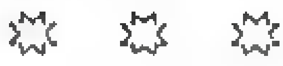
"میرا خیال ہے وہ واقعی خاموشی سے مرا تھا' کیونکہ بادشاہ خاموش ہی مرا کرتے ہیں مگر تم... تم تاج نہیں پہنو گے۔"

اس نے کرسی پہ ہاتھ جما کر اٹھنے کی کوشش کی مگر دھند... درد... اندھیروں میں ڈوبتا ذہن... وہ اٹھ نہیں پایا۔

"تم خاموش نہیں رہو گے... تم..." ہاشم بیٹھے بیٹھے آگے کو جھکا تھا۔ "تم مجھے سب بتاؤ گے... ایک ایک بات... کس کے لیے مارا تم نے میرے باپ کو... سب کچھ۔"

مگر الفاظ اب گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ خاور کا ذہن گہرے اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ مناظر کبھی نظر آتے' کبھی بادلوں میں چھپ جاتے۔ اس نے محسوس کیا' اس کو کسی چیز پہ لٹا کر راہ داری میں سے گزارا جا رہا ہے... راہ داریاں... چھت... دروازے... چھت بدل رہی تھی... پھر وہ تاریک ہو گئی... وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا' مضبوط قوت ارادی کے باعث اس کا ذہن ابھی تک مفلوج نہ ہو سکا تھا اور پھر چھت مزید تاریک ہوئی... یہاں تک کہ وہ زردی مائل بھوری سی لگنے لگی... دھندلے ہوتے منظر میں اس نے دیکھنا چاہا... اس کا اسٹریچر ایک تنگ کمرے میں دھکیلا جا رہا تھا اور سامنے دو ہیولے سے کھڑے تھے... وہ قریب آتے گئے... قدم... قدم... پھر ایک کا چہرہ واضح ہوا... اس کے بال گہرے بھورے اور ہلکے گھنگھریالے تھے اور آنکھیں بھوری تھیں۔ اس کا مسکراتا چہرہ قریب آیا اور اس کے الفاظ وہ آخری الفاظ تھے جو خاور کو سنائی دیے تھے۔

"خوش آمدید... یاصاحبی السجن!"



ڈیڑھ ماہ بعد

کبھی غرور کا نشہ نہ سر پہ طاری کر
مری بلا سے فقیری کر یا تاجداری کر

سرما کی ٹھنڈ دسمبر کے تیسرے عشرے میں بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ایک نیلی سی صبح تھی۔ دھند نے سارے قصر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سورج منہ پھیرے ناراض سا' بادلوں کے پیچھے گم تھا۔ ایسے میں فینونا قصر کے برآمدے کے زینے چڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسکرٹ پہ سوئیٹر پہنے' بال پونی میں باندھے' وہ قدرے سنجیدہ اور ناخوش دکھائی دیتی تھی۔ برآمدے میں آ کر اس نے اندر کھلتا بھاری منقش لکڑی کا دروازہ دھکیلا تو جیسے ہی ہیٹرز کی گرم ٹکور دیتی ہوا وجود سے ٹکرائی' ویسے ہی قصر کا اندرونی منظر بھی کھلتا چلا گیا۔

اندر تمام بتیاں روشن تھیں۔ لاؤنج میں ملازم کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے ڈائننگ ہال کے شیشے کے دروازے کھلے تھے اور سربراہی کرسی پہ براجمان ملکہ نک سک سے تیار بیٹھی تھی۔ کھلے بال کندھے پہ بائیں جانب کو ڈالے' سیاہ ٹاپ پہنے' جس پہ گرا سلور لاکٹ چمک رہا تھا' وہ مسکرا کر گردن اٹھائے مسلسل ایئررنگ پہ انگلی پھیرتی ساتھ کھڑے احمر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ جیکٹ میں ملبوس' ماتھے پہ کٹے بال گیلے کر کے پیچھے کو بنائے' سادہ سا مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"گو کہ آکشن گیارہ بجے شروع ہو گی مگر آپ وہاں پہ گیارہ بج کر چودہ منٹ پہ پہنچیں گی' یہ پرائس بولیں گی۔" ایک چٹ نکال کر سامنے رکھی۔ "مسکرا کر حاضرین کو دیکھیں گی' سب امیزڈ ہوں گے' لاجواب ہوں گے' پھر آپ کے بیٹھنے سے پہلے پینٹنگ آپ کی ہو گی اور آپ اسی شان بے نیازی سے اس کو بچوں کی فلاح کے لیے بننے والے ادارے کو عطیہ کر دیں گی۔ کیمروں کے شٹرز بج رہے ہوں گے' آپ نیوز میں ہوں

گی مگر آپ انٹرویو دینے سے انکار کردیں گی' کیونکہ آپ اپنے نیک کام کی تشہیر نہیں چاہتیں۔ پی ایس! آپ کو مزید تشہیر کی ضرورت اس ہفتے پڑے گی بھی نہیں۔" اور مسکرا کر سر کو خم دیا۔ فینونا نے دور سے یہ منظر دیکھا' ناک سکیڑی اور کچن کی طرف چلی گئی۔

"اور یقیناً" تم نے انتظامیہ سے پہلے ہی بات کرلی ہوگی۔" چٹ کو دو انگلیوں میں اٹھا کر جواہرات نے دیکھا۔ "وہ میرے علاوہ کسی کو پینٹنگ نہیں بیچیں گے' رائٹ۔۔۔"

"نہ صرف یہ بلکہ وہ چودہ منٹ تک کسی کو اس رقم تک نہیں آنے دیں گے۔ سب مینٹل کیا جاچکا ہے۔" وہ ذرا رکا۔ "مسز کاردار' آپ سیاست میں نہیں آرہیں' آپ پہلے ہی ایک Philanthropist کے طور پہ جانی جاتی ہیں پھر میں پچھلے چند ہفتوں سے آپ کے لیے پبلسٹی Stunts (شہرت کے مواقع) کیوں ارینج کررہا ہوں؟"

جواہرات نے نزاکت سے کندھے اچکائے اور نیپکن گھٹنوں پہ پھیلایا۔ "میں پاپولر ہونا چاہتی ہوں۔ مقبول لوگ' کسی بھی عہدے یا آفس کے بغیر بھی ایک دنیا پہ حکومت کرتے ہیں۔ وہ ذہنوں پہ حکمرانی کرتے ہیں اور ان کی رائے سنی جاتی ہے' مانی جاتی ہے۔" مسکرا کر اسے دیکھتے گلاس لبوں سے لگایا۔

"بھاری اعزازات کی بھاری قیمتیں چکانی پڑتی ہیں مسز کاردار! مگر خیر۔۔۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' کیونکہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"اور مجھے اسی بات کی فکر ہے کہ تم ان کے ساتھ ہو۔" آواز پہ احمر چونک کر پلٹا۔ سامنے سے ہاشم چلا آرہا تھا۔ کوٹ' ٹائی' کف لنکس' سب نفاست سے خود پہ سجائے' تناؤ کے تاثرات کے ساتھ ایک کاٹ دار نظر اس پہ ڈالتا وہ اپنی کرسی تک آیا۔ ملازم نے جلدی سے کرسی کھینچی۔ وہ بیٹھا اور اسی سنجیدگی سے نیپکن پھیلانے لگا۔

"گڈ مارننگ مسٹر کاردار!" احمر سر کو خم دیے کر کہتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا جواب نہیں آنا۔

"یہ بہت ٹیلنٹڈ ہے ہاشم!" جواہرات نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ ہاشم نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا۔ نوشیرواں بھی تھوڑی دیر بعد تیار ہوکر نیچے آگیا۔ اس کے بال پہلے بھی چھوٹے کٹے تھے' فرنچ کٹ صاف تھی اور آج کل وہ روز اسی خاموشی سے آفس جاتا اور واپس آکر کمرے میں گم ہوجاتا تھا۔

ناشتا کرتے ہوئے ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو کھڑکی کے باہر احمر کھڑا کسی ملازم کو کوئی ہدایت دیتا نظر آرہا تھا۔ ہاشم نے ہولے سے سر جھٹکا۔

"ممی! مجھے اس پہ ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔"

جواہرات نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا' پھر ہاشم کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تمہیں جس پہ اعتبار تھا' اس کا نام خاور تھا' وہ خاور جس پہ تمہارے باپ نے کبھی بھروسا نہیں کیا تھا' احمر' جس پہ تمہارے باپ نے اعتبار کیا تھا' اب تم فیصلہ کرلو کہ کون صحیح تھا' کون غلط۔"

ہاشم کے لب بھنچ گئے اور وہ مزید خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ جواہرات نے جھرجھری لیتے جوس کا ایک اور گھونٹ بھرا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خاور' اورنگ زیب کے ساتھ یہ سب۔۔۔"

"خاور نے ڈیڈ کو قتل نہیں کیا۔" نوشیرواں ایک دم کانٹا پٹخ کر بولا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پل بھر کو جواہرات کا دل بیٹھا مگر وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے باپ کو کسی نے قتل نہیں کیا' انہیں کوئی قتل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ نیچرل ڈیتھ سے فوت ہوئے تھے' سنا آپ لوگوں نے؟" اور نیپکن پٹخ کر کھڑا ہوگیا۔ ہاشم نے گردن اٹھا کر تاسف سے اسے دیکھا۔

"تم ابھی تک denial (نفی کی کیفیت) میں ہو شیرو!"

"آئندہ کوئی بھی ان کے قتل کی بات نہیں کرے

گا' سنا آپ نے یا نہیں؟" بگڑ کر کہتا وہ کرسی دھکیلتا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ ناشتا ادھورا رہ گیا تھا۔ ادھوری چائے' ادھورے ناشتے...



مزاج غم نے بہرطور مشغلے ڈھونڈے
کہ دل دکھا تو کوئی کام وام میں نے کیا

دھند لکے کے پار انیکسی کھڑی تھی۔ چھوٹی' کم مایہ مگر مضبوط۔ اندر چھوٹے سے کچن میں دم کی چائے اور الائچی کی خوشبو پھیلی تھی۔ سیم گول میز پہ بیٹھا برے برے منہ بنا تا ناشتا زہر مار کر رہا تھا۔ فرائی انڈے کی زردی ٹوٹ چکی تھی اور وہ کھاتے ہوئے بار بار ایک ملامتی نظر حنین پہ ڈالتا جو جلدی جلدی توے پہ توس سینک رہی تھی۔ زمر سفید لباس میں تیار سی اپنی چائے وم پہ رکھ رہی تھی۔ حنہ کپ کھنگالتے رکی تو توس جل گیا۔ سیم چلایا تو وہ اس طرف بھاگی۔

"حنین! ڈونٹ وری' واپس آکر ہم سب مل کر کچن صاف کرلیں گے۔" زمر نے چولہا بند کرتے اسے تسلی دی۔ توس سیم کی پلیٹ میں رکھتے حنین نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ کچن صاف نہیں ہے؟" اس کے دل کو جیسے دھکا لگا تھا۔ زمر نے گڑبڑا کر سیم کو دیکھا' پھر کچن کو (ہر چیز' چاہے وہ صاف دھلے برتن تھے یا پتی چینی کے ڈبے' وہ کاؤنٹر پہ رکھے تھے۔ پھیلاوا ہی پھیلاوا۔)

"میرا مطلب ہے' ابھی تو تم نے کرلیا بعد میں... ہم مل کر کرلیں گے۔" سیم کو پھر دیکھا تو اس نے بنا آواز کے "توبہ توبہ" کہتے دونوں کانوں کو انگلی سے باری باری چھوا۔

مگر حنین سخت بے دلی سے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ زمر کا بھی فون آگیا۔ وہ سیم کو لیے چلی گئی تو حنہ نے گھر کے سارے دروازے لاک کردیے۔ اب وہ اکیلی تھی اور وہ جانتی تھی کہ گھر کا یہ تخت و تاج اگلے دو ہفتے تک اسے اکیلے ہی سنبھالنا تھا۔

صداقت شادی کر رہا تھا۔

اس کی بلا سے وہ کسی سے بھی شادی کرے' جب بھی کرے' مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ ندرت اور بڑے ابا کے بغیر اس کی شادی مکمل نہیں ہوسکتی۔ زمر اور خود حنین کے بے حد اصرار پہ ندرت اور ابا ایک ہفتے کے لیے صداقت کے گاؤں چلے گئے تھے۔ ایک ہفتے کی شرط بھی زمر نے لگائی تھی۔ وہ چاہتی تھی' وہ دونوں اس ڈپریشن زدہ ماحول سے نکلیں' کچھ دن تازہ ہوا کھالیں' سو صداقت کے لیے قیمتی تحفے لے کر وہ لوگ کل روانہ ہوگئے تھے۔ ندرت نے کہہ دیا تھا کہ زمر مصروف ہوتی ہے اور حنین کو کھانا بنانا نہیں آتا سو کھانا ریسٹورنٹ سے آئے گا' کپڑے لانڈری ہے جائیں گے' حنہ کو صرف ناشتا اور صفائی کرنی ہوگی۔

مگر صفائی؟ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔ کل سے وہ چیزیں صاف کر کر کے ٹھکانے پر رکھ رکھ کر ہلکان ہوچکی تھی مگر پورا گھر بکھرا ہوا لگتا تھا۔ آج بھی وہ زمر کے نیچے آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے کچن میں آئی تھی' سارا کچن صاف کیا' مگر کتنے مزے سے وہ کہہ گئی کہ صفائی نہیں لگ رہی تھی۔ بھئی مطلب تو یہی تھا نا۔

ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھرتے' اکیلے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پہلے ہی دن رات ہاشم کا خیال' اس کی آواز' یہ سب ذہن سے نکلتا نہیں تھا' غض بصر کر کر کے تھک گئی وہ مگر وہ تو ویسے ہی یاد آتا تھا' ذرا بھی نہیں بھولا تھا۔ اس نے سوچا تھا' غض بصر میں کامیاب ہو کر وہ شیخ کے اگلے طریقے تک جائے گی مگر کامیابی تو دور لگ رہی تھی' سو بالآخر وہ کتاب اٹھا لائی اور لاؤنج میں صوفے پہ لیٹے اس نے مطلوبہ فصل کھول لی۔

دروازے کے پار کھلا دریا تھا۔ تیز سورج کی سنہری کرنیں پانی پہ جھلملا رہی تھیں۔ ایسے میں وسط دریا کو چیرتی ایک لکڑی کی قدیم کشتی چلتی جارہی تھی۔ بوڑھے شیخ کسی ماہر ملاح کی طرح چپوؤں کو پانی میں چلاتے کشتی کو آگے دھکیل رہے تھے۔ ان کے سامنے

وہ بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح کمزور اور بددل۔ کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے اور ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے' وہ ناراضی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"غص بصر کر کر کے مر گئی میں۔ پہلے اس کو دیکھنا چھوڑا' پھر اس کی ای میلز' اس کے ٹیکسٹ' سب مٹا دیے کہ ان کو دیکھنا بھی غص بصر کے خلاف تھا مگر وہ نہیں بھولا۔ میں تو اسے دیکھ بھی نہیں رہی' پھر وہ مجھے کیوں نہیں بھولتا شیخ؟"

شیخ نے آہستگی سے گیلے چپو نکال کر کشتی کے اندر رکھے۔ ہوا ہولے ہولے خود ہی سنہرے پانی پہ کشتی کو آگے بڑھانے لگی۔

"لڑکی! تمہارے زمانے میں سب سے مہلک بیماری کون سی ہے؟"

"ڈینگی!" فوراً" بولی' پھر گڑبڑائی۔ "سوری... کینسر... سرطان۔"

"تو اگر سرطان کا مریض اپنی بیماری بھول جائے تو کیا تندرست ہو جائے گا؟"

"لیں... بیماری بھولنے سے کون شفایاب ہو سکتا ہے؟"

"تو میری بٹی! مریض کیسے ٹھیک ہو گا؟ جسم سے اس سرطان (کینسر) کے نکلنے سے؟ یا یادداشت سے سرطان کا خیال نکلنے سے؟ اور جب وہ ٹھیک ہو جائے گا تو کیا وہ سرطان کو بھول جائے گا؟" وہ ایک عجیب انکشاف کا لمحہ تھا۔ حنہ نے دم بخود ان کو دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... اسے ساری عمر سرطان یاد رہے گا۔"

"لیکن اگر وہ تندرست ہو چکا ہے تو وہ یاد اسے تکلیف نہیں دے گی۔"

"تو کیا... تو کیا مجھے اپنے محبوب کو بھولنے کی ضرورت نہیں؟" وہ بے یقین تھی۔ بھولے بغیر موو آن کرنا... یہ کیسا علاج تھا؟

"وہ تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم بھولنے کی کوشش ترک کر دو۔ علاج تم نے اپنے دل کا کرنا ہے' یادداشت کا نہیں۔ اسے دل سے نکالنا ہے' دماغ سے نہیں۔ اس مقام تک آنا ہے' جہاں اس کی یاد پہ تم بے حس ہو جاؤ۔ تمہیں فرق پڑنا ختم ہو جائے' نہ نفرت ہو نہ محبت۔"

حنہ کا دل جیسے ایک دم خالی ہو گیا۔ ٹکر ٹکر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"مگر یہ کیسے ہو گا؟"

"اس کے لیے پہلے تمہیں "محبت" کو سمجھنا پڑے گا۔" انہوں نے چپو اٹھا لیے اور پھر سے پانی میں چلانے لگے۔ کشتی کی رفتار تیز ہوئی۔ سنہری کرنوں سے چمکتا پانی اب تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ گویا دریا کے دو دہانے قریب آ رہے تھے۔ دونوں اطراف میں اگا سبزہ بھی گھنا اور گنجان تھا۔

"اور اس کو سمجھنے کے لیے پہلے عشق اور محبت میں فرق کرنا سیکھو لڑکی۔" دریا مزید تنگ ہو کر کسی نہر میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ جیسے شام سے دور' امیزون کے جنگلات کے درمیان بہتی کوئی نہر تھی۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "پہلے پسندیدگی ہوتی ہے' پھر محبت' پھر عشق' پھر جنون' پھر دیوانگی!"

شیخ کے تاثرات دیکھ کر وہ یک دم چپ ہوئی۔ وہ افسوس سے مگر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہے تھے۔

"یہ درجے تمہارے ملک میں رائج ہوں گے مگر جس زبان سے تمہاری زبان نکلی ہے' اس میں معاملہ ذرا مختلف ہے۔ محبت درمیان میں نہیں ہے' بلکہ محبت کے یہ سب درجے ہیں۔ محبت خود کوئی درجہ نہیں ہے۔"

"تو کتنے درجے ہیں محبت کے؟"

"سات... سنو گی؟" وہ مسکرائے... کشتی اب اس سرسبز تنگ نہر کے درمیان داخل ہو چکی تھی۔ وہاں جا بجا کنول کے پھول پانی پہ تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سورج گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ٹھنڈی میٹھی سی چھایا ہر سو چھا گئی تھی۔

"محبت کا پہلا درجہ "علاقہ" ہے' کیونکہ اس میں

انسان کا اپنے محبوب سے ''تعلق'' قائم ہوتا ہے۔ علاقہ کے بعد ''الصبابہ'' ہے' اس میں انسان کا دل پوری گرویدگی کے ساتھ محبوب کی طرف جھک جاتا ہے' وہ اس کے سحر میں گھر جاتا ہے۔ تیسرا درجہ ''الغرام'' ہے۔ قرآن میں پڑھا ہوگا تم نے ''ان عذابہا کان غراما'' (بلاشبہ اس کا عذاب لازم ہونے والا ہے۔) سوالغرام میں محبت قلب کے اندر ہمیشہ کے لیے لازمی طور پہ جا بیٹھتی ہے اور اس سے نکل نہیں پاتی۔''

وہ ذرا دیر کو سانس لینے رکے۔

''پھر ''عشق'' ہے۔ محبت کی ایک انتہا اور ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانوگی؟''

''نہیں تو...''

تمہاری زبان جس زبان سے نکلی ہے' اس میں عشق کا لفظ مرد عورت کی ایسی محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ اس لفظ میں شرافت نہیں ہے۔ خود سوچو' کبھی کہہ سکتی ہو کہ اپنے ماں باپ سے عشق ہے تمہیں؟ عجیب لگتا ہے نا؟ اللہ کی محبت کے لیے' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لیے یہ لفظ قطعاً'' مناسب نہیں۔ ان کے شایان شان نہیں۔

عربی ادب کے ماہرین اور اہل زبان سے جاکر پوچھ لو اور نہیں تو قرآن پڑھنے والوں سے پوچھ لو' اللہ نے اپنے اور رسول کے لیے ''محبت'' کا لفظ استعمال کیا یا عشق کا؟''

''ابن قیم والا حوصلہ اور جگر میرے اندر نہیں ہے' اس لیے ہم آگے چلتے ہیں شیخ!'' اس نے موضوع کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ وہ سر جھٹک کر چپو چلانے لگے۔ کشتی تیزی سے پانی کو چیرتی تیرنے لگی۔

''عشق کے بعد ''شوق'' ہے۔ یہ دل کے اس سفر کا نام ہے جو پوری تیزی سے محبوب کی طرف شروع کیا جائے۔ پروردگار عالم کے متعلق اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ اس کے دوست اس کی

ملاقات کا شوق رکھتے ہیں' اس لیے اس نے ایک وقت مقرر کردیا ہے کہ جب وہ لوگ جو اپنے دکھوں اور مسئلوں میں صرف اسی سے مدد مانگا کرتے تھے' وہ اس وقت اس سے ملاقات کرلیں گے اور ان کے دل میں موجود جذبات محبت کو قرار ملے گا۔''

پانی پہ چمکتے کنول کے پھول خود بخود ایک طرف ہٹ کر کشتی کو راستہ دینے لگے۔

''اس کے بعد التہتم ہے۔ یعنی کہ انسان اپنے محبوب کی عبادت کرنے لگ جائے۔ محبوب کی عبادت کرنے والا اس کا ''عبد'' (غلام) بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری انا' ساری عزت نفس' سب اس محبوب کے قدموں میں ڈال دیتا ہے' کسی انسان سے ایسی محبت کی جائے' مجبوری میں نہیں' ظلم میں نہیں' بلکہ صرف محبت میں خود کو اس کے قدموں میں بے توقیر کردیا جائے تو یہ شرک ہے مگر اللہ سے ایسی محبت کرنا' خود کو اس کے سامنے جھکانا' اپنے چہرے کا ہر نقاب اتار کر' ہر انا پس پشت ڈال کر' اس سے اپنے دل کا حال بیان کرنا' اس کے آگے دعائیں گڑگڑانا' یہ ''عبادت'' ہے اور عبادت محبت کی معراج ہے۔ جو اللہ کی عبادت نہیں کرتا' وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔''

اب ان کے چپو چلاتے ہاتھوں میں روانی آگئی تھی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہورہی تھی۔ دریا نہر کی مانند درختوں کی تنگ گلی سے گزر کر آگے بڑھتا ہی جارہا تھا۔

''اس کے بعد... کمال محبت... محبت کا آخری درجہ... خلت ہے۔ یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں محبوب کے سوا نہ کسی کی گنجائش ہوتی ہے' نہ دل کسی شراکت کو برداشت کرتا ہے۔ اسی خلت سے خلیل ہے اور یہ منصب اللہ تعالیٰ نے صرف دو انسانوں کو عطا کیا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم... اس خلت کو حاصل کرنے کے لیے ان دو عظیم انبیاء نے بہت کچھ قربان کیا تھا۔ ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے مگر التہتم... یعنی ''عبادت'' تک تو پہنچ سکتے ہیں نا۔'' جیسے اسے تسلی دی۔

''اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تمہاری اپنے محبوب سے محبت کس درجے تک تھی؟''

''عشق تک!'' وہ بے اختیار بولی۔

''تو پھر سنو۔۔۔ مرض عشق کی مدافعت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ۔۔۔''

وہ ذرا دیر کو رکے۔

''کہ اپنے دل کو کسی اور طرف مصروف کرو تاکہ وہ عشق والے راستے سے رکے۔ یا تو کسی خوف کے ذریعے یا پھر۔۔۔'' وہ اداسی سے مسکرائے۔ ''یا پھر محبت کے ذریعے۔''

''محبت کے ذریعے؟''

''جیسے ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے' جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے' ویسے ہی عشق کو صرف عشق کاٹتا ہے' محبت کا علاج محبت سے کیا جاتا ہے۔ جب تک تمہارے دل کے سامنے کوئی بڑی محبت نہیں آئے گی' اس شخص کی محبت سے بڑی محبت' تب تک وہ شفایاب نہیں ہوگا۔''

''مطلب مجھے کسی اور سے محبت کرنا ہوگی؟''

''نہیں۔۔۔ محبت جبراً کوئی کسی سے نہیں کرسکتا۔ یہ تو قسمت سے ملتی ہے۔ ہوگئی تو ہوگئی' نہ ہوئی تو نہ ہوئی' مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے دل کو مصروف کرنا ہوگا۔''

''اور دل کو مصروف کرنے کے لیے مجھے اپنی آنکھ کو مصروف کرنا ہوگا؟''

''بالکل۔۔۔ لیکن اس کے لیے دو چیزیں ہونی چاہئیں انسان میں۔ اول اس میں اتنی عقل ہو کہ ادنیٰ اور اعلا محبت میں تمیز کرسکے' اعلا کو ادنیٰ پہ فوقیت دے سکے اور دوم اس میں اتنا صبر' ہمت اور استقامت ہو کہ فیصلہ کرلیا ہے تو اس پہ ڈٹ جائے۔ بعض لوگ اپنا فائدہ' نقصان خوب سمجھتے ہیں مگر ان میں غلط کو ترک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ نہ خود کو نفع دیتے ہیں نہ دوسروں کو مگر جن لوگوں میں اتنا صبر اور عزم ہوتا ہے' ان ہی کو اللہ اپنے دین کی امامت سونپتا ہے۔ اگر تم نے ان میں سے بننا ہے تو نگاہ کو کسی اچھی طرف لگاؤ۔''

''اوکے۔۔۔ میں۔۔۔ میں کوئی مشغلہ ڈھونڈوں' رائٹ؟''

کنول کے پھولوں کی جوت بجھتی گئی۔ پانی کی روشنی مفقود ہوتی گئی۔ کشتی مدھم ہو کر کہیں ڈوب سی گئی اور اس نے خود کو لاؤنج میں بیٹھے پایا۔

کتاب بند کرکے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''صرف نگاہ جھکانا کافی نہیں' نگاہ کو مصروف رکھنا بھی ضروری ہے۔'' ایک عزم کے ساتھ وہ نیچے تہہ خانے میں گئی۔ اپنے سامان سے چند اچھی کتابیں نکالیں۔ پھر پینٹنگ کے سامان کی لسٹ بنائی جو وہ آج ہی خریدلے گی۔ لینڈ اسکیپ اور خوب صورت گھر پینٹ کرنے کا کتنا شوق تھا اسے۔ بس وہ آج سے یہ ساری اچھی کتابیں پڑھے گی اور اچھی اچھی پینٹنگز بنائے گی' یوں وہ مصروف ہوجائے گی اور اس کا دل ہاشم کے اثر سے نکل جائے گا' اس نے تہیہ کرلیا تھا۔

★ ★ ★

اس ایک ہجر نے ملوا دیا وصال سے بھی
کہ تو گیا تو محبت کو عام میں نے کیا

آج کمرہ عدالت میں ٹھنڈ تھی۔ سورج ہنوز ناراض تھا۔ ہیٹر بھی جل رہا تھا۔ مگر ایسے میں سب گویا موسم سے بے نیاز' دھیان اور توجہ سے کٹہرے میں کھڑے شخص کو دیکھ رہے تھے' جو چالیس' پینتالیس برس کا مرد تھا اور سامنے کھڑے پراسیکیوٹر کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔

''مقتول قمرالدین سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟''

''میں ان کا بہنوئی ہوں۔'' بولتے ہوئے لبوں پہ ہاتھ پھیرا تو جج نے ٹوکا۔ ''ذرا صاف اور بلند آواز میں جواب دیں۔''

''میں ان کا بہنوئی ہوں۔'' وہ کھنکھار کر پھر سے بولا۔ اپنی کرسیوں پہ زمر اور فارس اسی طرح بیٹھے تھے۔ زمر کاغذ پہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ لکھتی' پھر نگاہ اٹھا کر سنجیدگی سے P.W.I (پراسیکیوشن کا گواہ نمبر ایک) کو دیکھنے لگتی۔ فارس ٹیک لگائے' کان کی لو مسلتے' چبھتی ہوئی نظروں سے کبھی گواہ کو دیکھتا اور کبھی ایک کٹیلی نظر قریب بیٹھے' ناظم پہ ڈالتا۔ (ناظم وہ شخص تھا

جس نے فارس کا شریک جرم ہونے کا دعوا کیا تھا)
"29 اگست کی دوپہر کیا ہوا تھا؟"
"جی کوئی لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ میں اپنی بہن کے گھر کام سے آیا تھا۔ ابھی اندر داخل نہیں ہوا تھا' وہیں گیٹ پہ کھڑا فون سن رہا تھا کہ ایک گاڑی' جس کی نمبر پلیٹ اتری ہوئی تھی' قریب آئی۔ دو افراد سامنے والی سیٹوں پہ بیٹھے تھے۔ وہ کار سے اترے' پچھلے سیٹ سے قمرالدین کی لاش نکال کر وہاں پھینکی اور اسی تیزی سے کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔"
"پھر آپ نے کیا کیا؟" پراسیکیوٹر نے نرمی سے سوال کیا۔
"میں جی فوراً" آگے آیا' لاش کو سیدھا کیا' وہ قمرالدین ہی تھا مگر کافی خون آلود تھا۔ میں اسے فوراً" ہسپتال لے گیا' ڈاکٹر نے کہا کہ موت واقع ہوئے چند گھنٹے گزر چکے ہیں' مگر ڈاکٹر نے میت ہمارے حوالے نہیں کی۔"
"ہمارے؟"
"یعنی کہ جی میں اور میرا بھائی' اس کو بھی میں نے فون کر کے بلا لیا تھا۔ ڈاکٹر نے شام کو میت حوالے کی' ہم اسے گھر لے آئے۔ پھر صبح ہم نے پولیس کو اطلاع دی۔"
"جو دو افراد کار پہ لاش پھینکنے آئے تھے' آپ ان کو پہچان لیں گے؟"
"جی ہاں جی۔ یہ دونوں۔" پہلے فارس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ڈرائیونگ سیٹ پہ تھا' اور یہ (ناظم کی طرف انگلی اٹھائی) یہ فرنٹ سیٹ پہ تھا۔"
"کیا انہوں نے چہروں پہ کوئی نقاب پہن رکھے تھے؟"

"نہیں جی' منہ کھلا تھا۔ بالکل صاف اور واضح۔"
پراسیکیوٹر نے سر کو خم دیا' اور پھر واپس اپنی کرسی کی طرف آتے ہوئے زمر کو دیکھ کر "Your witness" (آپ کا گواہ) کہتے ہوئے جرح کی دعوت دی۔ زمر اپنی جگہ سے اٹھی اور قدم قدم چلتی کٹہرے کے قریب آئی جہاں "وہ بہنوئی" کھڑا تھا۔ یہاں سے فارس کو اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ آدھے بندھے گھنگھریالے بال پشت پہ اور ناک میں دمکتی سونے کی نتھ۔ (اسے بے اختیار سیاہ ڈبی میں مقید وہ لونگ یاد آئی جو اب بھی ان کے کمرے کے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی تھی۔ زمر نے اس رات کے بعد اسے چھوا تک نہ تھا۔) چہرے پہ بے پناہ سنجیدگی لیے اس نے "بہنوئی" محمد اقبال کو دیکھا۔
"اقبال صاحب! سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟"
"جی؟" اقبال نے الجھ کر اسے دیکھا۔ پراسیکیوٹر قدرے بےزار سا کھڑا ہوا۔
"آب جیکشن یور آنر۔ کاؤنسلر غیر متعلقہ سوال پوچھ رہی ہیں۔"
"اوور رولڈ' لیکن آپ اپنے سوال کا مدعے سے تعلق جلد واضح کریں۔" جج صاحب نے عینک کے پیچھے سے زمر کو دیکھتے تنبیہہ کی۔ اس نے تحمل سے سر کو خم دیا اور سوال دہرایا۔
"سیٹلائٹ فون کی قیمت کتنی ہوتی ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم۔"
"کیا اس لیے کہ آپ نے کبھی سیٹلائٹ فون استعمال نہیں کیا؟"
"جی بالکل میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔"
"اقبال صاحب! آپ نے اپنے بیان میں کہا کہ جب یہ دونوں اشخاص کار میں آئے تو آپ گیٹ پہ کھڑے تھے۔ آپ وہاں کیا کر رہے تھے؟" زمر نے اسی سنجیدگی سے پوچھا۔
"میں فون پہ بات کر رہا تھا' اپنے بھائی سے۔ آپ میرے فون کا بل چیک کر سکتی ہیں۔" وہ گردن اکڑا کر بولا۔ زمر نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
"آپ کے بل میں بارہ بج کر بیس منٹ پہ اپنے بھائی کو تین منٹ کی کال کرنے کا ریکارڈ موجود ہے بالکل درست۔" وہ ذرا رکی۔ "لیکن ...." اس نے پراجیکٹر اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں قمرالدین کے گھر کی تصاویر پراسیکیوٹر نے ڈسپلے کر رکھی تھیں۔

وہ سڑک جہاں لاش پھینکی گئی۔ وہ گیٹ جہاں بہنوئی کھڑا تھا۔

"لیکن قمرالدین کے گھر کے سامنے ایک لڑکیوں کا اسکول ہے 'کیا آپ نے یہ دیکھ رکھا ہے؟"

پراسیکیوٹر ابرو بھینچ کر آگے ہو کر بیٹھا اور توجہ سے سننے لگا۔ فارس کا بھی کان کی لو کو مسلتا ہاتھ رک گیا' آنکھیں سکڑیں۔

"جی' دیکھ رکھا ہے۔" بہنوئی نے جواب دیا۔ زمر واپس میز تک آئی اور چند کاغذات اٹھائے۔

"یہ اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے ایفی ڈیوٹ ہے 'اور اس کالونی کے چند معزز لوگوں کی طرف سے حلف نامے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ....."

زمر نے باری باری چند کاغذات جج صاحب کی ڈیسک پہ 'اور پھر پراسیکیوٹر کی میز پر رکھے۔

"کہ ہر روز صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک اسکول میں جیمر لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ لڑکیاں جو چھپ کر موبائل لاتی ہیں' وہ ان کو نہ استعمال کر سکیں۔ اور محلے والوں کے مطابق ان جیمرز کا دائرہ اتنا ہے کہ قریبی گھروں کے وہ حصے جو اسکول کے سامنے پڑتے ہیں' وہاں ان اوقات میں موبائل سگنلز نہیں آتے جن کی وجہ سے وہ کافی دفعہ اسکول والوں سے شکایت بھی کر چکے ہیں۔ سو اقبال صاحب! میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس گیٹ پہ جہاں میں خود بارہ بج کر بیس منٹ پہ جا کر موبائل سے کال کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہوں' وہاں آپ موبائل پہ اتنی لمبی گفتگو کیسے کر سکتے ہیں؟ اِلاّ یہ کہ آپ کے پاس سیٹلائٹ فون تھا؟"

"آبجیکشن یور آنر!" پراسیکیوٹر جلدی سے کھڑا ہوا۔

زمر نے مڑ کر اسے دیکھا "کس وجہ کی بنا پہ؟"

"کاؤنسلر غیر متعلقہ بات کر رہی ہیں۔"

"یور آنر' اس گواہ کے مطابق یہ بارہ بج کر بیس منٹ پہ اس گیٹ پہ موجود تھا' صرف تب ہی یہ کار پہ آنے والوں کی شکلیں دیکھ سکتا ہے لیکن اگر وہاں سگنل نہیں آتے' تو پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ گواہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا اور وہ فون اس نے کسی اور جگہ پہ سنا تھا۔" آپ ان کے موبائل کی لوکیشن پتا کروا سکتے ہیں۔"

"اوور رولڈ!" پراسیکیوٹر قدرے غیر آرام دہ سا بیٹھا۔ جج نے گواہ کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ وہ اب تک سنبھل چکا تھا۔

"میرا خیال ہے میں نے بات گھر کے اندر کی تھی' وہاں سگنل آتے ہیں' اور میں بات کر کے باہر آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ ....."

"آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ نے بات کہاں کی' آپ کو یہ یاد نہیں کہ آپ وہاں کیوں کھڑے تھے مگر آپ کو یہ یاد ہے کہ ان دونوں کی شکلیں کیسی تھیں اور یہ کہ ان کی کار کی نمبر پلیٹ غائب تھی؟" اسی سنجیدگی سے وہ پوچھ رہی تھی۔

"دیکھیں' کافی دن گزر چکے....."

"آپ فوراً" قمرالدین صاحب کو ہسپتال لے کر گئے تھے؟" بات کاٹ کر اس نے اگلا سوال داغا۔

گواہ نے سر اثبات میں ہلایا۔ "جی ہاں۔"

"اور ان کے میڈیکل معائنے کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟"

"جی۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے کہ قمرالدین چودھری کی میڈیکولیگل رپورٹ پہ جو "دوست / رشتہ دار" کا خانہ ہوتا ہے' جس میں اس شخص کا نام لکھا جاتا ہے جو طبی معائنے کے وقت ساتھ ہو' وہ خانہ خالی کیوں ہے؟"

اس نے رپورٹ کی ایک ایک کاپی جج اور پراسیکیوٹر کے سامنے رکھی' تیسری گواہ کے ہاتھ میں دی۔

گواہ نے تھوک نگلا۔ سر اٹھا کر پراسیکیوٹر کو دیکھا۔

وہ کاغذ پڑھتے ہوئے تیزی سے اٹھا۔

"یور آنر' ڈاکٹر سے بھول چوک ہو سکتی ہے' اتنے مریضوں کی موجودگی میں اکثر ڈاکٹرز اس خانے کو پر کرنا بھول جاتے ہیں۔"

"دو مریض' دو لاشیں' دو رپورٹس!" وہ مزید چند

کاغذ میز سے اٹھا کر لائی اور جج صاحب کے سامنے رکھے۔ "۲۹ اگست کو ڈاکٹر سعادت نے قمرالدین چودھری کے علاوہ مزید دو لاشوں کی میڈیکولیگل رپورٹس تیار کی تھیں' ان دونوں میں دوست / رشتے دار کا خانہ بھرا ہوا ہے۔ اگر ڈاکٹر کو وہاں یاد رہا' تو اسے یہاں کیوں بھول گیا؟ یا پھر۔۔۔"

گواہ کے سامنے کھڑے ہو کر مسکرا کر اسے دیکھا۔

"آپ وہاں موجود ہی نہیں تھے' بلکہ آپ کو پراسیکیوشن نے رٹی رٹائی کہانی یاد کرنے کو کہا ہے؟"

فارس ہلکا سا مسکرایا۔ یہاں سے ابھی تک زمر کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا' مگر اس کا انداز' اس کی نرم سی سختی۔۔۔ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

"آبجیکشن یور آنر۔" پراسیکیوٹر غصے سے بولا اور جج صاحب نے فوراً "sustained" سے کہتے ہوئے زمر کو تنبیہی نظروں سے دیکھا بھی تھا' مگر وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر "withdrawn" کہتی واپس کرسی پہ جا بیٹھی۔

"مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا مگر میں گواہ کو دوبارہ بلا کر جرح کرنے کا حق محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔" اب وہ عدالت کو اطلاع دے رہی تھی۔

فارس نے مسکراتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر رک گیا اور مسکراہٹ دبالی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی تعریف کرتا۔



چلی جو سیل رواں پہ محبت کی کشتی
تو اس سفر کو محبت کے نام میں نے کیا

سندھ میں ایک طویل عرصے کی تعیناتی کے بعد اس کو بالآخر اپنے شہر میں واپس بلا لیا گیا تو وارث خوش تھا۔ اس کے خیال میں فارس کے کیریئر سے کلنک کا ٹیکا اتر گیا تھا اور اس کی ترقی کے چانسز بڑھ گئے تھے۔ مگر اس کی خوش گمانی چند ہفتوں میں ہی ختم ہو گئی اور فارس کے کولیگ سے ملنے کے بعد وہ سیدھا قصر کاردار کی انیکسی میں آیا تھا۔

"اب میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے فریج سے سافٹ ڈرنک کے دو کین نکالتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تھا۔ پھر سیدھا ہو کر پلٹا تو دیکھا' وارث گلاسز کے پیچھے سے اس کو تندی سے گھور رہا تھا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ اس دفعہ تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"تم میرے باس کی طرح باتیں کیوں کرتے ہو؟" ایک کین اس کی طرف اچھالا' اور دوسرا کھول کر خود صوفے پہ آگرا۔

وارث نے سختی سے لب بھینچے کین میز پہ پٹخا اور اس کے سامنے بیٹھا۔

"تمہارے سامنے ایک شخص گن لہراتا ہوا بھاگ گیا اور تم نے اس پہ گولی نہیں چلائی!"

"اس نے ایک بچے کو یرغمال بنا رکھا تھا' اس کی گردن پہ پستول رکھ کر' اس کو ڈھال بنا کر وہ کھڑا تھا' میں بچے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔" اور کین لبوں سے لگائے گھونٹ بھرا۔

"تو تمہیں اس کے بازو پہ گولی مارنی چاہیے تھی' اس رگ پہ' جس کے کٹتے ہی وہ ٹریگر دبانے سے مفلوج ہو جاتا۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں کسی نے یہ سب نہیں سکھایا۔"

فارس نے کین رکھا اور سنجیدگی سے آگے ہوا۔

"وارث۔۔۔ وہ ایک انسان تھا۔ اس پہ اسمگلنگ کے جتنے مقدمے ہوں' وہ ایک انسان تھا' میں ایک انسان پہ گولی نہیں چلا سکتا تھا' اس اینگل سے میرا بیسٹ شاٹ اس کی کنپٹی پہ لگتا' اور میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کسی کو۔"

"اور تمہیں کیا لگتا ہے' وہ بھاگ کر جو گیا ہے' تو کیا اب مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو گا؟ نہیں غازی۔ وہ جتنے لوگوں کی زندگیاں منشیات سے خراب کرے گا' وہ تمہارے سر ہوں گی۔" فارس چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"سارہ کیسی ہیں؟" وارث نے مزید غصے سے اسے دیکھا۔

"ٹاپک مت بدلو۔ قتل کرنا جرم ہوتا ہے' مگر ڈیوٹی

کی لائن میں "فسادفی الارض کرنے والوں کو مارنا ثواب کا کام ہوتا ہے۔"

"کیا معلوم وہ توبہ کر لے؟ نیک ہو جائے؟ میں نے جو بھی کیا' بچے کو بچانے کے لیے کیا' ہاں ٹھیک ہے' میری کمزوری ہے یہ کہ میں ایک انسان پہ گولی نہیں چلا سکا' مگر... ہو سکتا ہے' وہ بدلنے والا ہوتا اور میں اس کا چانس اس سے چھین لیتا۔"

اس بات پہ وارث غازی پورے دل سے مسکرایا تھا۔

"میری ایک نصیحت ساری زندگی یاد رکھنا' فارس!" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

"انسان نہیں بدلا کرتے۔ لاکھوں میں سے ایک دو تو بدل سکتے ہیں' مگر ہر کوئی نہیں بدلتا۔"

یہ نصیحت بھلانے میں اسے چند دن لگے تھے' مگر ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ اٹک ضرور گئی تھی' لیکن یہ وہ دن تھے جب دل اور دماغ میں اور بھی بہت کچھ چل رہا تھا۔ اس نے زمر کی یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ شام کی کلاسز وہ اس سے لینے لگا تھا' اور یہ اس کو خود بھی معلوم تھا کہ پورے شہر میں ایک یہی یونی تو نہیں تھی۔ پھر وہ ادھر کیوں آتا تھا؟ صرف اس کے لیے۔

اس سے قبل ان دونوں کی ملاقات زیادہ نہ رہی تھی بلکہ رسمی سلام سے زیادہ اس نے کبھی اس سے بات بھی نہ کی تھی اور سندھ میں قیام کی اس طویل مدت کے دوران اس کو وہ بھول بھال بھی گئی تھی مگر یہاں آنے کے بعد... ایک روز اس نے اسے سعدی کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا' اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر اس نے اس لڑکی کو کھو دیا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لیے نہیں ہو گا۔

وہ اس کی یونی جانے لگا' اس سے بات کرنے کے مواقع تلاش کرنے لگا' اس کا زیادہ سے زیادہ وقت لینے کے بہانے ڈھونڈنے لگا' اور وہ ہمیشہ ہی اسے ایک طرح سے ڈیل کرتی تھی۔ احترام اور عزت کے ساتھ' مگر ریزرو اور دور۔ وہ خوب صورت نہیں تھی' شکل و صورت بھی وہ محض واجبی تھی' رنگت بھی گندمی مائل تھی' بال خوب صورت تھے' مگر نہ وہ بننے سنورنے کی شوقین تھی' نہ وہ کسی سے بے وجہ بات کیا کرتی تھی۔ زیور کے نام پہ وہ صرف ناک میں نتھ پہنا کرتی تھی۔ شاید اسے اپنی ناک بہت عزیز تھی!

وہ بہت اچھی تھی' یا پھر اسے لگتی تھی۔ محبت کرنے والی' مگر مضبوط' دبنگ اور کبھی کبھی ذرا ضدی۔ نرم لہجے میں سخت باتیں کر جاتی تھی۔ قلم سے کاغذ پہ لکھتے لکھتے' کسی بے معنی بات پہ وہ بس ایک ابرو اٹھا کر اسے دیکھتی' اور پھر واپس کام کرنے لگ جاتی اور اس کا یہ انداز سامنے والے کو پیچھے ہٹنے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ وہ دل کی اچھی تھی۔ مہربان' اور نرم سی۔ اس میں ہر وہ خوبی تھی جو اس جیسے مرد کو متوجہ کرتی' مگر وہ اس معاشرے کا مرد تھا' جس کے لیے اپنی عزت اور عزت کا بھرم ہر شے سے اوپر تھا' کیونکہ آخر وہ تھی تو بیگم ولایت کے خاندان سے نا!

چاہے قصوں' کہانیوں اور فلموں میں محبت کی شادیاں سحر انگیز لگتی ہوں' حقیقت اس سے مختلف تھی۔ وہ ابھی اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی سنتا' آگے سے کہتا' "اچھا... وہ دونوں ایک یونی ورسٹی میں ساتھ ساتھ..." اور اس سے آگے کی معنی خیز مسکراہٹیں اور آنکھوں کی چمک... فارس کی طبیعت کو یہ گوارا نہ تھا۔ بہت سالوں کی ریاضت کے بعد' کتنے اسباق سیکھ کر اور کتنی اذیت کاٹ کر وہ' وارث اور ندرت ایک خاندان بنے تھے۔ وہ بالآخر ان کے خاندان میں "دوسری بیوی کا بیٹا" نہیں' بلکہ ندرت اور وارث کا بھائی سمجھا جانے لگا تھا' وہ اس عزت پہ حرف بھی نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

سو اس نے تاخیر کی' اور پھر وہ تاخیر کرتا گیا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد وہ عزت سے اس کے لیے رشتہ بھجوا دے گا۔ منگنی' شادی' اپنے شہر میں پوسٹنگ' متوقع ترقی' اچھی جاب' بچے... فارس غازی کی زندگی کی ساری ترجیحات اس کے ساتھ تھیں۔

بہت ہی صفائی اور سلیقے سے آراستہ اور مرتب شدہ۔

☆ ☆ ☆

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مرجاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مرجاتے ہیں

شیشوں سے ڈھکی عمارت کے اندر سورج کی نرم گرم کرنیں گر رہی تھیں۔ سیکرٹری حلیمہ اپنے ڈیسک کے پیچھے کھڑی ہاشم سے بات کررہی تھی 'جو فون پہ بٹن دبا تا' ذرا دیر کو اس کی بات سننے کے لیے رکا تھا۔

"سر! آپ ٹھیک ہیں؟" حلیمہ نے رک کر پوچھا تو ہاشم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ گرے سوٹ اور گرے ویسٹ میں ملبوس' بال پیچھے کو جیل سے بنائے' وہ ہمیشہ کی طرح ہینڈسم لگ رہا تھا' مگر اس کی آنکھیں بے خوابی کا شکار لگتی تھیں۔

"تھینک یو حلیمہ! میں ذرا اوور ورکڈ ہوں۔" پھر ٹھہر کر پوچھا۔ "خاور کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں سر۔ اس کی وہی ای میل آئی تھی مجھے..... کہ کچھ دن کے لیے وہ روپوش ہو رہا ہے۔ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اس کے بیٹے کو بھی اس کا یہی میسج ملا ہے' وہ بھی مجھ سے کئی بار پوچھ چکا ہے۔ آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں' مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا۔" ہاشم نے افسوس بھری لاعلمی سے شانے اچکائے اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

رئیس اس کا منتظر تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے آیا۔ ہاشم نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس پہ ایک سنجیدہ نظر ڈالی۔

"پراگریس؟"

"سر! ہر طرح کی ٹارچر تکنیک استعمال کرچکے ہیں' وہ نہیں اعتراف کرتا۔ بہت سخت جان ہے!"

"میں جانتا ہوں!" ہاشم نے لیپ ٹاپ کھولتے ہوئے سر کو خم دیا۔ "اس کو کڑی نگرانی میں رکھو اور مزید کوشش کرو۔ مجھے اس شخص کا نام چاہیے جس کے کہنے پہ اس نے میرے باپ کو مارا ہے یا اگر وہ اکیلا کام کررہا تھا تو مجھے اس کا motive (مقصد) سننا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی قتل نہیں کرتا۔ اب جاؤ!" ابرو سے اشارہ کیا اور پھر ان ہی تناؤ کے تاثرات کے ساتھ اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"سر! فارس غازی کا دو دفعہ پیغام آیا ہے' وہ آپ سے....."

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ اگلے ہفتے میں جاؤں گا اس سے ملنے۔" مصروفیت اور قدرے بے زاری سے کہہ کر وہ کام کرنے لگا۔ رئیس سر ہلا کر مڑ گیا۔

اور ہزاروں میل دور..... سمندر کنارے بنے ہوٹل کے تہہ خانے میں مستعد گارڈز اسی طرح اپنی جگہوں پہ کھڑے تھے۔ پتھر جیسے چہرے بنائے' چاق وچوبند اور الرٹ۔ تب ہی سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا خالی مگ تھا جو اس نے باہر میز پہ دھرا' پھر سنجیدہ چہرے کے ساتھ گارڈز کی طرف آیا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے۔" یہ اجازت اسے چند دن پہلے سے ہی ملنے لگی تھی' سو گارڈ سر ہلا کر اسے راہداری میں آگے لے آیا۔ ایک دوسرے کمرے کا لکڑی کا دروازہ کوڈ دبا کر کھولا تو سعدی نے اندر قدم رکھا۔ پیروں میں نرم سلیپر' اوپر جینز پہ ہلکی جرسی شرٹ پہنے وہ تندرست اور توانا لگتا تھا' اس کے برعکس دوسرے قیدی کا حال مختلف تھا۔

اس کے ہاتھ اور پیر ہتھکڑیوں سے بندھے تھے جن سے لٹکتی زنجیریں دیوار میں نصب تھیں۔ زمین پہ بیٹھا' دیوار سے ٹیک لگائے' وہ آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ چہرے اور گردن پہ زخموں کے نشان اور پرانے کپڑوں پہ لگے کٹ اور خون کے دھبے۔ بند آنکھوں کے گرد نظر آتے نیل۔ سعدی نے بالکل بے تاثر نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"ہیلو خاور!"

خاور نے نیل نیل آنکھیں کھولیں۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور ہونٹ پہ بھی خون جما تھا۔ آنکھوں

میں برہمی اور چبھن لیے اس نے سعدی کو دیکھا۔
"کیا دیکھنے آئے ہو؟ یہی کہ میں زندہ ہوں یا نہیں؟"
پھر ہلکا سا مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں بچے! تمہیں کیا لگتا ہے، تم میرے اوپر الزام لگا کر ہاشم کو مجھ سے بدظن کر دو گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"
پھر اٹھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھیں مگر ضبط کر کے وہ سیدھا سعدی کے سامنے کھڑا ہوا۔
"میں تمہارا سارا گیم سمجھ گیا ہوں۔ پہلے دن سے سمجھ گیا تھا۔ تم ہاشم اور مجھے توڑنا چاہتے ہو، چاہتے ہو میں قید میں مرجاؤں اور تم ہاشم کو تنہا کر کے مارو۔ ڈیوائیڈ اینڈ رول! ہے نا؟"
سعدی ہلکا سا مسکرایا۔ بولا کچھ نہیں۔ اس کی گردن پہ سرخ خراش کا مندمل نشان اب بھی موجود تھا۔ کوئی چار روز قبل اسے پہلی دفعہ خاور سے ملاقات کی اجازت ملی تھی تو خاور نے اپنی زنجیر کو اس کی گردن میں لپیٹ کر اسے مارنے کی کوشش کی تھی جسے بروقت گارڈز نے ناکام بنا دیا تھا۔ وہ اس کو دیکھتے ہی بکنے جھکنے لگتا تھا۔ آج جیسے اونچا بولنے سے وہ اکتا چکا تھا سو آواز نارمل رکھی تھی۔
"کہا تھا میں نے ہاشم کو۔ سعدی یوسف فرشتہ نہیں ہے۔ کہاں گیا تمہارا اسلام، تمہارا دین جب تم مجھ پہ ناکردہ گناہ کا الزام لگا رہے تھے؟" حقارت سے اسے دیکھا۔
سعدی ہلکا سا ہنسا پھر سر جھٹکا۔
"ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے، کرداروں کو کاٹنے کے لیے کردار جیسا بننا پڑتا ہے، ان جیسا سوچنا پڑتا ہے۔ چار سال..." انگوٹھا اندر کر کے چار انگلیاں اس کو دکھائیں۔
"چار سال میں نے قانون، وکیلوں، عدالتوں کے ساتھ تعاون کر کے انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مگر نہ میں فارس غازی کو قانونی طریقے سے نکال سکا، نہ وہ مجھے نکال سکے گا۔ سو جو قانون انصاف نہیں دے سکتا، وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ اس لیے بہت سادہ طریقہ ہے انتقام لینے کا، ہاشم کو تمہارے خلاف بھڑکا کر تمہیں اسی کے ہاتھوں سے مروادوں۔"
وہ سانس لینے کو رکا۔ خاور اسی طرح غصے اور نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"مگر میں یہ سب انتقام کے لیے نہیں کر رہا۔ اس لیے تمہیں مروانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" خاور کے ابرو بھینچے، وہ ذرا چونکا تھا۔
"میں تمہیں نہیں مروانے لگا کرنل خاور...! میں صرف تمہیں سولی چڑھا رہا ہوں، کیونکہ تم میری آزادی کا پروانہ ہو۔"
"ایک منٹ تم..."
"نہیں، میں تمہیں ہاشم کے خلاف بھی نہیں استعمال کرنے لگا، میں نے صرف تمہیں سولی چڑھانا تھا، تمہاری گردن کاٹنا ہاشم کا کام ہے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، کیونکہ اسے کبھی یقین نہیں آئے گا کہ تم اس کے باپ کے قاتل ہو۔"
خاور آنکھیں سکیڑے، تعجب اور ناگواری سے اسے گھورتے قریب آیا۔ سعدی سے دو قدم دور اس کی زنجیر کس گئی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔
"تمہیں لگتا ہے، ہاشم تمہیں قاتل سمجھتا ہے؟ اونہوں۔" سعدی نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔
"وہ شک میں ہے۔ اسے صرف ایک چیز تمہارے قاتل ہونے کا یقین دلا سکتی ہے اور وہ ہے تمہارا اقبال جرم!"
"جو میں کبھی نہیں کروں گا۔"
"مگر تمہارے اقبال جرم نہ کرنے سے وہ تمہاری بے گناہی مان نہیں لے گا۔ میں نے کہا نا، وہ شک میں ہے، اگر یقین ہوتا اسے تو وہ تمہیں اب تک مار چکا ہوتا۔ صرف ایک چیز اس کو تمہاری بے گناہی کا یقین دلا سکتی ہے، اور وہ ہے... میرا اقبال جرم، کہ میں نے تم پہ الزام لگایا۔"
"تمہارے بار بار بیان بدلنے سے تمہاری کریڈیبلٹی ختم ہو جائے گی۔"

"جب میں اسے اصلی قاتل کا نام بتاؤں گا' تو تم بری ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہیں صرف سولی پہ چڑھانا تھا' سزائے موت نہیں دینی۔ مجھے معلوم تھا ہاشم تمہیں مارے گا نہیں بلکہ تمہیں اپنی بہترین جیل میں قید کردے گا۔ یوں تم میرے پاس آجاؤ گے۔ تم میری آزادی ہو خاور! میں نے اتنے مہینے سوچا کہ مجھے یہاں سے کون نکالے گا۔ فارس' زمر' میری بہن' کوئی دوست۔۔۔ مگر نہیں۔"

مسکرا کر کہتا دو قدم قریب آیا اور انگلی سے خاور کے سینے پہ دستک دی۔

"مجھے یہاں سے تم نکالو گے اور میں تمہارے حق میں گواہی دے دوں گا۔ ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے۔" خاور نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"اوور مائی ڈیڈ باڈی سعدی یوسف!" وہ اس کو گھورتے چبا چبا کر بولا۔ "اگر مجھے آزاد ہونا ہوتا تو پہلے دن ہی ہو جاتا۔ یہ جیل میں نے بنائی تھی' اس کے ہر راز سے میں واقف ہوں' مگر مجھے اپنے مالک سے بھاگنا نہیں ہے' مجھے اس کے پاس واپس جانا ہے۔ میں اور تم ۔۔۔ کبھی ساتھ کام نہیں کریں گے۔ رہے تم ۔۔۔ تو تم اپنی معصومیت کھوتے جا رہے ہو۔ تم بھی وہی بنتے جا رہے ہو جن سے تم نفرت کرتے تھے۔"

"میری آفر محدود مدت کے لیے ہے۔" ایک استہزائیہ نظر خاور پہ ڈال کر وہ مڑ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پہ گارڈ کی صورت نظر آئی تو خاور بے اختیار چلانے لگا۔

"مجھے ہاشم کاردار سے بات کرنی ہے۔ میری ان سے بات کرواؤ۔ کیا تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔" سعدی باہر نکل آیا اور گونگے بہرے گارڈ نے دروازہ مقفل کر دیا۔ زنجیروں میں جکڑا شخص اسی طرح چلائے جا رہا تھا۔



کس طرح لوگ اٹھ کر چلے جاتے ہیں چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں

کورٹ روم میں ٹھنڈ اور خنکی آج بھی موجود تھی۔ ڈریس پینٹ اور کوٹ میں ملبوس احمر شفیع نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو اندر سب کو خاموشی سے کٹہرے میں کھڑے شخص کا بیان سنتے پایا۔ وہ دبے قدموں چلتا آیا اور زمر کے ساتھ بیٹھے فارس کے دائیں جانب آ بیٹھا۔ "سوری۔ مجھے دیر ہو گئی۔" معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ فارس کے قریب سرگوشی کی۔

فارس غازی کٹہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سفید شلوار قمیص کے اوپر براؤن کوٹ پہنے' وہ سنجیدہ اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ آواز پہ گردن موڑ کر ایک گہری نظر احمر پہ ڈالی۔

"اچھا' مجھے لگا تم عجلت میں ہو۔"

احمر نے بیٹھتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

فارس نے نگاہ اس کے پورے وجود پہ ڈالی۔ سلک شرٹ' ڈیزائنر واچ' بدلا ہوا سیل فون' اتنی جلدی اتنا کچھ احمر؟"

"میں ترقی کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اسے تعجب ہوا تھا۔

"تم کاردارز کے پاس کام کرنے لگے ہو' وہ میرے رشتے دار ہیں' میں ان کو جانتا ہوں' اسی لیے کتنے دنوں سے تمہیں نصیحت کر رہا ہوں کہ ان کے سرکل سے نکل آؤ' ورنہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنا لیں گے۔"

احمر کے چہرے پہ ناگواری بھری بے بسی ابھری' وہ جوابا" کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زمر نے "ششش" کہہ کر ٹوکا تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ فارس سنجیدگی اور احمر ناخوشی سے سامنے دیکھنے لگا' جہاں پراسیکیوٹر' ناظم سے سوال کر رہا تھا۔

"28 اور 29 اگست کی درمیانی شب کیا ہوا تھا' عدالت کو مطلع کیجیے۔"

"میں کار لے کر اس فیکٹری تک پہنچا جہاں غازی نے مجھے آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ فیکٹری خالی' ویران اور عرصے سے بند پڑی ہے۔ میں نے کار باہر روکی ہی تھی کہ اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر اندر آیا تو دیکھا کہ قمرالدین اسی کرسی پہ بندھا پڑا ہے

جیسا صبح میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا اور سامنے فارس غازی کھڑا ہے' اس نے پستول اس پہ تان رکھا ہے۔ قمرالدین کی گردن ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی اور غازی نے اسے کنپٹی میں گولی ماری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے اسے کیوں مارا؟ مارنا تو پلان میں شامل نہیں تھا' تو اس نے کہا کہ اس نے مجھے نازیبا باتیں کہی تھیں جن پہ مجھے غصہ آگیا اور میں نے اسے پھڑکا دیا۔ میں نے پوچھا کیسی باتیں؟ تو اس نے نہیں بتایا۔ پھر ہم سوچتے رہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگائیں۔ اس نے کہا کہ مقتول کے گھر پھینک آتے ہیں' میں ڈر گیا مگر اس نے مجھے راضی کر لیا اور مجھے وہاں انتظار کرنے کو کہا۔ پھر وہ چلا گیا اور دوپہر کو واپس آیا۔ پھر اس نے کہا کہ لاش کو کار میں ڈالو میں نے کہا میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اس نے خود ہی لاش کو گھسیٹا اور گھسیٹتے ہوئے کار میں جاکر ڈالا۔ پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ کر قمرالدین کے گھر گئے' لاش پھینکی' تب ایک شخص جو اس کا بہنوئی تھا' باہر کھڑا تھا۔"

"کیا وہ فون پہ بات کر رہا تھا؟" پراسیکیوٹر نے کہتے ساتھ ایک نظر زمر پہ ڈالی۔

"نہیں' اس کے ہاتھ میں فون تھا مگر وہ فون پہ بات نہیں کر رہا تھا۔" زمر خاموش رہی۔

"اچھا' یہ بتاؤ' تم فارس غازی اور مقتول کی جیل کی دشمنی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"میں قمرالدین کے رہا ہونے کے سال بعد آیا تھا جیل میں' مگر میں نے وہاں پہ اپنے ساتھیوں سے سنا تھا کہ..."

"آبجیکشن یور آنر!" زمر نے بیٹھے بیٹھے قلم انگلیوں میں گھماتے آواز بلند کی۔ "heresay" (خلاف قانون)

"یور آنر' فارس غازی اور قمرالدین کی دشمنی کے بارے میں کورٹ کو بتانا ضروری ہے' تاکہ پوری تصویر واضح ہو سکے۔" پراسیکیوٹر جلدی سے بولا تھا۔

"مگر یور آنر یہ خلاف قانون ہے۔ اس نے کہا' اس سے سنا۔ آپ heresay کی ٹرائل میں اجازت نہیں دے سکتے۔ جو ناظم صاحب ابھی کہیں گے' وہ گواہی نہیں ہے' ثبوت نہیں ہے' بلکہ سنی سنائی بات ہے' وہ صرف تب کہی جا سکتی ہے جب استغاثہ عدالت میں ان ساتھیوں کو پیش کرے جنہوں نے ناظم سے یہ بات کہی ہے' مگر چونکہ ایسا کوئی شخص استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے' سو یہ سوال یا اس کا جواب... کسی کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"مگر یور آنر!"

جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کر پراسیکیوٹر کو روکا' پھر آنکھیں مسلتے ہوئے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "sustained" (درست)

(ایک وکیل کے کسی سوال پہ دوسرا وکیل جب اعتراض کرتا ہے تو جج اس اعتراض کو اوور رول کہہ کر رد کر دیتا ہے یا اسے sustained کہہ کر برقرار رکھتا ہے) پراسیکیوٹر نے صبر کا گھونٹ بھرا' چند ایک واجبی سوال پوچھے اور واپس آبیٹھا۔ زمر قلم رکھ کر اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کٹہرے کے قریب آئی۔ ناظم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ کو انگریزی آتی ہے؟" سنجیدگی سے سوال کیا۔

ناظم نے ایک نظر پیچھے بیٹھے پراسیکیوٹر کو دیکھا اور پھر زمر کو۔ "جی تھوڑی بہت۔"

"Dying declaration" کیا ہوتا ہے؟ عدالت کو بتائیں گے؟"

"آ..." اس نے تذبذب سے شانے اچکائے۔

"اوکے میں بتاتی ہوں declaration Dying نزعی بیان کو کہتے ہیں' جو کوئی شخص مرتے وقت دیتا ہے' اور..."

"آبجیکشن یور آنر۔ مس زمر مدعے سے باہر جا رہی ہیں۔" پراسیکیوٹر جلدی سے کھڑا ہوا۔

"اوور رولڈ۔ ان کی پوری بات سننے میں کیا حرج ہے۔" جج صاحب نے زمر کو ایک حوصلہ افزا نظر سے نوازا۔ وہ واپس ناظم کی طرف گھومی۔

"آپ نے کیا اس کیس کا نام سن رکھا ہے' اشرف

پرویز بنام سلیم شاہد؟"

"جی!"

"اس کیس میں سلیم شاہد پہ الزام تھا کہ اس نے ایک شخص کو سڑک پہ چھرا مار کر قتل کیا ہے' اور مقتول نے مرنے سے پہلے ایک راہ گیر کو نزعی حالت میں بتایا تھا کہ اس کا قاتل سلیم شاہد ہے اور یہ کہ اس نے خاندانی عداوت کی بنا پہ ایسا کیا ہے۔ اس راہ گیر کا نام ___" میز سے ایک کاغذ اٹھا کر لائی اور ناظم کی طرف بڑھایا۔ "مجھے پڑھ کر سنائیں۔"

ناظم نے ایک نظر کاغذ پہ ڈالی۔ "ناظم فاروق ولد محمد فاروق۔"

"سو ناظم صاحب! کیا آپ اس کیس میں بطور گواہ پیش ہوئے تھے اور آپ نے مقتول کا نزعی بیان عدالت کو سنایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"مگر عدالت نے ملزم سلیم شاہد کو بری کر دیا تھا۔ کیا آپ مجھے اسی کاغذ پہ ہائی لائٹ شدہ سطور اونچی آواز میں پڑھ کر سنائیں گے جس میں جسٹس نعیم الحق نے اس نزعی بیان پہ یقین نہ کرنے کی وجہ بیان کی ہے؟"

وہ انگریزی میں سطور پڑھنے لگا۔ سب خاموشی سے سننے لگے۔

"دوران جرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ PW5 ناظم فاروق نے چند باتوں میں غلط بیانی سے کام لیا ہے' اس کے علاوہ PW5 ناظم فاروق کی کریڈیبلٹی اور سابقہ ریکارڈ ایسا صاف شفاف اور شک وشبے سے پاک نہیں ہے' اس لیے ان کی بات پہ یقین نہیں کیا جا سکتا۔" پڑھ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"جو شخص ایک معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے' اس کی بات پہ کسی دوسرے معاملے میں یقین نہیں کیا جا سکتا۔" یہ الفاظ جسٹس محمد عامر ملک نے 1990ء میں صابر بنام سرکار اپیل کیس کے دوران کہے تھے اور ان الفاظ کی روشنی میں' کیا ہم آپ کی بات پہ یقین کریں' ناظم صاحب؟"

"یور آنر' مسز زمر ایک اور کیس کو اس کیس کے ساتھ ملا کر گواہ کی کریڈیبلٹی کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔" پراسیکیوٹر نے پھر احتجاج کیا۔

زمر نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"اوکے فائن۔ مجھے گواہ کی کریڈیبلٹی کو چیک کرنے دیں۔" دوبارہ سے ناظم کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

"آپ کتنی دفعہ جیل جا چکے ہیں؟" (اس سوال پہ پراسیکیوٹر نے پھر سے پہلو بدلا تھا۔)

"دو دفعہ۔"

"کیا یہ درست ہے کہ آپ کے اوپر چوری اور اغوا برائے تاوان کے پانچ مقدمے مختلف اوقات میں قائم ہو چکے ہیں؟"

"جی۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ زمر نے جج صاحب کو ان الفاظ کو جذب کرنے کے لیے چند لمحے کا وقفہ دیا پھر بولی۔

"اس رات آپ جب فیکٹری پہنچے تو آپ نے گن فائر کب سنا؟"

"جب میں نے کار پارک کی۔"

"اور پھر آپ دوڑ کر اندر آئے' تو کیا دیکھا؟"

"یہی کہ فارس غازی نے گن مقتول پہ تانی ہوئی ہے۔ اور مقتول کی کنپٹی سے خون بہہ رہا ہے۔"

"کیا فارس غازی اس کو دوسری گولی مارنا چاہتا تھا؟"

"آبجیکشن یور آنر" کاؤنسلر گواہ سے اس کی رائے مانگ رہی ہیں۔" وہ پھر پیچھے سے بولا۔ جج نے "sustained" بولا ہی تھا کہ زمر فوراً" سے کہنے لگی۔

"اوکے' میں سوال کو دوسری طرح سے کرتی ہوں۔ کیا آپ نے غازی کو دوسری گولی چلانے سے روکا؟"

"نہیں' وہ دوسری گولی نہیں چلا رہا تھا' اس نے مجھے دیکھ کر گن نیچے کر لی۔"

"اوکے!" وہ وائٹ بورڈ کی طرف آئی' ایک جگہ انگلی رکھی۔ "اس مقام پہ آپ نے کار پارک کی' اور اس مقام پہ فارس غازی نے آپ کے بقول گولی چلائی'

میں چند روز پہلے اپنے بھتیجے کے ساتھ اس جگہ پہ گئی' اور اس نے مجھے پوائنٹ اے سے پوائنٹ بی تک بھاگ کر دکھایا۔ سو اس پارکنگ کی جگہ سے اس اندر کی طرف تک بھاگ بھاگ کر بھی آتے اس کو ڈیڑھ منٹ لگا۔ آپ کو بھی اتنا ہی وقت لگنا چاہیے۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ گولی چلانے کے بعد ڈیڑھ منٹ تک ایک آدمی جس کا ارادہ بقول آپ کے دوسری گولی چلانے کا بھی نہیں تھا' وہ کیوں اپنے مقتول پہ پستول تانے رکھے گا۔ عموماً" گولی چلانے کے بعد پستول جھٹکا کھاتا ہے' اور لوگ پستول والا ہاتھ نیچے گرا دیتے ہیں۔"

"میں کہہ سکتا ہوں' میں نے جو دیکھا وہ بتا دیا۔" اس نے ڈھٹائی سے شانے اچکائے۔ زمر نے ایک نظر جج صاحب کے تاثرات پہ ڈالی' جو نوٹس لکھ رہے تھے' پھر دوبارہ ناظم کی طرف گھومی۔

"اچھا' مجھے ذرا یہ فرمائیں کہ عامر' مبینہ طور پہ لاش کو کس طرح کار تک لے کر آیا؟"

"گھسیٹ کر۔"

"فیس اپ یا فیس ڈاؤن؟"

"جی؟"

"لاش کا چہرہ اوپر تھا یا زمین کی طرف تھا؟"

"آ۔۔۔ اوپر تھا۔"

"جو راستہ آپ نے پولیس کو بتایا تھا' جہاں مقتول کے خون کے دھبے بھی ملے ہیں' وہ پتھریلا بھی ہے اور درمیان میں کافی گھاس بھی' جیسا کہ آپ ان تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔" اس نے اپنی میز سے چند تصاویر اٹھا کر باری باری جج صاحب اور پھر نیچے پراسیکیوٹر کی میز پر رکھیں۔

"اس لحاظ سے جب کسی شخص کو ایسی زمین پہ گھسیٹا جائے تو اس کی کمر پہ رگڑ کے نشان' یا کپڑوں کا پھٹنا' یا سبز مائل دھبے ہونا ناگزیر ہوتا ہے' مگر میڈیکو لیگو رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم پہ ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔"

پراسیکیوٹر کھڑا ہونے لگا مگر وہ اونچی آواز میں بولے گئی۔

"اور اس سے پہلے کہ پراسیکیوٹر صاحب اعتراض کریں' 1990ء میں جسٹس عامر ملک نے سردار لطیف کھوسہ کے کلائنٹ صابر وغیرہ کی اپیل اس لیے منظور کی تھی کہ اگر اس نے مبینہ طور پہ لاش کو گھسیٹا تھا تو لاش پہ سبزی مائل دھبے یا رگڑ کے نشان کیوں نہیں تھے؟ اس ججمنٹ کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناظم صاحب کے بیان میں جھول ہے۔ اور لاش کو دو لوگوں نے اٹھا کر کار میں ڈالا تھا' اور وہ دو لوگ شریک جرم تھے۔"

"اوکے اب کاؤنسلر testify کر رہی ہیں۔" زمر اسے نظرانداز کیے جج صاحب کے سامنے آکر بولی۔

"یور آنر' مجھے مزید کوئی سوال نہیں کرنا لیکن میں گواہ کو ری کراس کرنے کا حق محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔" (پراسیکیوٹر کے تاثرات بے چینی سے بگڑے) "اور یور آنر' اگر اس دوران ناظم صاحب جیل توڑ کر کسی دوسرے ملک فرار ہو گئے تو عدالت کو ان کی گواہی خارج کرنی ہو گی یا پراسیکیوٹر صاحب کو اس گواہ کو give up کرنا پڑے گا۔" اب وہ دونوں ایک ساتھ بولنے لگے تھے اور درمیان میں جج صاحب بھی ناخوشی سے کچھ کہے جا رہے تھے۔

فارس نے گردن موڑ کر احمر کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم لگتا تھا۔

"میں پھر کہہ رہا ہوں' کاردارز کی جاب چھوڑ دو۔ خاور کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے کو اپنا رائٹ ہینڈ نہیں بنائیں گے۔"

"خاور نہیں ہے اب۔" وہ آہستہ سے بولا تو فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں' کدھر گیا وہ؟" وہ تیزی سے سیدھا ہوا۔

"معلوم نہیں۔ نوکری سے نکال دیا ہے اسے یا خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے۔" احمر سامنے دیکھنے لگا۔ فارس نے ہونٹ سکیڑ کر سانس خارج کی اور واپس پیچھے کو ہوا۔

"کچھ معلوم ہے کیوں؟ وہ تو ان کا قابل اعتبار آدمی

تھا۔" سرسری سا پوچھا۔
"نو آئیڈیا۔" احمر نے شانے اچکائے۔ ایک مسکراہٹ فارس کے لبوں پہ ابھر کر معدوم ہوئی۔ اتنے دن بعد سکون کا سانس نصیب ہوا تھا اسے۔ ایک نظر پراسیکیوٹر کی طرف دیکھا جو عدالت برخاست ہونے پہ اب موبائل پہ کوئی نمبر ملاتا تیزی سے باہر نکل رہا تھا۔
(کوشش کرتے رہو۔ مگر تمہیں پیسے دینے والا فون نہیں اٹھائے گا) وہ جب اٹھا تو مسکرا رہا تھا۔ (احمر کچھ کہے بنا باہر نکل گیا تھا۔) زمر نے اپنی چیزیں سمیٹتے چونک کر اسے مسکراتے دیکھا۔ پھر آنکھیں سکیڑیں۔
"ایسا کیا ہوا ہے جو میں نہیں جانتی؟"
"ارے نہیں' میں یہ سوچ رہا تھا کہ ناظم کی طرف سے پریشان نہ ہو' وہ جیل سے نہیں بھاگے گا۔"
"تمہیں کیسے پتا؟"
"میں دیکھ لوں گا اس معاملے کو۔"
"بالکل نہیں۔" قلم اٹھا کر سختی سے تنبیہہ کی۔ "تم کسی معاملے کو نہیں دیکھو گے۔ اور اگر تم نے کسی کو پھر جیل میں مارا پیٹا تو اچھا نہیں ہو گا۔"
"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" صبر اور تحمل سے اس کے سامنے کھڑے اس نے پوچھا تھا۔
"اول' تم بالکل آرام اور سکون سے جیل میں رہو' کچھ نہ کرو' کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک شریف آدمی بن کر رہو۔ اور دوم۔ تم مجھے آپ کہا کرو۔" اسے گھور کر وہ پلٹی تھی کہ وہ اسی تابعداری سے بولا تھا۔
"جو تم کہو!" زمر کے تو سر پہ لگی' تلووں پہ بجھی۔ ایڑیوں پہ تیزی سے گھومی۔
"تمہیں پتا ہے فارس! اگر مجھ پہ ایک قتل معاف ہوتا تو کس کو گولی مارتی؟"
"مجھے پتا ہے۔" وہ مسکرا کر ہلکا سا اس کی طرف جھکا۔ "تم خودکشی کرتیں۔" اور ایک طرف سے نکل کر سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا جو اسے لینے آ رہے تھے۔
"اف۔" اس نے کلس کر ڈھیروں غصہ اندر اتارا تھا۔



ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

یہ شاید اگلی رات کا قصہ ہے۔ اندھیرے اور دھند میں ڈولی انیکسی کی عمارت خاموش پڑی تھی۔ کچن میں دودھ ابلنے رکھا تھا' اور حنین چولہے کے آس پاس ٹہلتی موبائل اسکرین پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ لمبا سوئیٹر پہنے' پیروں میں مختلف رنگ کی جرابیں جن سے انگوٹھے برہنہ ہو کر نکل رہے تھے اور بالوں کو گول مول باندھے' وہ ایک بے ترتیب اور بھرے بھرے کچن کے اندر کھڑی تھی۔ سارے برتن دھلے تھے' مگر پھر بھی کچھ صاف نہ لگتا تھا۔ نجانے کیوں؟
اسکرین کو دیکھتے اس کی آنکھیں پھیلیں۔ انگوٹھے اور انگلی سے اس سطر کو زوم کر کے بڑا کیا۔ بار بار پڑھا۔
"نوشیرواں کا کردار اور علیشا ر بیکا کا کردار اب دوست ہیں؟"
فیس بک کی ایک پبلک سی اطلاع کو وہ بار بار پڑھ رہی تھی۔ ہاشم کی پروفائل وزٹ کرنا چھوڑ چکی تھی' مگر باقی کردار ز کو وہ کبھی کبھی دیکھ ہی لیتی تھی۔
"مگر یہ دونوں دوست کیسے بن گئے؟" اس نے دانتوں کے درمیان انگلی دبا کر سوچا۔ اچنبھا تھا۔ دل میں کھدبد ہوئی۔
"آج ہی توفیوتا نے بتایا تھا کہ خاور اب یہاں جاب نہیں کرتا' یعنی اگر میں اس سپر ہیرو...... مطلب سپر لوزر کی پروفائل ہیک کروں تو کسی کو نہیں پتا چلے گا۔" آنکھیں چمکیں' اور اس سے پہلے کہ وہ ایکسائیٹڈ ہو کر لیپ ٹاپ اٹھانے بھاگتی..... سس کی آواز کے ساتھ ..... دودھ ابل کر چولہے پہ جا گرا۔
"اللہ میرے!" وہ دہل کر پلٹی اور جلدی سے چولہا بند کیا۔ "پورے بیس منٹ میں ادھر کھڑی رہی' مگر نہیں' تب نہیں ابلنا تھا اسے' اور ایک منٹ کے لیے فون اٹھایا تو یہ گر گیا؟ میں کدھر جاؤں؟"
ڈوئی زور سے کاؤنٹر پہ پٹخ کر وہ رونے والی ہو رہی

تھی۔ دفعتاً" چوکھٹ میں زمر نمودار ہوئی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے آئی تھی شاید۔

"کیا ہوا؟" اندر آتے تعجب سے اس کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"حادثہ ہوا، قیامت ہوئی!" وہ آنکھوں میں آنسو لیے غم اور غصے سے پلٹی۔

"میں... میں حنین یوسف... اب دس منٹ یہاں کھڑی ہو کر چولہا صاف کروں گی۔ اور پھر یہ فرش بھی۔ اس روز کتابیں لیں پڑھنے کے لیے، پینٹ خریدا تصویریں بنانے کے لیے، کہ آنکھ اور دل کو کیسے مصروف کروں مگر پڑھنے لگی تو فوکس نہیں ہوا۔ پینٹ کرنے لگی تو رنگ ہی ادھر ادھر بہنے لگے۔ اچھا ٹھیک ہے، نہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے، نہ آرٹسٹ ہوں۔ مجھے تو انجینئر بننا تھا، وہ بھی نہ بن سکی۔ ایم اے بھی نہیں کیا میں نے۔ آپ بتائیں، کیا میں اتنی جینئس لڑکی اس قابل تھی کہ یوں گھر میں ضائع ہوں؟ مجھے تو کمپیوٹر ہیکر بننا تھا، آئی ٹی ایکسپرٹ، بڑے بڑے algorithms لکھنے تھے۔ مجھے تو نولن روس، Felicity Smoak اور Huck کی طرح انگلیاں کھٹ کھٹ کر کے کمپیوٹرز کی دنیا پہ حکمرانی کرنی تھی۔ اور کر کیا رہی ہوں میں؟"

دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر غصے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔

"میں یہاں پہ برتن دھو رہی ہوں، چولہوں کی گرل مانجھ رہی ہوں، باتھ روم صاف کر رہی ہوں، فرش اسکرب کر رہی ہوں۔ جھاڑو اور ٹاٹ لگا رہی ہوں۔ ارے نوکرانیاں کرتی ہیں یہ کام، یا وہ پچھڑی ورنا قسم کی بیویاں جن کے پاس دنیا کا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا، نہ ٹیلنٹ ہوتا ہے، نہ ذہن ہوتا ہے، وہ کرتی ہیں ایسے کام اور امی نے مجھے... مجھے ان کاموں پہ لگا دیا ہے!" وہ صدمے میں تھی۔ زمر تحمل سے سنتی رہی۔

"آئی ایم ڈن!" دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اعلان کیا۔ "بہت بن چکی میں ماسی۔ نہیں کرنے مجھے فارغ عورتوں والے کام۔" پیر پٹخ کر آنسو پونچھتی، وہ دھپ دھپ کرتی لاؤنج کی طرف بڑھ گئی اور زمر، جس نے یہ ساری تقریر خاموشی سے سنی تھی، بس ہلکی سی سانس لے کر بولی۔ "تو پھر اپنا واٹس ایپ اسٹیٹس بھی بدل دو۔"

بیسمنٹ کی طرف جاتی حنین رکی۔ مڑ کر بھیگی آنکھوں میں تعجب بھرے اسے دیکھا۔ "کیوں؟"

"کیونکہ جو آیت تم نے لگا رکھی ہے، 'واوحی ربک الی النحل' مجھے اس کا مطلب معلوم ہے۔" وہ نرمی سے کہتی، آستین موڑے چائے کی کیتلی چولہے پہ رکھنے لگی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"یہی کہ... سعدی کو اس آیت کے بارے میں بہت سے فلسفے آتے ہوں گے، مگر مجھے اس کا ایک ہی مطلب معلوم ہے۔ سادہ اور آسان سا مطلب کہ اللہ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف، اور اسے کہا کہ وہ اپنا "گھر" بنائے... اور... وہ پھولوں پھلوں سے رس چوسے یا آسان راستوں پہ چلے، وہ یہ سب اس لیے کرتی ہے تاکہ اپنے گھر واپس آسکے، اور اپنے گھر کو میٹھے اور خوب صورت رنگوں سے بھر سکے۔ اور پھر اس ساری محنت کا جو نتیجہ نکلے گا، اس میں، صرف اس میں شفا ہوگی تمہارے دل کی۔ کیونکہ دنیا کا سب سے زیادہ شفا بخش مشروب اس گھر میں بنتا ہے جو شہد کی مکھی کا گھر ہے۔ سب سے خوب صورت، سب سے زیادہ آرگنائزڈ۔ لیکن آف کورس۔" اس نے شانے اچکائے۔ "یہ تو ماسیوں، کم ذہن ہاؤس وائف والے فضول کام ہیں، سو تم اپنی شفا کتابوں اور پینٹنگز اور کمپیوٹرز میں ڈھونڈو... ویسے بھی کل صداقت پلس فیملی آجائے گا واپس، سو... تم پریشان نہیں ہو اور جا کر سو جاؤ!" کسی بھی ناراضی کے بغیر وہ اب مصروف سی دودھ کیتلی میں انڈیل رہی تھی۔

حنین ایک دم بالکل متحیر اور ساکت کھڑی رہ گئی۔

زمر اسے چھوڑ کر چائے بنا کر اوپر آئی۔ اسامہ، ندرت والے کمرے میں ٹیب لیے بیٹھا کوئی گیم کھیل رہا تھا (اس کا چارجر صرف اس کمرے کے سوئچ

میں چلتا تھا) سو وہ اب اکیلی 'بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کمبل میں لپٹی 'گھٹنوں پہ فائل رکھے' چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ کپ ابھی آدھا ہوا تھا کہ موبائل بجا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ غیر شناسا نمبر۔ کان سے لگا کر مصروف اور محتاط سا "ہیلو؟" کہا۔

"السلام علیکم مسز زمر!" وہ مسکرا کر خوشگوار سے انداز میں بولا تھا تو زمر نے بے اختیار مگ سائیڈ پہ رکھا اور سیدھی ہوئی۔ بھوری آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"ڈونٹ ٹیل می تم جیل توڑ کر فرار ہو گئے ہو۔ اور اگر نہیں تو سیل فون کہاں سے ملا؟"

"ڈونٹ ٹیل می کہ تمہیں نہیں پتا' یہاں کیا کیا مل جاتا ہے۔" وہ رات کے اس پہر ایک تنہا کوٹھڑی میں سلاخوں پہ ایک ہاتھ رکھے کھڑا' دوسرے سے موبائل کان سے لگائے' مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ قدرے فاصلے پہ محتاط سا پولیس اہلکار ادھر ادھر دیکھتا پہرہ' دے رہا تھا۔

"اچھا' اور کیا مل جاتا ہے؟" اس نے مسکرا کر فائل پرے رکھی اور ایک انگلی پہ عادتاً" گھنگھریالی لٹ لپیٹتے گویا ہوئی۔

"تم سن کر جیلس ہو گی۔"

"آہ! میرا اسٹینڈرڈ اتنا نہیں گرا کہ میں جیل میں خفیہ طور پہ لائی جانے والی لڑکیوں سے جیلس ہوں۔ ویسے کوئی خاص کام تھا کیا جو تم اپنی کسی دوست کو چھوڑ کر مجھے فون کر رہے ہو؟"

"استغفراللہ۔ مذاق کر رہا تھا۔" وہ خفا ہوا۔

"میں سیریس تھی!" لٹ انگلی پہ لپیٹتے اس نے شانے اچکائے۔

"اچھا کام تو کوئی نہیں تھا۔ یونہی خیریت پوچھنا چاہ رہا تھا۔"

"ہم ٹھیک ہیں' مزے میں ہیں۔" پھر وہ ذرا اداس ہوئی۔ "سعدی نہیں ہے بس!"

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ "ایک زمانے میں 'میں اسی طرح سعدی کو کال کیا کرتا تھا۔" وہ کچھ یاد کر کے اداسی سے مسکرایا۔

"تم ہمیشہ سے ایک دو نمبر انسان تھے۔"

وہ ہلکے سے ہنسا۔ زمر کچھ کہنے لگی تھی مگر کھٹکا ہوا۔ وہ چونکی۔ کھڑکی کے باہر بالکونی کی بتی جل رہی تھی' وہاں کوئی سایہ سا تھا۔

"آ..." وہ گردن اونچی کر کے دیکھنے لگی۔ فارس بھی ٹھٹکا۔ "کیا ہوا؟"

"بالکونی میں کوئی ہے۔" وہ ذرا آگے کو ہوئی تو دیکھا' وہ ہاشم کا کتا تھا جو غالباً" بالکونی کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں آ بیٹھا تھا۔ وہ پرسکون سی ہو کر واپس ٹیک لگاتی بتانے ہی لگی تھی کہ...

"کیا مطلب؟ کون ہے باہر؟ تم اکیلی ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟" وہ ایک دم اتنی تیزی اور پریشانی سے بولا تھا کہ زمر کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ مسکراہٹ دبائے ذرا دیر کو رکی۔

"ہاں... میں اکیلی ہی ہوں... لیکن معلوم نہیں کون ہے۔ کوئی سایہ ہی ہے..."

"کدھر ہے؟ تمہیں وہ نظر آ رہا ہے؟ کھڑکی بند ہے؟"

"ہاں... اب نظر آ رہا ہے۔" رک رک کر فکر مندی سے بتانے لگی۔ "لمبا سا' سانولا سا۔ کلرڈ آنکھیں ہیں۔"

"کھڑکی بند ہے؟" وہ تیزی سے بولا تھا۔

اس نے کھڑکی کی بند کنڈی کو دیکھا۔ "نہیں تو۔" اسی فکر مندی سے سر ہلایا۔

"رات کے اس وقت کھڑکیاں 'دروازے کھول کر بیٹھے ہو تم لوگ؟"

کتا اب شیشے پہ پنجے مارنے لگا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار لگتا تھا۔

"فارس... اب وہ کھڑکی پہ کچھ مار رہا ہے۔"

اور جیل میں قید فارس غازی کو ایک دم سر چکراتا محسوس ہوا تھا۔ غصہ 'بے بسی۔ اس کا دماغ سنسنا اٹھا تھا۔ "تم فوراً" اس کمرے سے نکلو' اور نیچے اپنے ابو کے کمرے میں جاؤ۔ حنین 'اسامہ کو بھی وہیں بلاؤ اور کمرہ لاک کر لو' فوراً"۔ پھر پولیس کو کال کرو' بلکہ میں ایک نمبر دیتا ہوں' ادھر کال کرو۔ اور ہاں... دراز میں

میری گن ہو گی' اسے نکالو۔ زمر! تم میری بات سن رہی ہو۔" وہ اتنا پریشان تھا اور وہ کچھ بول ہی نہیں رہی تھی۔

"میں نہیں باہر جا رہی' میں کوئی ڈرتی تھوڑی ہوں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر آواز کو سنجیدہ رکھے بولی۔

"زمر! میں کہہ رہا ہوں' کمرے سے نکلو!" وہ غصے سے بولا تھا۔ باہر کھڑے اہلکار نے اسے اشارہ کیا' مگر اس وقت وہ کچھ اور نہیں سن پا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو کارداروں کے اتنا قریب چھوڑ آیا تھا... وہ کیا کرے؟

"میں کیوں نکلوں؟ میں یہی سب کچھ ڈیزرو کرتی ہوں نا۔ تم نے کہا تھا نا اس رات ریسٹورنٹ میں... کہ تم مجھے اس طرح دیکھنا چاہتے ہو... اور۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں اس رات پہ اور..." وہ دبا دبا سا چلایا تھا مگر اسی لمحے اسامہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایک دم حیرت سے بولا۔ "پھپھو... یہ ہاشم بھائی کا کتا۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

زمر نے گڑبڑا کر اس کو دیکھا اور پھر فون کو۔ دوسری طرف وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوا تھا۔ (اف) زمر نے آنکھیں میچ لیں۔

"سیم کیا کہہ رہا ہے؟" وہ ذرا رک کر بولا۔

"پپ... پتا نہیں۔" وہ خفت سے بولی اور ساتھ ہی غصے اور خفگی سے اسامہ کو گھورا۔

فارس نے ایک طویل سانس کھینچی۔ تنے اعصاب ڈھیلے کیے۔

"باہر... کتا ہے؟ صرف کتا؟" ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ اسامہ!" فون غصے سے اس کی طرف بڑھایا۔ "ماموں کا فون ہے۔ بات کرو۔"

"ہیں سچی؟" وہ خوشی سے آگے بڑھا' پھر فون لیتے ہوئے زمر کے تاثرات دیکھ کر مسکراہٹ سمٹی۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ خفگی سے کچھ بڑبڑا کر کمبل تانے لیٹ گئی۔ اسامہ نے حیرت سے فون کان سے لگایا۔

"ماموں؟"

"ذرا اپنی پھپھو کو فون دو!" اسے شدید تاؤ آیا تھا۔

اتنی آواز تو زمر کو بھی سنائی دی تھی' جب ہی کروٹ لیے بولی۔ "میں سو گئی ہوں۔"

"وہ کہہ رہی ہیں' وہ سو گئی ہیں۔" اس نے اطلاع دی پھر پرجوش سا باتیں کرنے لگا۔ "آپ کیسے ہیں؟ ہم آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔ حنہ... حنہ..." ساتھ ہی آواز دیتا ہوا نیچے بھاگا تھا۔

"اف۔" آنکھیں موندے وہ سخت خفا تھی۔

فون کس کس نے سنا' کب بند ہوا' کچھ معلوم نہیں۔ حنین اس کے ساتھ آ کر لیٹی تو اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ حنہ اداسی سے بند فون اس کے ساتھ رکھ رہی تھی۔

"سوری' میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔" وہ چت لیٹی آزردگی سے چھت کو دیکھتے کہہ رہی تھی۔ "ایسے موقعوں پہ بھائی بہت یاد آتا ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ایسے آسان لفظوں میں میرے ہر مسئلے کا حل بتا کر مجھے پرسکون کر دیتا۔ پتا ہے۔" ہلکا سا ہنسی۔

"کبھی کبھی کہتا تھا' حنہ! کبھی مجھے بہت سا وقت ملے تو میں ایک کتاب لکھوں گا قرآن پہ۔ میں نے پوچھا' تفسیر لکھو گے؟ کہتا' میں کیسے تفسیر لکھ سکتا ہوں؟ بہت تفاسیر موجود ہیں پہلے سے ہی۔ میں صرف قرآن پہ غور و فکر کر کے آیات سے ملنے والے اسباق کو لکھنا چاہوں گا کہ میں نے اس آیت سے کیا سیکھا' کیا سمجھا۔ میں اسے ڈراتی تھی کہ بھائی' فتوے لگ جائیں گے' لوگ کہیں گے آپ کو قرآن پہ کچھ لکھنے کی اجازت کس نے دی؟ اہلیت کیا ہے آپ کی۔ تو وہ ہنس کر کہتا' ان لوگوں سے کہنا حنہ' مجھے نہ ان کی اجازت کی ضرورت ہے' نہ مجھے ان کے فتووں سے فرق پڑتا ہے۔ مجھے قرآن پہ غور و فکر کرنے کا حق اللہ نے دیا ہے' مجھے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تاکید اللہ نے کی ہے۔ کوئی پیر' کوئی عالم' کوئی پروفیسر مجھ سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ میں اہل قرآن ہوں۔ ہم اللہ کا کنبہ ہیں۔ ہم تو بھئی ڈنکے کی چوٹ پہ قرآن عام لوگوں تک' عام ہاتھوں تک پھیلائیں گے عام اور سادہ زبان میں۔ ہاں جس دن ہمارے اونچی دستاروں والے

اور لمبے لمبے ناموں والے معزز علماء کرام' جس دن وہ گاڑھی اردو اور مشکل اصطلاحات میں بیان دینا اور کتابیں لکھنا چھوڑ دیں گے' اس دن میرے کچھ بھی لکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جس نے مجھے سکھایا ہے' مجھے اس علم کا حق ادا کرنا ہے' نہیں تو میری پوچھ دوسروں سے زیادہ ہو گی۔"

"تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو؟"

"کیونکہ جب ہم چھوٹے تھے تو سنتے تھے' حافظ قرآن کے والدین کے سر پہ قیامت کے دن سونے کا تاج پہنایا جائے گا۔ بات یہ ہے زمر' کہ اس تاج کے لیے ہم اپنے بچوں کو قرآن تو یاد کروا دیتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ تاج بہت بھاری ہے۔"

"حنین..." اس کا دل دکھا' ایک دم اٹھنے لگی مگر حنہ نے کروٹ بدل لی۔

"ابھی مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے فی الحال مدد کی ضرورت ہے' مگر نہ آپ سے' نہ بھائی سے' نہ ہی کتاب والے شیخ سے۔ مجھے ان کی مدد چاہیے جنہوں نے میرے سر پہ یہ تاج رکھا تھا۔ مجھے ان کو ڈھونڈنا ہے۔" کروٹ لیے' اس کی آواز نم ہو گئی۔ زمر خاموشی سے واپس لیٹ گئی۔

اور دور... سمندر پار... کمرہ بحث میں زنجیروں میں جکڑے قیدی کے سامنے' رئیس پنجوں کے بل بیٹھا چند تصاویر زمین پہ رکھ رہا تھا۔

"یہ تمہارا بیٹا ہے' اور یہ تمہاری بیوی اور ماں۔ ان کو خاور صرف ای میل کر کے ایک نامعلوم مقام پہ ایک نامعلوم گھر میں شفٹ ہونے کے لیے کہتا ہے اور کل وہ شفٹ ہو بھی گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہیں' سوائے ہاشم کاردار کے۔ تم ان کی خیریت چاہتے ہو تو اعتراف جرم کر لو' ورنہ ہم سے اب کچھ بعید نہیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور خاور خاموش مگر سرخ انگارہ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں جان بوجھ کر انجان بن رہا ہوں اگر معاملات میں مجھ سے نہ ہوشیاری کر!

کمرہ ملاقات خالی تھا سوائے اس وجیہہ اور مصروف ملاقاتی کے جو میز کے پار بیٹھا' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' بار بار کلائی پہ بندھی قیمتی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پورے کمرے میں اس کے پرفیوم کی مہک رچ بس گئی تھی۔

فارس غازی چوکھٹ پہ نمودار ہوا' تو بے زار بیٹھے ہاشم نے نگاہیں اٹھائیں' پھر خود بھی کھڑا ہوا۔ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "ہیلو فارس!"

"تمہارا شکریہ کہ تمہیں بالآخر میرا پیغام مل گیا۔" وہ ازلی بے نیاز انداز میں کہتا اس سے ہاتھ ملا کر کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ہاشم بھی کوٹ کا بٹن کھولتے ہوئے سامنے بیٹھا۔

"ہاں' میں مصروف تھا۔ زمر سے تمہاری خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔" ذرا توقف کیا۔ "سوری۔ پہلے نہیں آسکا۔" ہلکے سے ابرو اچکائے۔ فارس نے جواباً" ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ ملایا۔

"میں نے خاور کو دو تین دفعہ پیغام بھجوایا تھا' کوئی دو ماہ پہلے' مسئلے کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا تھا' کیا اس نے نہیں بتایا؟" دونوں ہاتھ میز پہ رکھے' آگے ہو کر بیٹھتے' فارس نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

ہاشم اس کے برعکس ٹیک لگا کر' ایک بازو کرسی کی پشت پہ پھیلائے بیٹھا تھا' ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "اس نے بتایا تھا' میرے ہی ذہن سے نکل گیا۔ کہو کیا بات تھی؟ کوئی فنانشل پرابلم..."

"اونہوں۔" وہ رکا۔ پھر ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "دو ماہ پہلے... عدالت میں... میرے پاس الیاس فاطمی آیا تھا۔"

"کون الیاس فاطمی؟" ہاشم نے لاعلمی سے ابرو اٹھایا۔ البتہ فارس نے دیکھا' کرسی کی پشت پہ پھیلے اس کے ہاتھ کی انگلیاں اندر کو مڑیں۔ یعنی کہ وہ چونکا تھا مگر چہرے سے ظاہر نہیں تھا۔

"وارث کا باس۔ جس پہ مجھے شک تھا کہ اس نے وارث کو مروایا ہے۔"

"اوہ یس یس! فاطمی۔ نیب ڈائریکٹر۔ آئی سی۔ تو

کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟" عام سے لہجے میں سوال کیا۔
"ہاں۔ کچھ دیر کے لیے۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ میں باری باری اپنے ہر دشمن سے انتقام لے رہا ہوں۔ سو وہ نہیں چاہتا کہ اس کی باری بھی آئے۔"
"اسے اچانک تم سے خوف کیوں محسوس ہونے لگا ہے؟"
"ہاشم!" وہ قدرے قریب ہوا۔ "میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا' نہ تم مجھے پسند کرتے ہو' مگر چونکہ یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے' تو تمہیں بھی بتا دیتا ہوں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "ڈاکٹر ایمن میری سائیکاٹرسٹ تھی' اس نے کورٹ میں میرے خلاف گواہی دی تھی۔ میں نے اس کا ہاسپٹل جلا دیا۔"
ہاشم نے ابرو اٹھایا اور کرسی کی پشت سے بازو ہٹا کر قدرے آگے کو ہوا۔ چہرے پہ حیرت بھری مسکراہٹ ابھری۔ "ڈونٹ ٹیل می!"
"لیکن جسٹس سکندر کی ویڈیو میں نے لیک نہیں کی تھی۔ میرا اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے' اس نے مجھے بری کیا تھا۔ مگر فاطمی کا خیال ہے کہ میں اس کے پیچھے بھی آؤں گا' اس لیے وہ مجھ سے تعاون کرنا چاہتا تھا' تاکہ میں اس کو اور اس کے خاندان کو چھوڑ دوں۔"
"کیسا تعاون؟"
"اس نے کہا' وہ مجھے اس شخص کا نام بتانے کو تیار ہے جس کے ہاتھوں اس نے وارث غازی کا سودا کیا تھا۔"
"ویری گڈ۔ تمہیں اس سے معلومات لینی چاہیے تھیں۔" ہاشم نے خوشی کا اظہار کیا۔
"اس نے تمہارا نام لیا۔ کہا کہ تم نے مروایا ہے وارث کو۔" وہ اسی بے نیازی سے ہاشم کو دیکھتے ہوئے بولا۔
ہاشم کی انگلیاں زور سے اندر کو مڑیں' مگر چہرے پہ تاثرات ویسے ہی رہے۔ پہلے اس نے دونوں ابرو اٹھائے اور پھر ایک دم ہنس پڑا۔ "لائیک سیریسلی؟"
"رکو' ابھی کہانی باقی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ تم اور مسز جواہرات منی لانڈرنگ کر رہے تھے۔ پشاور میں کسی دہشت گرد گروپ کے لیے۔ کوئی میٹنگز وغیرہ تھیں' ان کا ریکارڈ وارث غازی کو مل گیا تھا۔"
ہاشم نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "او کے او کے' تو میں منی لانڈرر کے ساتھ قاتل بھی ہوں۔ سو۔۔۔ یہ گفتگو کس طرف جا رہی ہے؟ مطلب سیریسلی۔۔۔ تمہیں یقین آ گیا؟"
فارس ایک دم بے زار ہوا۔
"اگر مجھے یقین آیا ہوتا تو کیا میں یہاں بیٹھا تمہیں یہ سب بتا رہا ہوتا؟"
"تو تمہیں یقین کیوں نہیں آیا؟ ہو سکتا ہے' وہ سچ بول رہا ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے محظوظ لگ رہا تھا۔
"کیونکہ میں عرصہ پہلے نیب کے وہ سارے ریفرنسز چیک کر چکا ہوں جو تمہارے خلاف دائر تھے' وہ سب کرپشن کیسز تھے اور مجھے یقین ہے تم ان سب میں ملوث ہو (ہاشم نے مسکرا کر اثبات میں سر کو خم دیا) مگر وہاں منی لانڈرنگ کا کوئی کیس نہیں تھا۔ دوسری بات' وہ مجھ سے تعاون نہیں کرنا چاہتا تھا' وہ مجھے اپنے ہی خاندان سے لڑوا کر کمزور کرنا چاہتا تھا۔ دیکھو میرے تمہارے بہت جھگڑے ہوں گے' مگر ہم ایک خاندان ہیں۔ اس لیے تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔"
"شیور۔ بتاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ اب اپنائیت سے کہتا آگے کو ہوا۔
"الیاس فاطمی کا ایک بھائی ہے' وہ کسٹم میں ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہی وارث کا قاتل ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ تم اس کو چیک کرو۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے' فاطمی جانے سے پہلے اپنے بھائی کو بچانے کے لیے مجھے کسی دوسری طرف لگانا چاہتا ہے۔"
"جانے سے پہلے؟" پہلی دفعہ ہاشم کے ابرو حقیقی حیرت سے بھنچے۔
"ہاں' اس نے کچھ کہا تھا جانے کے بارے میں۔ وہ اپنی بیٹی کو یا شاید فیملی کو باہر سیٹل کر رہا ہے۔ اسے دیکھ

کر میرا خون اتنا ابل رہا تھا کہ اس کی آدھی بات میں نے دھیان سے سنی ہی نہیں۔" سر جھٹک کر وہ جیسے پھر سے غصے میں آنے لگا تھا۔

"اوکے ریلیکس۔ میں تحقیق کروانے کی کوشش کرتا ہوں' مگر مجھے یا تمہیں فاطمی جیسے لوگوں کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے الزامات سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟"

شانے اچکا کر وہ اسی طرح کی چند مزید نرم سی باتیں کرکے اٹھ کھڑا ہوا تھا البتہ جب وہ جانے کے لیے مڑا تو اس کی آنکھوں میں شدید سختی در آئی تھی اور انگلیاں زور سے اندر کو بھنچی ہوئی تھیں۔

اس کے جاتے ہی زمر اندر آئی تھی۔ حیران ' متعجب 'مشکوک۔

"آج تو تم سے ملاقات ناممکن ہو گئی تھی۔" اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔

"یہ ہاشم کیوں آیا تھا تم سے ملنے؟"

"میں نے بلایا تھا۔"

"کیوں؟ کیا بات کرنی تھی؟" زمر نے پتلیاں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"یہی کہ اس کا کتا بہت آوارہ ہوتا جا رہا ہے' اور وہ میری طرف.... ہماری طرف آگیا تھا۔ اسے اتنا کہا ہے کہ اپنے کتے کا خیال رکھے۔"

زمر نے ڈھٹائی سے شانے اچکائے۔ "کتا ہی تھا' آ گیا تو کیا ہوا؟ اتنی سی بات کے لیے اسے کیوں بلایا؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "کیونکہ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہماری طرف آیا ہے' مگر وہ اس کا پالتو کتا ہے زمر' وہ اسے جلد یا بدیر ضرور بتائے گا ہر بات۔ سو میں نے سوچا کہ میں پہلے بتا دوں۔"

زمر مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "مجھے تمہاری بات پہ یقین کیوں نہیں آ رہا؟"

"اوہ کم آن!" وہ حیران ہوا۔ "تم نے خود ہی تو کہا تھا کچھ نہ کرو' شریف بن کر رہو' تو میں اسی لیے آرام سے بیٹھا ہوں' کچھ بھی نہیں کر رہا۔" بہت ہی سادگی سے اپنے خالی ہاتھ دکھائے۔

زمر نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ وہ واقعی شرافت اور سادگی کے ساتھ آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ واقعی کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اس کو فارس پہ اعتبار کرنا چاہیے۔



جو ہو سکے تو محبت کی پاسداری کر
مرا جو رنگ ہے اس میں قبول کر مجھ کو

پرنم فضاؤں کی سرزمین پہ وہ تہہ خانے میں بنے کمرے خاموش تھے۔ سعدی یوسف اپنی اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا' قرآن کھولے' ساتھ جرنل پہ قلم سے کچھ لکھے جا رہا تھا۔ اب وہ پڑھتے ہوئے ساتھ میں لکھتا بھی تھا۔ یہاں وقت ہی وقت تھا' فراغت ہی فراغت تھی۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی ' دھتکارے ہوئے شیطان سے۔" تعوذ پڑھ کر اس نے مطلوبہ جگہ سے النمل کھولی اور گردن ترچھی کرکے بیٹھا' آیات صفحے پہ اتارنے لگا۔ سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس وہ لکھتے ہوئے بہت منہمک اور مصروف دکھائی دیتا تھا۔

"اور بے شک ہم نے بھیجا قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو۔ کہ اللہ کی عبادت کرو پھر بھی وہ دو فریق بن کر آپس میں لڑنے لگے۔"

قلم لبوں میں دبائے' چند لمحوں کو اس نے سوچا' پھر تیز تیز قلم صفحے پہ چلانے لگا۔

"جب کوئی ہمارے پاس اللہ کی بات لے کر آتا ہے تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ ہم اس سے جھگڑنا کیوں شروع کر دیتے ہیں؟ ہم فوراً" اس کا فرقہ' اس کا عقیدہ' اس کا خاندان' اس سب کو زیر بحث کیوں لے آتے ہیں؟ نہیں ماننی بات' نہ مانو۔ مگر ہم ایسی قوم کیوں بنتے جا رہے ہیں جو برائی پھیلانے والوں کو تو ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھ کر دیکھتی ہے' مگر نیکی کا حکم دینے والوں پہ فوراً" فتوے لگا دیتی ہے؟ اور میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ قوم ثمود' قوم عاد اور قوم لوط.... بار بار ان کا ذکر کیوں آ جاتا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ان

کے ناموں اور ان پہ اترے عذابوں کو مکس اپ کر جاتا ہوں۔ یہ پورا قرآن پڑھ کر بھی مجھے یاد نہیں ہو پائے۔ ان کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔"

لحظے بھر کو رک کر اس نے پھر سے وہی آیت پڑھی۔ ذہن میں آگہی کے کتنے ہی در کھلنے لگے۔ معانی منکشف ہونے لگے۔

"اللہ تعالیٰ آپ نے فرمایا' کہ ہم نے ثمود کی طرف 'ان کے بھائی' کو بھیجا۔ ثمود کے لوگوں کا بھائی صالح! یعنی اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے پاس ان کے جیسے ہی کسی بندے کو بھیجتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس سے اپنائیت محسوس کر سکیں' مگر نہیں' ہمیں تو مبلغ کے نام پہ فرشتہ چاہیے ہوتا ہے۔ پہلے زمانوں کے لوگ بھی یہی کہتے تھے کہ اللہ نے فرشتہ کیوں نہیں اتارا؟ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ اس عالم' اس مبلغ میں فرشتوں والی خصوصیات کیوں نہیں ہیں؟" پھر سر جھٹک کر اگلی آیت پڑھی۔

"کہا (صالح) نے' اے میری قوم' کیوں تم برائی کو بھلائی سے پہلے مانگنے میں جلدی کر رہے ہو؟ کیوں نہیں تم اللہ سے استغفار کرتے تاکہ تم پہ رحم کیا جائے؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر اسی طرح لکھنے لگا۔

"اللہ تعالیٰ۔ مجھے اس آیت کو پڑھ کر ہمیشہ یہ لگا ہے کہ انسان اپنی دعاؤں سے پہچانا جاتا ہے۔ بے اختیاری میں منہ سے نکلی دعائیں اندر کی کشمکش کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں لوگ فوراً "قیامت مانگ لیتے تھے" کہ بھئی نازل کرو فرشتہ اور برابر کرو حساب۔ آج کل کے لوگ خود ہی خدا بن کر سارے حساب کتاب پورے کر دیتے ہیں۔ مبلغ کو بھی کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خود ہی جج' جیوری' اور جلاد بن کر دین والوں کا فیصلہ سنا دیں۔ اطاعت نہ کرنے کے بھی کتنے بہانے ہیں انسانوں کے پاس!"

ذرا دیر کو قلم والا ہاتھ روکا۔ درمیانی انگلی کے اوپر پور— میں درد سا ہونے لگا تھا۔ writer's ache! لکھنا کتنا مشکل کام تھا! چند لمحے کے آرام کے بعد آگے پڑھنے لگا۔

"ان لوگوں نے کہا' ہم برا شگون لیتے ہیں تم سے اور ان سے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کہا (صالح نے) تمہارا شگون اللہ کے پاس ہے' بلکہ تم ایک گروہ ہو جو آزمائے جا رہے ہو۔"

"عربی کتنی دلچسپ زبان ہے اللہ تعالیٰ۔" وہ مسکراتے ہوئے تیز تیز قلم چلا رہا تھا "شگون کے لیے طائر کا لفظ استعمال کیا گیا۔ طائر کہتے ہیں پرندے کو۔ اہل عرب پرندوں سے فال لیا کرتے تھے۔ سو ثمود والے صالح علیہ السلام کو یہ بتا رہے ہیں کہ ہمیں تو تم سے "بری فیلنگ" آتی ہے اور تمہارے ساتھ والے مومنین سے بھی۔ یہ انسان کی ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ جب آپ کو کسی کی بات نہیں ماننی' تو اس کو اور اس کے ساتھ موجود تمام ہم خیال لوگوں کو لیبل کر دو۔ ان کو کوئی بھی نام دے دو۔ سیکیولر' ماڈرن قسم کے لوگ ایسے مبلغین کو "قدامت پسند' دقیانوسی' شدت پسند" کہتے ہیں۔ اور دین والے جن کی عادت ہوتی ہے

دوسرے دین والوں کی ٹانگ کھینچنا' وہ ان کو "کم علم 'کم عقل 'گناہگار' ناپاک" اور ایسے ہر اس لقب سے پکارتے ہیں جن میں کہنے والے کی پاکیزگی کی نمائش ہو اور بے چارے مبلغ کی تذلیل ہو۔ بہانے۔ سب بہانے ہیں۔ کہ بس کسی طرح حق بات ماننے سے بچ جاؤ۔ اس وقت ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ تو محض ایک آزمائش ہے۔ ہم خدا نہیں ہیں 'پھر خدا کی طرح لوگوں کو جج کیوں کرنے لگتے ہیں؟ ہم خود فرشتے نہیں ہیں' پھر فرشتوں کی طرح لوگوں کے گناہوں اور خامیوں کا حساب کتاب کیوں رکھتے ہیں؟"

سفید صفحہ دھیرے دھیرے بھر رہا تھا۔ اسے لگا 'آج وہ تلخ باتیں سوچ رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ خاور ٹھیک کہتا تھا۔ وہ اپنی معصومیت کھوتا جا رہا تھا۔

ادھر قرآن فرما رہا تھا۔

"اور شہر میں نو سردار تھے۔ وہ فساد کرتے تھے زمین میں اور نہیں کرتے تھے وہ اصلاح۔ کہا انہوں نے' کھاؤ قسم اللہ کی' البتہ ہم ضرور رات کو اس (صالح) کے اور اس کے گھر والوں پہ حملہ کریں گے اور پھر بعد میں ہم اس کے وارثوں سے کہیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اور بے شک ہم ہی سچے ہیں۔"

"نو سردار؟ سبحان اللہ۔" وہ مسکرا کر لکھنے لگا۔ "مکہ میں بھی نو بڑے قبائل تھے اور اسی طرح انہوں نے بھی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چال چلی تھی کہ رات کو ہم وہ ناپاک کام کرلیں گے اور صبح معصوم بن جائیں گے۔

آج کل کے مبلغین کے لیے بھی لوگ چالیں چلا کرتے ہیں 'مگر لوگوں کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ "فساد" پھیلانے والے وہی ہوتے ہیں جو خود کسی کی اصلاح نہیں کرسکتے۔

خیر' دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ' کہ وہ بھی آپ کے نام کی قسم اٹھا رہے تھے۔ آج بھی لوگ آپ کا نام لے کر' جہاد کا نام لے کر' بے گناہ مسلمانوں اور بے گناہ غیر مسلموں کا قتل عام کرتے ہیں۔ اور دنیا بھر کا میڈیا کہتا ہے' یہ مسلمان ہیں۔ اگر اللہ کا نام لینے سے کوئی مسلمان ہو جاتا تو صالح علیہ السلام کے دشمن کیوں مسلمان نہ تھے؟ ایسے ہی نہیں ہو جاتا کوئی مسلمان۔

'یہ نام مسلمان ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے رکھا تھا' اور اس کو "پانے" کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کے لیے لڑنے والے اور اللہ کا نام لے کر اپنے مذموم مقاصد کے لیے لڑنے والے برابر نہیں ہوتے۔"

الفاظ جگمگاتے ہیروں کی طرح دودھیا کاغذ پہ بکھرے تھے اور وہ دھیرے دھیرے گویا مزید نگینے پرو رہا تھا۔

"اور انہوں نے ایک چال چلی۔ اور ہم نے کی ایک تدبیر۔ اور وہ شعور نہیں رکھتے تھے' پس دیکھو کس طرح انجام ہوا ان کی چال کا۔ بے شک ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو' اور ان کی قوم کو' سب کے سب کو!"

"استغفر اللہ!" اس نے جھرجھری لی اور پھر لکھنے لگا

"اور انبیاء ایسے لوگوں کی چالوں سے نہیں ڈرا کرتے کیوں کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر اس چیز سے بڑا ہے جس سے انسان خوف کھاتا ہے۔ جبریل علیہ السلام کی ایک چیخ آئی' اور پھر زلزلہ آیا۔ اور وہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔"

لکھتے ہوئے اس نے قرآن کے جگمگاتے مگر اداس کر دینے والے ان حروف کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"تو یہ ہیں ان کے گھر۔ جو ان کے ظلم کی وجہ سے اجڑے پڑے ہیں۔ یقیناً" اس میں ایک نشانی ہے اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو (گناہوں سے) بچتے رہے۔"

سعدی نے چند لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ایک دم قلم خالی ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح بند آنکھوں کے

ساتھ لبوں سے بڑبڑانے لگا۔

"وہ علاقے.... وہ تباہ حال بستیاں آج بھی زمین پہ موجود ہیں.... ثمود اور عاد کے علاقے... بالکل بنجر اور ویران۔ کتنی ہی دفعہ سائنس دان ان علاقوں کی مٹی اٹھا کر اپنی لیب میں لے کر آئے کہ ایسا کیا ہے اس مٹی میں جو یہ مردہ ہے' یہاں کوئی چیز نہیں اگتی؟ مگر ہوا کیا۔ اس مٹی سے تابکار شعاعیں نکلتی ہیں۔ اس پہ تجربہ کرنے والے سائنس دان' لیب میں کام کرنے والے ملازم تک کینسر کا شکار ہو گئے۔ جس بھی جگہ وہ مٹی رکھی جاتی' وہ اس جگہ کو گلانے اور جلانے لگتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں' وہ مٹی زہریلی ہے' میں کہتا ہوں' یہ گناہ تھے' جو انسان کو ہی نہیں اس کے خاندان' اس کے ملک حتیٰ کہ اس کی مٹی کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ مگر ہم لوگ عبرت نہیں پکڑتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے فرمایا کرتے تھے کہ ان علاقوں سے تیزی سے گزر جایا کرو' یا پھر روتے ہوئے گزرا کرو' مگر ہم لوگ... ہم جاہل لوگ موئن جوڈارو اور ہڑپہ جا کر اسکول ٹرپ کے ساتھ پکنک مناتے ہیں! تباہ حال بستیوں اور کھنڈرات' چاہے ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو' ان پر سے ویسے گزرنا چاہیے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ ان پہ تحقیق کرنا' ان کو اسٹڈی کرنا الگ بات ہے' مگر سیر اور پکنک کے لیے ان جگہوں پہ جانا.... مسلمانوں کو اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنے ہولناک کام کتنی آسانی سے کر جاتے ہیں۔"

اور جس وقت وہ ساری دنیا سے بے نیاز لکھے جا رہا تھا' اس سے سینکڑوں ہزاروں میل دور' اپنے آفس میں مرکزی سیٹ پہ بیٹھی جواہرات' مسکرا کر سامنے کھڑے حبشی صورت اور براق سفید دانتوں والے فصیح (ہارون عبید کے ملازم خاص) کو دیکھ رہی تھی جو ہاتھ باندھے کھڑا اطلاع دے رہا تھا۔

"آپ کے کہنے پہ ہم نے سعدی یوسف کو کرنل خاور سے ملاقات کی اجازت دے دی ہے۔ ہارون صاحب' میرے اور آپ کے درمیان ہی رہے گی یہ بات۔"

"گڈ!" وہ پورے دل سے مسکرائی۔ گھومنے والی کرسی کو ذرا سا گھمایا۔

"خاور کی زنجیریں کھول دو' اسے سعدی کے ساتھ گھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لیے بے کار ہیں' میرا بیٹا یہ بات نہیں سمجھ رہا' اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ یہ میرا تجربہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔"

"یس میم!" اس نے سر کو خم دیا۔ "ہم ان کی باتیں تو نہیں سن سکتے لیکن وہ یہی پلان کر رہے ہوں گے۔"

"مگر ہو سکتا ہے فصیح کہ کسی دن خاور' سعدی کو قتل کر دے اور پھر خود کشی کر لے۔"

فصیح کے ابرو تعجب سے بھنچے۔ "مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

"تم کرو گے فصیح!" وہ میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کر اٹھی اور شیرنی جیسی سفاک آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اور اتنی صفائی سے کرو گے ایک رات یہ سب کہ اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم تو اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خبر بھی نہیں ہو گی۔"

"یہ سب آپ لوگوں کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا' مگر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہہ رہی ہیں!" پلکیں جھکا کر اٹھاتے ہوئے اس نے تائید کی۔

اس کے جانے کے بعد جواہرات نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور مسکراتے ہوئے چھت پہ لٹکتے' جھلملاتے فانوس کو دیکھا۔

زندگی ایک دم کتنی خوب صورت لگنے لگی تھی۔

اس کا بھاری سر ہر بوجھ سے آزاد تھا!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عمیرہ احمد



آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

I۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی "اس نے اس بار بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال وجواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

پندرھویں قسط

"حمین! جاؤ بھائی کو بلا کے لاؤ' وہ سونے سے پہلے تم لوگوں کو دعا پڑھا دے۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں لگا دی اس نے۔"

بچوں کو پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہیں سونے کے لیے لیٹنے کا کہتے ہوئے امامہ کو جبریل یاد آیا۔ اسے کمرے سے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔

"آج میں پڑھاتا ہوں۔"

حمین نے اعلان کرتے ہی اپنے دونوں ہاتھ کسی نمازی کی طرح سینے پہ باندھتے ہوئے بڑے جذب کے عالم میں دعا پڑھنے کے لیے اپنا منہ کھولا اور امامہ نے تحکمانہ انداز میں فوری طور پر اسے ٹوکا۔

"حمین! بھائی پڑھائے گا۔"

حمین نے بند آنکھیں کھول لیں اور سینے پر بندھے ہاتھ بھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل جاتا' امامہ نے نائٹ سوٹ کے اس پاجامے پر لگی گرہ کو دیکھا جو وہ ابھی ابھی باتھ روم سے پہن کر باہر نکلا تھا۔ پاجامے کے اوپری حصے کو ازار بند کے بجائے ایک بڑی سی گرہ لگا کر کسا گیا تھا اور اس گرہ کے دونوں سرے کسی خرگوش کے کانوں کی طرح اس کے پیٹ کے اوپر کھڑے تھے۔

"ادھر آؤ۔" امامہ نے اسے بلایا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے جھک کر نیچے بیٹھتے ہوئے اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی' تاکہ پاجامے کو ٹھیک کر سکے۔

حمین نے ایک چیخ ماری اور جھٹکا کھا کر اس گرہ پر دونوں ہاتھ رکھے پیچھے ہٹا۔ "ممی! نہیں۔"

"اس کی string کہاں ہے؟" امامہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گرہ کو باندھنے کی وجہ کیا تھی۔

"میں نے اسکول میں کسی کو دے دی ہے؟"

امامہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں۔۔۔؟"

"چیریٹی میں۔۔۔" حمین نے جملہ مکمل کیا۔

امامہ نے ہکابکا ہو کر اپنے اس بیٹے کا اعتماد اور اطمینان دیکھا۔ "چیریٹی میں؟" وہ واقعی حیران تھی۔ "صرف ایک ڈوری کو؟"

"نہیں۔۔۔" مختصر جواب آیا۔

"پھر۔۔۔؟"

"ڈوری سے بیگ کو باندھا تھا۔"

"کس بیگ کو؟" امامہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"اس بیگ کو جس میں TOYS (کھلونے) تھے۔" جواب اب بھی پورا آیا تھا۔

"کس کے TOYS (ٹوائز)؟" امامہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

"Well" حمین نے اب ماں' رئیسہ اور عنایہ کو باری باری۔۔۔ محتاط انداز میں دیکھا اور اپنے جواب کو گول مول کرنے کی بہترین کوشش کی۔

"'There were many owners۔" (وہ کئی لوگوں کے تھے۔)

امامہ کو ایک لمحے میں سمجھ میں آیا تھا۔

"many owners کون تھے۔ کس کو دیے؟ کیوں دیے؟ کس سے اجازت لی؟"

اس نے یکے بعد دیگرے تابڑتوڑ سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔
یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حمین سکندر نے مہاتما بدھ بننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کے کھلونے دان کیے تھے اور اس کے بہن بھائیوں میں اگر بلا کا تحمل نہ ہوتا تو اس کے اس کارنامے پر ہر بار بلا کارن پڑتا۔
عنایہ کی آنکھیں اب آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ اس "چھوٹے بھائی" نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہ ان کی ہر چیز کو کسی بھی وقت مشنری جذبے کے تحت کسی کو بھی دے سکتا تھا۔
"ممی!" عنایہ بری طرح بلبلائی تھی۔
" charity is not a sin "(چیریٹی گناہ نہیں ہے۔)
حمین نے اپنی آنکھیں عادتاً گول کرتے ہوئے ان دو الفاظ کا ایک بار پھر استعمال کیا جو پچھلے کچھ دنوں سے بار بار اس کی گفتگو میں آرہے تھے۔ رئیسہ اس ساری گفتگو کے دوران اپنے بیڈ پر لیٹی ان دونوں کو خاموشی سے سن رہی تھی۔
"تم نے میرے کھلونے چرائے؟"
عنایہ کا بس چلتا تو وہ اس کو پیٹ ڈالتی۔ کم از کم رات کے اس پہر جب اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا کون کون سا کھلونا چیریٹی میں دے آیا تھا۔
"صبح بات کریں گے اس بارے میں۔ ابھی نہیں۔"
امامہ نے مداخلت کی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی صوفہ پر پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ سالار کی کال تھی۔
"حمین جا کر اپنے بیڈ پہ لیٹو۔ میں خود بلا لاتی ہوں جبریل کو۔"
امامہ نے صوفہ کی طرف جاتے ہوئے کمرے کے دروازے کی طرف جاتے حمین کو ٹوکا۔ وہ بے حد فرماں برداری سے واپس اپنے بیڈ کی طرف آگیا تھا۔
امامہ نے سیل فون پر سکندر عثمان کا نام چمکتے دیکھا اور کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
"سالار کہاں ہے؟" سکندر عثمان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہی عجیب اضطراب میں اس سے پوچھا تھا۔
"ایک ڈنر میں گئے ہیں۔ بس ابھی آنے ہی والے ہیں۔"
"میں اسے کال کر رہا تھا' وہ میری کال ریسیو نہیں کر رہا۔" امامہ کو ان کے لہجے میں عجیب سی پریشانی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔
"ہو سکتا ہے ڈنر میں آپ کی کال نہ لے پا رہے ہوں۔ وہ اکثر اپنا فون فنکشنز میں سائلنٹ کر دیتے ہیں۔ خیریت ہے نا پاپا۔" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
"تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی ہے؟"
سکندر عثمان حواس باختگی میں کہتے چلے گئے۔ انہیں کچھ دیر پہلے ان کے ایک قریبی عزیز نے اس حوالے سے فون کیا تھا۔
اس عزیز نے سالار کی بیماری کے حوالے سے یہ خبر کسی چینل پر دیکھی تھی اور پھر فوری طور پر افسوس کا اظہار کرنے کے لیے سکندر کو فون کیا تھا اور سکندر عثمان ان کے اظہار افسوس پر شاکڈ رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ یہ سالار کے بارے میں جو وہ کہہ رہے تھے' وہ ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد اگلے دس' پندرہ منٹوں میں انہیں اوپر

تلے کئی کالز آئی تھیں اور انہوں نے حواس باختگی کے عالم میں سالار کو کالز کرنا شروع کردی تھیں۔ جو اس نے ریسیو نہیں کیں۔

اس ڈنر میں بیٹھے سکندر عثمان کی کال آنے سے بہت پہلے سالار کو یہ پتا چل گیا تھا کہ میڈیا میں اس کی بیماری کی خبر بریک ہو چکی تھی۔ اس کے اسٹاف نے اسے اطلاع دی تھی اور ڈنر ٹیبل پر بیٹھا ہوا سالار سکتے میں آگیا تھا۔ اسے اس اسٹیج پر اس خبر کے آؤٹ ہونے کے مضمرات کا اندازہ چند ثانیوں میں ہوگیا تھا۔ وہ خبر صرف اس کے اسٹاف نے اس تک نہیں پہنچائی تھی۔ وہ جنگل کی آگ کی طرح اس ڈنر میں بیٹھے بہت سے اہم لوگوں کے علم میں آچکی تھی اور ان میں سے چند نے سالار سے اس سلسلے میں بات بھی کی لیکن سکندر عثمان کا نام اپنے فون پر چمکتا دیکھ کر سالار کی بھوک ختم ہوگئی تھی۔

اسے یقین تھا وہ کال کس مقصد کے لیے کی جارہی تھی لیکن وہ وہاں بیٹھ کر سکندر عثمان سے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں کرسکا۔ وہ بوجھ جس نے کئی مہینوں سے اسے دہرا کر رکھا تھا ایک دم ہی جیسے اور بہت سے لوگوں کی کمریں جھکا دینے والا تھا اور اگر سکندر عثمان کو یہ خبر مل چکی تھی تو امامہ۔۔۔؟

وہ آگے نہیں سوچ سکا تھا۔ وہ چند گھنٹے پہلے گھر سے نکلتے ہوئے گھر پر ایک بہت خوش و خرم خاندان چھوڑ کر آیا تھا۔ جو بھی لاوا تھا اس کے اندر تھا۔ کوئی دوسرا اس کی لپیٹ میں آکر خاکستر نہیں ہوا تھا اور اب۔۔۔ سالار سکندر کا فون ٹیکسٹ میسجز اور مسڈ کالز سے اٹ گیا تھا اور وہ اس ڈنر ٹیبل پر بیٹھے صرف اس نقصان کو کنٹرول کرنے کے طریقے سوچ رہا تھا جو اس خبر سے پہنچ سکتا تھا۔ اسے اگر یہ پتا ہوتا کہ امامہ اب تک بے خبر تھی اور سکندر عثمان کا فون اٹھا لینے کی صورت میں وہ اب بھی بے خبر ہی رہتی اور وہ واپسی پر اس خوش و خرم خاندان کو ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح دیکھ سکتا تو سالار سکندر اپنے باپ سے بات کرلیتا لیکن وہ اس وقت اس کبوتر کی طرح تھا جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا لیکن کون سی بلی کو دیکھ کر۔۔۔؟ یہ اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ جو سامنے نظر آرہی تھی یا جو آنکھیں بند کرنے پر نظر آنے لگتی تھی۔

"کیا نہیں بتایا پاپا؟ کیا چھپایا ہے آپ سے؟" امامہ کی سمجھ میں سکندر عثمان کی بات نہیں آئی تھی۔ اسے لگا اس نے شاید ان کی بات سننے اور سمجھنے میں کوئی غلطی کی تھی۔

"برین ٹیومر کے بارے میں۔" سکندر عثمان نے جیسے کراہتے ہوئے کہا تھا مگر اس کے باوجود وہ سالار کا نام نہیں لے سکے تھے۔ امامہ اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔

"برین ٹیومر؟ کس کے برین ٹیومر کے بارے میں؟" وہ الجھی اور وہ پہلا موقع تھا جب سکندر عثمان کو احساس ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح بے خبر تھی۔

"پاپا! آپ کس کے برین ٹیومر کی بات کررہے ہیں؟" امامہ نے ان کو خاموش پاکر ایک بار پھر پوچھا۔ جواب سکندر عثمان کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

"پاپا۔۔۔!" امامہ ان کے مسلسل خاموش رہنے پر ایک بار پھر اپنا سوال دہرانا چاہتی تھی مگر دہرا نہیں سکی۔ بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں اپنے ہی سوال کا جواب آیا تھا۔ سکندر عثمان کس کی بیماری پر یوں بے چین ہوسکتے تھے۔ سالار۔۔۔ کیا وہ سالار کی بات کررہے تھے؟ سالار کے برین ٹیومر کی؟ ایک جھماکے کے ساتھ اسے کئی ہفتے پہلے کی فرقان اور اپنی بات چیت یاد آئی۔ ہاسپٹل کا وزٹ۔۔۔ کچھ ہفتوں سے سالار کا بدلا ہوا رویہ۔۔۔

وہ بے یقینی کے عالم میں فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ یہ اس کا وہم تھا۔ اسے وہم ہی ہونا چاہیے۔ اس نے جیسے گڑگڑا کر دعا کی تھی۔ اب کچھ اور نہیں۔۔۔ کوئی آزمائش نہیں۔۔۔ اس نے اپنے مفلوج ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ عنایہ، حمین، رئیسہ کو دیکھا جو خوش گپیاں کرتے ہوئے سونے کی تیاری میں مصروف تھے۔

فون پر اب دونوں طرف خاموشی تھی۔ نہ سکندر عثمان بول پا رہے تھے' نہ وہ... وہاں پچھتاوا تھا' یہاں بے یقینی... سالار کا نام لینے کی نہ ان میں ہمت تھی' نہ اس میں حوصلہ...

"آپ سے کس نے کہا؟" امامہ نے بالآخر جیسے اپنے اوسان پر قابو پاتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں ان سے پوچھا۔ اس نے اپنے پچھلے سوال کے جواب پر اصرار نہیں کیا تھا۔

"اس نے تمہیں نہیں بتایا؟" سکندر عثمان نے عجیب بے بسی کے ساتھ اس سے پوچھا' یوں جیسے یہ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ خبر غلط تھی... کاش کہہ سکتے...

امامہ کو اس سوال کا جواب دینے یا سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے باہر ہارن کی آواز سنی تھی۔

"میں کچھ دیر میں آپ سے بات کرتی ہوں پاپا۔" اس نے اپنے سرد پڑتے ہاتھ میں تھامے فون کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سکندر عثمان سے کہا۔

"مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔" وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ پائے۔ اس حالت میں بھی انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے اس انکشاف پر امامہ پر کیا گزری ہوگی۔

امامہ نے جواب نہیں دیا' فون بند کر دیا۔ سب کچھ یک دم ہی مہمل' بے معنی ہو گیا تھا۔ کسی بت کی طرح فون کو گود میں رکھے وہ ساکت بیٹھی رہی۔

وہ ساری زندگی "برے وقت" سے ڈرتی رہی تھی اور برے وقت کی آہٹ پر کان لگائے رکھتی تھی اور اب بس کچھ ہی سال تو ایسے گزرے تھے کہ اس نے آہٹوں پر کان لگانے بند کیے اور برا وقت... وہ جیسے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنا دبے پاؤں... اتنا اچانک کہ وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔

اس سے کچھ فاصلے پر عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ وقتاً" فوقتاً" گفتگو کرتا ہوا حمین سونے کی کوشش میں بھی صوفے پر بت کی طرح بیٹھی ماں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ممی نے دادا سے فون پر بات کی تھی اور پھر ممی خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ہارن بجنے پر بھی بابا کو ریسیو کرنے نہیں گئی تھیں۔ حمین نے جمائی لیتے ہوئے صورت حال کا تجزیہ کیا۔ امامہ کو ایک بار پھر دیکھا' پھر عنایہ اور رئیسہ کو جو تقریباً" نیند کی وادی میں جانے والی تھیں۔ ایک اور جماہی لے کر اس نے امامہ کو مخاطب کیا۔

"ممی! آپ ٹھیک ہیں؟"

امامہ نے چونک کر خالی نظروں سے حمین کو دیکھا وہ حمین کا سوال نہیں سمجھ سکی تھی۔ بس یہ پتا چلا تھا کہ اس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دینے یا کوئی اور سوال کرنے کے بجائے وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ حمین کچھ اور الجھا تھا۔ اس کی ماں انہیں خدا حافظ کہے بغیر اور ان کے ماتھے پر بوسہ دیے بغیر ایسے نہیں جاتی تھی' جیسے وہ اس وقت گئی' یہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ حمین کی زندگی میں... اس کا دماغ الجھا تھا۔ اس گھر کے افراد باری باری اس طوفان کے ہچکولوں کو محسوس کرنا شروع ہو گئے تھے۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟" سالار نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی وہاں پڑے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے جبریل کو دیکھ لیا تھا۔ باپ کی آواز جبریل کو کسی کرنٹ کی طرح لگی تھی۔ برق رفتاری سے اس نے کمپیوٹر کی اسکرین پر وہ سائٹ بند کی جو وہ کھولے بیٹھا تھا اور پھر مزید کچھ بھی بند کیے بغیر وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے گھوما۔

وہ اب باپ کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا جو لاؤنج کے بیرونی دروازے سے سیدھا اندر آیا تھا لیکن ابھی تک اس کے قریب نہیں پہنچا تھا۔ امامہ ہارن کی آواز سن کر بھی نہیں آئی تھی۔ جبریل ہارن کی آواز سن ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا ذہن جس گرداب میں پھنسا ہوا تھا وہاں وہ سن بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں ایک اسائنمنٹ کی تیاری کر رہا تھا۔" جبریل نے اپنے سامنے کھڑے سالار کو دیکھے بغیر' نظریں ملائے بغیر

کہا۔ وہ باپ کا چہرہ کیوں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ ساڑھے نو سال کا بچہ اس وقت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اس نے جیسے بے خبری میں ایک ایسا راز پا لیا تھا جسے اب وہ کسی کے سامنے عیاں ہو جانے سے ڈر رہا تھا۔

سالار نے جبریل کا چہرہ دیکھا۔ اس کے عقب میں ڈیسک ٹاپ پر ورلڈ بینک کا ہوم پیج دیکھا' پھر اس نے اپنی ڈنر جیکٹ اتارتے ہوئے اس سے کہا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ ساڑھے دس ہو رہے ہیں اور تمہیں دس بجے سے پہلے پہلے سب کام مکمل کر لینا چاہیے' یاد ہے؟"

سالار نے جیسے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔ وہ اس گھر کے بچوں کے لیے ایک طے شدہ معمول تھا' دس بجے سے پہلے پہلے ۔ اپنا کام مکمل کر کے سو جانا۔

جبریل نے اس بار بھی باپ کو دیکھے بغیر سر ہلایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہاری ممی کہاں ہیں؟" سالار نے اس سے پوچھا۔ ہارن کی آواز کے باوجود بھی اس کا استقبال کرنے نہیں آئی تھی۔ اور جبریل رات کے اس پہر لاؤنج پر ڈیسک ٹاپ پر اکیلا موجود تھا۔ اس کے گھر میں یہ خلاف معمول تھا۔ ... وہ خدشہ جو اسے ڈنر میں لاحق ہوا تھا وہ جیسے یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔

جبریل کو جواب دینا نہیں پڑا۔ بچوں کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ آگئی تھی۔ سالار نے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر پڑنے والی ایک نظر ہی اسے یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اس کے بدترین خدشات ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔

اس لاؤنج میں موجود تینوں افراد عجیب ڈرامائی انداز میں وہاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کسی اسٹیج پلے کے ایکٹرز کی طرح جو ڈرامے کے درمیان اپنی لائنز بھولنے کے ساتھ ساتھ اسٹیج پر آمد اور جانے کا راستہ بھی بھول چکے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ پہلے دوسرا جائے۔

وہ خاموشی اس ساڑھے نو سال کے بچے نے پہلی بار اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہوتی دیکھی تھی۔ اور اس خاموشی نے اس کے خوف کو بڑھایا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا لیکن دنیا کی کوئی ذہانت انسانی رشتوں کے الجھے دھاگوں کو سلجھا نہیں سکتی۔ نہ جذباتیت کو مات دے سکتی ہے نہ بے حسی کو توڑ سکتی ہے۔ نہ خاموشی کی دیواریں چھید سکتی ہے۔

سالار کی طرح جبریل نے بھی یہ تو جان لیا تھا کہ امامہ بھی سالار کی بیماری کے بارے میں جان گئی تھی لیکن یہ انکشاف اسے کس حد تک اذیت دے رہا تھا۔ جبریل اس کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا نہ اس کے رد عمل کا۔

"گڈ نائٹ۔" اسے جیسے راہ فرار سوجھ گئی تھی۔ وہ دو لفظ بول کر ماں کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے غیر متوازن چال کے ساتھ گیا تھا۔ لاؤنج میں کھڑے رہ جانے والے ان دونوں افراد نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نظر پھر دوسری پھر تیسری .... پھر سالار پلٹ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ ان نظروں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر پیچھے دیکھے بغیر بھی وہ جانتا تھا وہ اس کے پیچھے تھی اور میکانکی انداز میں اندر آئی تھی یوں جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ سحر زدہ نہیں تھی۔ دہشت زدہ تھی .... یوں جیسے بہت کچھ پوچھنے کے باوجود کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی ... جیسے اسے یقین تھا۔ اب جو بھی خبر ملنی تھی بدی سے بدتر ملنی تھی۔

سالار اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ڈنر جیکٹ کو صوفے پر پھینکتے ہوئے اس نے وہ فون ٹراؤزر کی جیب سے نکال لیا تھا جو بج رہا تھا۔ وہ سکندر عثمان تھے .... اس نے اس بار باپ سے صرف نظر نہیں کیا تھا۔ جب امامہ کو سب کچھ پتا چل چکا تھا تو پھر باقی کسی سے کیا چھپانا تھا اسے؟

اس کی آواز سنتے ہی سکندر عثمان اپنا حوصلہ کھو بیٹھے تھے۔۔۔ سالار نے باپ کو زندگی میں پہلی بار روتے دیکھا تھا اور اس لمحے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ صرف اولاد کے آنسو ہی تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ ماں باپ کو اپنی نظروں کے سامنے اپنی وجہ سے روتے دیکھنا بھی بے حد مشکل ہوتا ہے۔

"تم نے طے کر رکھا ہے کہ تم ساری عمر مجھے چین نہیں لینے دو گے۔"

سکندر عثمان نے آنسوؤں کے درمیان اس سے کہا۔ وہ اولاد کی تکلیف پر پریشان ہونے والے باپ تھے' رو پڑنے والے باپ نہیں تھے۔ آج ان کا یہ زعم بھی اسی اولاد نے ختم کیا تھا جو اتنے سالوں سے ان کے لیے فخر کا باعث رہی تھی۔

"اس بار تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا پاپا!" اس جملے نے سکندر عثمان کو مزید زخمی کیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی اس بار تو اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

"میں اور تمہاری ممی کنساشا آرہے ہیں' اسی ہفتے۔" انہوں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

"پاپا! کیا فائدہ ہے؟ میں وقت نہیں دے پاؤں گا۔ سب کچھ وائنڈ اپ کر رہا ہوں میں یہاں' کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں آجاؤں گا آپ کے پاس' پاکستان۔"

اس نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ وہ ان دونوں کو ان حالات میں اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ میں فی الحال بالکل ٹھیک ہوں۔ ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے۔ آپ صرف دعا کریں۔ ممی سے میری بات کروا دیں۔" اس نے سکندر عثمان کو دلاسا دیتے ہوئے انہیں ماں سے بات کروانے کو کہا۔ طیبہ بھی اسی کیفیت میں تھی جس میں سکندر عثمان تھے۔۔۔ اس کی بیماری کا انکشاف جیسے ایک آتش فشاں کے پھٹنے کی طرح تھا جس نے منٹوں میں اس سے جڑے ہر شخص کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

کمرے میں ٹہلتے ہوئے فون کان سے لگائے وہ اپنے ماں باپ کو تسلیاں دیتے ہوئے اس وجود سے بے خبر نہیں تھا جو کمرے کے درمیان اس ساری گفتگو کے دوران کسی بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ایک ایک لفظ کو سنتے ہوئے اور ایک بھی لفظ کو سمجھے بغیر۔

سالار نے بالآخر فون بند کیا اور اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک عجیب سا احساس جرم تھا جس کا شکار وہ اس وقت ہو رہا تھا۔ پتا نہیں احساس جرم تھا یا خود ترسی۔۔۔ اس کی بیماری نے اسے بڑے غلط انداز میں سب کی توجہ کا مرکز بنایا تھا۔ سب کی توجہ کا مرکز اور ہر ایک کی تکلیف کا باعث۔

اس نے فون رکھ کر امامہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔۔۔ بالکل بے رنگ یوں جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو' اس پر نظریں جمائے پلکیں جھپکائے بغیر۔ شاکی نظریں بے یقینی سے بھری ہوئی۔

"بیٹھ کے بات کرتے ہیں!" خاموشی کو سالار نے توڑا تھا' وہ اس کی نظروں کا سامنا نہیں کر پارہا تھا۔۔۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر امامہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے صوفے کی طرف لے آیا۔۔۔ وہ کھنچی چلی آئی تھی۔۔۔ یوں جیسے ایک روبوٹ ہو۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

بہت دیر صوفے پر برابر ایک دوسرے کو دیکھے بغیر گم صم بیٹھے سالار نے بالآخر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ گفتگو کا آغاز اب بھی اسے ہی کرنا تھا۔ سوال کا جواب جاننے کے باوجود اس نے پوچھا تھا۔

اس سوال کے علاوہ سارے سوال مہلک تھے۔۔۔ سارے سوالوں سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ کسی دوسرے کے بارے میں پوچھنا اور بات کرنا اور بات تھی۔ اپنے بارے میں بات کرنا۔۔۔ اپنی بیماری۔۔۔ اپنی زندگی' اپنی موت۔۔۔ یہ انسان نہیں کر سکتا وہ بھی انسان تھا۔

"تم نے کیوں نہیں بتایا؟" سوال کا جواب وہ نہیں آیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔ سوال کا جواب سوال ہے، ہی آیا تھا۔۔۔ گلے میں پھنسی ہوئی رندھی ہوئی زخمی سی آواز میں۔۔۔ وہ امامہ کی آواز نہیں تھی۔ بے بسی اور بے یقینی کی آواز تھی۔ کیا ہوا۔۔۔؟ کب ہوا۔۔۔ سے بھی زیادہ چبھنے والا سوال۔۔۔ اس نے اسے اس قابل کیوں نہیں سمجھا تھا کہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی تکلیف وہ خبر کو اس کے ساتھ بانٹتا۔۔۔ چھپانا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے باوجود بھی۔

"ہمت نہیں پڑی۔" جواب نے امامہ کی ہمت بھی توڑی تھی۔ وہ کم حوصلہ تو کبھی نہیں تھا، تو کیا وہ خبر اس بیماری کی نوعیت اس حد تک خراب تھی کہ وہ کم ہمت ہو رہا تھا۔

وہ اسے دیکھے بغیر اب جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے اسے اپنی بیماری کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ٹیومر کی تشخیص۔۔۔ نوعیت، ممکنہ علاج، متوقع مضمرات۔۔۔ مدھم آواز میں اسے دیکھے اس سے نظریں ملائے بغیر وہ اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا، وہ دم سادھے سب کچھ سنتی گئی۔ یوں جیسے وہ اپنے کسی بھیانک خواب کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟"

اس نے ساری گفتگو سننے کے بعد اس کا کندھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منت والے انداز میں پوچھا تھا، یوں جیسے وہ مریض نہیں ڈاکٹر تھا اور اس کی زندگی اور بیماری خود اس کے ہاتھ میں تھی۔۔۔ وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔ بول ہی نہیں سکا۔ وہ سوال تھوڑی تھا وہ تو آس اور امید تھی جو وہ اسے کم از کم اپنے لفظوں سے دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیماری کے بارے میں پاکستان اور امریکہ کے ڈاکٹرز کی آرا بتادی تھیں اور اس کے باوجود وہ اس سے ایک احمقانہ سوال پوچھ رہی تھی، سالار نے خفگی محسوس کی، غصہ نہیں آنا چاہیے تھا لیکن غصہ آیا تھا۔

"امامہ! تم جا کر سو جاؤ۔" اس نے اپنے کندھے سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے کچھ کھردرے لہجے میں ایک ویسا ہی احمقانہ مشورہ دیا۔ وہ اپنے جوتے اٹھا کر صوفے سے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکا۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بچوں کی طرح اس کے کندھے سے لگی۔۔۔ وہ اسے سونے کا کہہ رہا تھا۔ نیند تو ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی اب اس کی زندگی سے۔۔۔ وہ جو ایک گھر اتنی مشکل سے بنایا تھا وہ ٹوٹنے جا رہا تھا۔ سائبان ہٹنے والا تھا اور وہ اسے کہہ رہا تھا وہ سو جائے۔

وہ اس سے لپٹی ہچکیوں کے ساتھ روتی رہی، وہ مجرموں کی طرح چپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔۔۔ تسلی دلاسا دے سکتا تھا۔ پر کیا دیتا۔۔۔ ابھی اسے وہ سارے لفظ ڈھونڈنے اور سوچنے تھے، جن میں وہ اپنی بیوی کو یہ کہتا کہ وہ اب اپنے مستقبل کو اس کے بغیر سوچے، اپنے حال میں سے اسے نکالنا سیکھے۔۔۔ یہ ناامیدی اور مایوسی نہیں تھی۔ حقیقت پسندی تھی۔۔۔ وہ حقیقت پسندی جس سے امامہ نفرت کرتی تھی۔

"میں رپورٹس دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ روتے روتے یک دم بولی تھی۔ پتا نہیں اب کیا گمان تھا جسے وہ وہم بنانا چاہتی تھی۔ سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر کمرے میں پڑی ایک کیبنٹ سے فائلز کا ایک پلندہ لا کر اس کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے ان رپورٹس کو دیکھنے لگی، دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ ان کاغذات کو دیکھتے ہوئے جیسے یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ کچھ اور تو نہیں تھا جو وہ چھپا رہا تھا۔ کوئی اور بری خبر، پیروں کے نیچے سے باقی ماندہ زمین بھی نکال دینے والا انکشاف۔۔۔ ہر کاغذ اس کی آنکھوں کی دھند کو گہرا کر رہا تھا، وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ رہ چکی تھی رپورٹس میں استعمال شدہ ٹرمز کو پڑھ بھی سکتی تھی، سمجھ بھی سکتی تھی۔ آخری فائل کو بند کر کے واپس رکھتے ہوئے اس نے سالار کو دیکھا۔

"میڈیکل سائنس غلط بھی تو کہہ سکتی ہے۔"

سالار رندھی ہوئی آواز میں کہے گئے اس جملے پر ہنس پڑا۔ وہ غلط آدمی کو غلط جملے سے امید دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ شاید یہ جملہ اس سے نہیں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ اپنے دماغ میں چلنے والے جھکڑ روکنے کے لیے۔

"ہاں سائنس غلط بھی کہہ سکتی ہے... ڈاکٹرز کی تشخیص بھی غلط ہو سکتی ہے علاج بھی۔" اس نے امامہ ہاشم کی بات کو رد نہیں کیا تھا... اس کی اذیت کو وہ اور نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟" اس کا بازو ایک بار پھر تھاما گیا تھا۔ سوال پھر دہرایا گیا تھا... وہ خاموش نہیں رہ سکا غصہ بھی نہیں دکھا سکا۔

"اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو ضرور... لیکن یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان شاء اللہ۔"

وہ پھر ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔ اس بار سالار نے اسے لپٹا لیا۔ وہ مرد تھا رونا نہیں چاہتا تھا مگر جذباتی ہو رہا تھا... وہ آنسو نہیں تھے۔ وہ سارے خوف اور خدشات تھے جو اس کی بیماری ان کی زندگی میں لے آئی تھی۔ چار کم سن بچوں کے ساتھ وہ ایک عورت' اپنی زندگی کو کیسے اکیلے بسر کر لینے کا تصور کر لیتی۔ جب وہ پچھلے گیارہ سالوں سے اس پر ہر لحاظ سے انحصار کرتی رہی تھی۔ خوف بے شمار تھے اور وہ اس کے اظہار کے بغیر بھی جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

"امامہ! تمہیں بہادر بن کر اس سب کا مقابلہ کرنا ہے۔"

اس نے بالآخر اس کے لیے ایک جملہ ڈھونڈا تھا کہنے کے لیے... صدیوں پرانا روایتی جملہ... تکلیف میں انسان بے حس تو ہو سکتا ہے بہادر کیسے ہوتا ہے؟... وہ اس سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکی۔

زندگی میں پہلی بار اس نے سالار کی کسی بات پر اعتراض کے باوجود وہ اعتراض اس تک نہیں پہنچایا... لڑنا جھگڑنا بحث مباحثہ یہ تو تب ہوتا ہے جب سالوں کا ساتھ ہو... سالوں کا ساتھ گزر گیا تھا... اب جو رہ گیا تھا۔ وہ مہلت تھی اور اس مہلت نے اسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ شکوہ... شکایت... گلہ... اعتراض... کچھ بھی... وہ روتی رہی وہ اسے ساتھ لگائے تھپکتا رہا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" بہت دیر تک اس سے لپٹ کر روتے رہنے کے بعد وہ اس سے الگ ہوئی اور اس نے جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تم پھر سوال کر رہی ہو؟" سالار کو لگا اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔

"نہیں سوال نہیں کر رہی - بتا رہی ہوں... تمہیں بہادر بن کر اس سب کا مقابلہ کرنا ہے۔"

وہ اس کا جملہ اسی سے دہرا رہی تھی وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بیماری ہے۔ موت تو نہیں ہے۔" کیسی تسلی تھی جو اس نے دی تھی۔ اسے شاید خیال آیا تھا کہ اسے سالار کو تسلی دینا چاہیے تھی اس کے آنسو اسے پریشان کر رہے ہوں گے... مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہے ہوں گے۔

امامہ سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لڑکھڑاتی زبان میں اسے جو امید دلا رہی تھی' اس کی حقیقت اسے بھی پتا تھی اور اس کو بھی جیسے وہ امید دلا رہی تھی۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" وہ مسکرایا... امامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک اور سیلاب آیا۔

"میں نے زندگی میں تمہیں بہت سارے آنسو دیے ہیں' تمہارے رونے کی بہت ساری وجوہات کا باعث بنا ہوں میں۔" اس کے آنسوؤں نے عجیب کانٹا چبھویا تھا سالار کو...

بہتے آنسوؤں کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے وہ ہنسی۔

''ہاں، میری زندگی میں خوشی اور ہنسی کے سارے لمحات کی وجہ بھی تم ہو۔''
وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔۔۔ پھر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
''سو جاؤ۔۔۔ بہت رات ہو گئی ہے۔'' وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں چلا گیا تھا جب واپس آیا۔ وہ اسی طرح وہاں بیٹھی تھی۔۔۔ ان ہی فائلوں کے پلندے کو ایک بار پھر گود میں لیے۔۔۔ یوں جیسے اس میں جھوٹ ڈھونڈ رہی ہو۔۔۔ کوئی غلطی کوئی غلط فہمی۔۔۔ امید تو وہاں نہیں تھی۔
سالار نے کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کی گود سے وہ ساری فائلیں اٹھالیں' اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
''امامہ! ایک وعدہ کرو؟'' فائلوں کو اس کیبنٹ میں لاک کرتے ہوئے سالار نے اس سے کہا۔
''کیا؟'' اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے اس سے کہا۔
''بچوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔۔۔ وہ بہت چھوٹے ہیں۔''
امامہ نے سر ہلا دیا۔



''برین ٹیومر کیا ہوتا ہے؟'' حمین نے دعا کا آخری لفظ پڑھتے ہی جبریل سے پوچھا' جبریل کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں آیا تھا۔
''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' جبریل کو لگا جیسے حمین نے وہ سوال اس سے جان بوجھ کر کیا تھا۔ یوں جیسے اس کی چوری پکڑلی تھی۔ ''کوئی disease (بیماری) ہوتی ہے؟'' وہ جبریل سے پوچھنے کے باوجود اندازہ لگا چکا تھا۔
''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' جبریل نے ایک بار پھر اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال دہرایا' لیکن اس نے دل میں جیسے دعا کی تھی کہ اسے کچھ پتا نہ ہو۔
''ہماری فیملی میں کسی کو برین ٹیومر ہے۔'' حمین نے بالآخر اعلان کیا جبریل نے عنایہ اور رئیسہ کو دیکھا وہ دونوں سو چکی تھیں۔
''I think dada has got brain tumar (میرا خیال ہے دادا کو ہے)'' اس نے جبریل کے تبصرے سے پہلے اپنا اگلا نتیجہ اس کے ساتھ بانٹا۔
''He told Mummy and Mummy got upset۔'' انہوں نے ممی کو بتایا ہے اور ممی اپ سیٹ ہو گئی ہیں)
جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ تو اس کی ماں تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ اور اس کے دادا تک بھی۔۔۔ اور پوری فیملی تک۔۔۔ وہ بچہ سوچ رہا تھا۔
'' Is dada going to die (کیا دادا مرنے والے ہیں؟)
حمین نے اس بار لیٹے لیٹے بے حد رازدارانہ انداز میں جبریل سے پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے بے اختیار کہا۔
"Thank God.... I love him so much"
''تھینک گاڈ! مجھے ان سے بہت پیار ہے۔''
حمین نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ سینے پر رکھ کر جیسے سکون کا سانس لیا۔
''تب ٹھیک ہے۔''

"حمین! تم یہ بات کسی کو مت بتانا۔" جبریل نے یک دم اسے ٹوکا۔
"دادا کے برین ٹیومر والی؟" وہ متجسس ہوا۔
"ہاں۔"
"کیوں؟"
اس کیوں کا کوئی معقول جواب نہیں تھا اس کے پاس' لیکن جواب کے بغیر حمین کو وہ قائل نہیں کر سکتا تھا۔
"یہ ممی کا سیکرٹ ہے' وہ اسے ڈس کلوز (ظاہر) نہیں کرنا چاہتیں۔"
"اوہ! ہاں۔" حمین کو فوری طور پر بات سمجھ میں آگئی۔
"دادا نے ممی کو یہ بات بتائی تو وہ اپ سیٹ ہو گئیں' اب تم کسی اور کو بتاؤ گے تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جائے گا۔"
جبریل جتنے حفاظتی بند باندھ سکتا تھا' اس وقت باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ننھا بچہ ماں باپ کے اس راز کو راز رکھنے کے لیے ہلکان ہوتا جا رہا تھا۔
"اوہ مائی گاڈ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"
حمین کو یک دم خیال آیا۔ وہ جبریل کی بات نہ مان کر کتنا برا کام کرنے والا تھا۔
جبریل اب سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔
"لوگوں کو اپ سیٹ کرنا گناہ ہے نا؟" ایک پراسرار سرگوشی اس کے بائیں کان میں ایک بار پھر گونجی۔
"ہاں' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔" جبریل نے سرگوشی میں ہی اندھیرے میں چمکنے والی ان آنکھوں کو ڈرایا۔
"آہاں.... اوکے۔"
حمین کی آواز میں اس بار خوف تھا اور وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا... وہ آج کل ہر کام اور بات کو ایک ہی پیمانے پر جج کرتا تھا... کیا وہ sins (گناہ) ہے؟
جبریل کچھ دیر اسی طرح لیٹا رہا... نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حمین کے خراٹے تھوڑی ہی دیر میں اس کے کانوں میں گونجنے لگے وہ اس کے خراٹوں سے بے حد چڑتا تھا اور ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ حمین سے پہلے سوئے کیونکہ اگر وہ پہلے سو جاتا تو اس کے خراٹوں کی آواز سے وہ سو نہیں پاتا تھا... اور آج وہ جان بوجھ کر اس کے نیند میں جانے کا انتظار کرتا رہا' جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکا ہے تو وہ بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا ہوا دروازہ کھول کر دوبارہ لاؤنج میں آگیا جس کی لائٹ اب آف تھی۔ جبریل نے لاؤنج کی لائٹ جلائے بغیر کمپیوٹر آن کیا اور دوبارہ ان ہی میڈیکل ویب سائٹس کو دیکھنے لگا جنہیں وہ سالار کے آنے سے پہلے دیکھ رہا تھا۔
ساڑھے نو سال کی عمر میں محمد جبریل سکندر نے پہلی بار برین ٹیومر کے بارے میں پڑھا تھا... نیورو سرجری کے بارے میں... neurooncology کے بارے میں oligodendrogliomas کے بارے میں... اس کی ہر ٹائپ کے بارے میں... اور دماغ کے بارے میں... وہ پہلے بھی اپنی سائنس کی کلاسز میں دماغ کے بارے میں متجسس رہتا تھا لیکن اب وہ دماغ اور اس کو لاحق ایک بیماری اس شخص کی زندگی کو چیلنج کر رہی تھی جس سے اسے سب سے زیادہ پیار تھا۔ وہ اس بیماری کا علاج ڈھونڈنا چاہتا تھا جس سے وہ اپنے باپ کی زندگی بچا سکے... ساڑھے نو سال کی عمر میں دماغ اور دماغ کی بیماریوں سے یہ دنیا کے کم عمر ترین اور قابل ترین سرجن کا پہلا تعارف تھا...
سالار سکندر اپنی بیماری کے بارے میں جتنا کچھ جانتا تھا' جبریل سکندر اس ایک رات میں اس سے دس گنا زیادہ جان چکا تھا... وہ پہلی رات نہیں تھی جب جبریل جاگ کر اس بیماری کی کھوج میں لگا تھا' وہ اس کی زندگی کی ان راتوں کا آغاز تھا جو اسے دماغ کی گتھیوں کو سلجھانے میں گزارنی تھیں۔



اس رات امامہ کو نیند نہیں آئی۔۔۔ سالار کے سو جانے کے بعد بھی وہ اس طرح جاگتی رہی تھی جیسے نیند نامی کسی شے سے واقف ہی نہ ہو۔

اسے خوف رہتا تھا وہ جس سے پیار کرتی تھی وہ اس سے چھن جاتا تھا۔ وہ سالار سے پیار نہیں کرتی تھی۔ کرنے لگی تو اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ضروری ہو گیا تو وہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کو کھو دینے سے ڈرتی تھی۔۔۔ پیار کیسی قاتل شے ہے۔۔۔ کسی تیر تلوار سے نہیں مارتا۔۔۔ "ہو" جانے سے مار دیتا ہے۔

اس نے لاہور میں نہر کنارے ملنے والی اس بوڑھی خانہ بدوش عورت کے بارے میں سالار کو بھی بتایا تھا۔۔۔ جب وہ اس کے پاس امریکہ واپس گئی تھی اور وہ حیران رہ گیا تھا کہ وہ موم کیسے ہوئی۔ اس کا دل کیسے بدل گیا۔

سالار نے اس بوڑھی عورت کے قصے کو دلچسپی سے سنا تھا۔ یقین نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا امامہ اس وقت جس ذہنی حالت میں تھی وہ چیزوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساسیت دکھا رہی تھی' اس نے امامہ کی اس بات کو بھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا کہ وہ اس عورت کو کوشش کے باوجود ڈھونڈ نہ سکی۔

اور آج اتنے سالوں کے بعد امامہ کو ایک بار پھر وہی عورت یاد آئی تھی۔ وہ کہیں اسے ملتی تو وہ اسے بتاتی کہ اسے وہم نہیں تھا۔۔۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی۔ وہ اس سے چھن جاتا تھا۔

سالار کی آنکھ رات کے کسی پل کھلی تھی' امامہ برابر کے بستر میں نہیں تھی' صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بستر کی طرف کے پڑے ہوئے صوفے پر۔۔۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ وہ واقعی وہیں تھی۔ صوفے پر سر جھکائے۔۔۔ وہ کمرے میں روشنی ہونے پر بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی' ایک گہرا سانس لے کر سالار نے اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا پھر وہ اٹھ کر اس کے برابر صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں پتا ہے میں کیوں تمہیں یہ سب نہیں بتانا چاہتا تھا۔ صرف اسی وجہ سے؟ تم مجھے بہت پریشان کر رہی ہو۔" وہ مدھم آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اسے ڈانٹنا چاہتا تھا۔۔۔ ڈانٹ نہیں سکا۔۔۔

اس نے سر اٹھا کر سالار کا چہرہ دیکھا۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"تم سونے کے لیے لیٹو گی تو نیند آ جائے گی۔" اس نے جواباً" کہا۔

وہ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ کر بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کی اس اطاعت نے سالار کو بری طرح کاٹا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ بجھا کر وہ بھی سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن نیند اب اس کی آنکھوں سے بھی غائب ہو گئی تھی۔



بیماری کے انکشاف کے اثرات اسے اگلے دن ہی پتا چلنے شروع ہو گئے تھے۔۔۔ بورڈ آف گورنرز کے پانچوں ارکان کے بعد باری باری بہت سے ایسے لوگوں نے اسے میسجز اور کالز کرنی شروع کر دی تھیں جو ان کے اس مالیاتی نظام سے وابستہ ہونے کے لیے فنانشل امداد دے رہے تھے۔ وہ سالار سکندر کی زندگی کے حوالے سے تشویش کا شکار نہیں تھے' وہ اس ادارے میں اپنی انویسٹمنٹ کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے' جس سے وہ سالار سکندر کے نام کی وجہ سے جڑنا چاہتے تھے۔

یہ سالار سکندر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔۔۔ اس اسٹیج پر اس طرح کی عدم اعتمادی ان کے ادارے کی ساکھ کے لیے بے حد نقصان دہ تھی۔۔۔

اگلے چند دن سالار سکندر نے دنیا جہاں سے مافیہا صرف کالز' ای میلز' میسجز کے ساتھ گزارے تھے۔۔۔

کچھ بڑے سرمایہ کار پیچھے ہٹ گئے تھے اور وہ واپس تب آنے پر تیار تھے جب انہیں ان کا ادارہ کام کرتا اور کامیاب ہوتا نظر آتا۔۔۔ باقی کے سرمایہ کاروں کو روکنے کے لیے جان توڑ کوششوں کی ضرورت تھی۔ جو وہ سب کر رہے تھے۔

ایک capitalistic (سرمایہ دارانہ) دنیا کے اندر روپیہ صرف روپے کے پیچھے بھاگتا ہے۔۔۔ اور روپیہ سانپ کی طرح ڈرپوک ہوتا ہے۔ ایک ہلکے سے خطرے کی آہٹ پر بھی بھاگ جاتا ہے۔۔۔ دوستیاں، تعلقات، اعتماد۔۔۔ کوئی چیز اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی سوائے ایک چیز کے۔۔۔ تحفظ اور ترقی۔۔۔ وہ صرف وہاں نکلتا ہے جہاں پھل پھول سکتا ہے۔۔۔ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر سکتا ہے۔۔۔ وہاں نہیں جہاں اس کی ترقی کو خدشات لاحق ہو جائیں۔

سالار سکندر نے زندگی کا ایک بڑا حصہ مالیاتی اداروں اور انویسٹمنٹ بینکنگ میں گزارا تھا، وہ سرمایہ کاروں کی نفسیات اور ذہنیت کو اپنے بائیں ہاتھ کی طرح جانتا تھا۔۔۔ وہ کب درخت پر بیٹھے پرندوں کی طرح اڑتے ہیں اور کب دانے کے پیچھے آتے ہیں یہ کوئی اس سے بہتر نہیں جان سکتا تھا۔۔۔ اس کے باوجود وہ اپنے موجودہ آقاؤں کی کرم نوازی کی وجہ سے ایک بے حد مشکل صورت حال میں پھنس چکا تھا۔

اگلے چند ہفتے ان ابتدائی چند دنوں سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئے تھے۔۔۔ ان کے سارے بڑے سرمایہ کار انہیں چھوڑ چکے تھے۔۔۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا ستر فی صد فنانس ان کے پاس آنے سے بھی پہلے ختم ہو گیا تھا تیس فی صد فنانس وہ تھا جو بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اپنی کنٹری بیوشن تھی اور وہ سارا ان انویسٹرز کی شکل میں موجود تھا جو وہ ان پانچ سالوں میں اپنے ادارے کے لیے دنیا کے مختلف حصوں میں کرنے آئے تھے۔۔۔ ان کے پاس رننگ کیپٹل بہت کم تھا۔۔۔ وہ کیپٹل جس کی بنیاد پر انہوں نے بین الاقوامی طور پر اس ادارے کا آغاز کرنا تھا۔۔۔ ایک بڑے سرمایہ کار کے معاہدہ کر کے بھاگ جانے کا مطلب تھا کہ ہزاروں دوسرے پوٹینشل انویسٹر آپ کو اپنے ریڈ زون میں رکھ دیں۔۔۔ جانے والا بڑا انویسٹرز کئی ممکنہ آنے والے انویسٹرز کو بھی پہلے ہی غائب کر دیتا ہے، پانچ سال میں دن رات کی جانے والی محنت چند ہفتوں میں دھوئیں کی طرح اڑ گئی تھی۔ وہ اگر پھر سے زیرو پر نہیں بھی آئے تھے تب بھی ان کی ساکھ کی کمر ٹوٹی تھی۔

اور اس سارے کرائسس نے سالار کو ایک اور چیز سکھائی تھی۔۔۔ کوئی بھی ادارہ فرد واحد پر کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ ون مین شو اس ون مین کے ختم ہونے کے بعد آدھی سیٹوں کے تماشائی بھی کھینچ کر نہیں لا سکتا۔۔۔ یہ بہت بڑا سبق تھا جو سالار سکندر نے بہت بڑی قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا۔

وہ زندگی میں بہت کم مایوس ہوا تھا، بہت کم اسے یہ لگا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے بیٹھ کر یہ سوچنا پڑ گیا تھا کہ کیا یہ سب کچھ ایسا تو نہیں ہے، جو وہ نہیں کر سکتا۔ کیا وہ اپنی صلاحیتوں اور استطاعت سے بڑا خواب دیکھ رہا تھا؟ کیا اس کی فیملی کے لوگ اور احباب ٹھیک تھے جب وہ اسے اس راستے پر چلنے سے روک رہے تھے۔۔۔ وہ نہیں سمجھ پایا کہ وہ اتنا منفی ہو کر کیوں سوچ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک بنیادی وجہ وہ بیماری تھی جس کا وہ شکار تھا، جو اسے زندگی میں پہلی بار زندگی کے آخری لمحے کے بارے میں ٹک ٹک کرتے ہوئے بتا رہی تھی۔۔۔ سات سے دس سال۔۔۔ اسے جو بھی کرنا تھا۔۔۔ اس سے بھی کم مدت میں کرنا تھا۔۔۔ لیکن دھاگے کا سرا کہاں تھا؟ اور سرا پکڑا کیسے جائے فوری طور پر یہ سمجھ سے باہر تھا۔



"اگر میں تمہیں ایک بیڈ نیوز بتاؤں تو کیا تم اپ سیٹ ہو جاؤ گی؟" اگلے دن اسکول ختم ہونے کے بعد گاڑی کے انتظار میں کھڑے حمین سکندر نے رئیسہ سے کہا۔۔۔ عنایہ اور جبریل کو پک کرنے سے پہلے ڈرائیور ان دونوں کو

پک کرتا تھا پھر اسی سکول کے ایک دوسرے کیمپس سے جبریل اور عنایہ کو۔۔۔
ایک لمحہ کے لیے رئیسہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ حمین کے اس سوال کا کیا جواب دے۔۔۔ جبریل کے خوب سمجھانے بجھانے اور دھمکیوں کے باوجود وہ کوئی خبر اتنی ہی دیر ہضم کر سکتا تھا جتنی دیر اس نے ہضم کرلی تھی۔ اور گھر میں رئیسہ وہ سب سے پہلا فرد ہوتی تھی جسے وہ ہر بریکنگ نیوز دیتا تھا' کیونکہ گھر میں رئیسہ کے علاوہ اسے کوئی اس جیسا سامع نہیں ملتا تھا جو اس کی ہر بات کو نہ صرف دلچسپی سے سنتا رہتا بلکہ آمنا و صدقنا کہہ کر اس پر یقین بھی کرلیتا۔
گھر میں اب بچوں کے دو گروپ تھے۔۔۔ جبریل اور عنایہ۔۔۔ سوبر اور سمجھ دار۔۔۔ اور حمین اور رئیسہ ان دونوں کو کس کیٹگری میں ڈالا جاتا یہ مشکل تھا کیونکہ وہ دونوں ایک کیٹگری میں نہیں آتے تھے' حمین بے حد شرارتی اور باتونی تھا۔۔۔ سوالات کی بھرمار کے ساتھ۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے انتہا ذہین۔۔۔ پڑھائی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے ماں باپ کا مسئلہ تھا۔۔۔ رئیسہ اس کا الٹ تھی۔۔۔ خاموش' مودب' سوچ سمجھ کر بولنے والی۔۔۔ لیکن اوسط ذہانت کے ساتھ۔۔۔ وہ فطرت اور عادات کے حساب سے جبریل اور عنایہ کے گروپ میں زیادہ بہتر طور پر ایڈجسٹ ہوتی لیکن ذہانت کے حساب سے اسے کہیں رکھنا ہوتا تو وہ دونوں ہی گروپس میں نہیں رکھی جاسکتی تھی۔
سالار اور امامہ کے تینوں بچوں کے آئی کیو میں انیس بیس کا فرق ہو سکتا تھا مگر ایک اور بیس کا نہیں لیکن ذہانت اور عادات کا فرق ہونے کے باوجود حمین سکندر کے ساتھ اس کا بلا کا اتفاق تھا۔۔۔ وہ دونوں گھر کے چھوٹے تھے اور دونوں اکٹھے رہنا پسند کرتے تھے۔۔۔ جبریل اور عنایہ کی طرح۔۔۔
رئیسہ اس کی بات آدھی سمجھی تھی' آدھی نہیں سمجھی تھی لیکن اسے تجسس ہوا تھا۔
"نہیں' میں اپ سیٹ نہیں ہوں گی۔" اس نے چند لمحے سوچ کر کہا۔
"گریٹ۔" حمین کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ایک گناہ سے بھی بچنے والا تھا اور وہ اپنے دل و دماغ کا بوجھ بھی بٹا سکتا تھا۔
"تمہیں پتا ہے' ممی اور بابا آج کل اپ سیٹ کیوں ہیں؟"
وہ اب بڑے ڈرامائی انداز میں سالار اور امامہ کی ناشتے کی میز پر "پراسرار" خاموشی کا راز فاش کرنے والا تھا۔
"کیوں۔۔۔" رئیسہ کا تجسس بڑھا۔
"دادا کو برین ٹیومر ہو گیا ہے۔"
رئیسہ نے بغیر تاثر کے اس کا چہرہ دیکھا۔ "یہ ایک بیماری ہے' لیکن وہ اس سے مریں گے نہیں۔" اس نے رئیسہ کو سمجھایا۔ رئیسہ کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی تھی۔
"اوکے۔" اس نے حسب عادت حمین کی بات کے جواب میں کہا اور فراک کی جیب میں پڑی ہوئی وہ چاکلیٹ نکال کر کھانے لگی جو کچھ دیر پہلے حمین نے اسے تھمائی تھی۔
"یہ بہت بڑا سیکرٹ ہے' بلکہ ٹاپ سیکرٹ۔" حمین اسے زیادہ متاثر نہ دیکھ کر اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔
رئیسہ نے چاکلیٹ چباتے چباتے رک کر اسے دیکھا۔ "واؤ۔۔۔" اس نے متاثر ہونے کی کوشش کی اور حمین بری طرح تپا۔
"میں نے تمہیں ایک بری خبر سنائی ہے اور تم کہہ رہی ہو واؤ۔۔۔"
رئیسہ چاکلیٹ کھانا بھول گئی۔
"مجھے کیا کہنا تھا؟" وہ خائف ہو گئی تھی۔

حمین دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بے حد خفا انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ اوہ! مائی گاڈ!" حمین نے اپنا معمول کا جملہ پورے تاثرات کے ساتھ اسے رٹانے کی کوشش کی۔
"اوہ!... مائی گاڈ۔" رئیسہ نے اس جملے اور اس کے تاثرات کی نقل اتارنے کی بھرپور کوشش کی۔
"ہاں بالکل اسی طرح۔" حمین نے اس کی پرفارمنس سے مطمئن ہوتے ہوئے جیسے اسے سراہا "تم اب کسی سے بھی یہ سیکرٹ شیئر نہیں کرو گی... اوکے؟" اس نے رئیسہ کو تاکید کی "یاد رکھو' لوگوں کو اپ سیٹ کرنا گناہ ہے۔" وہ اسے ہمیشہ کی طرح سبق دے رہا تھا۔
رئیسہ نے ہمیشہ کی طرح سرہلا دیا۔ حمین کی بات آدھی اس کی سمجھ میں آئی تھی آدھی نہیں... لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ حمین اسے اتنی لمبی چوڑی نصیحت نہ بھی کرتا تو بھی رئیسہ اس گھر میں ان چاروں میں سب سے کم بولنے والی تھی... وہ حمین سے بے حد قریب ہونے کے باوجود اس سے بھی گفتگو کا آغاز خود نہیں کر پاتی تھی۔ وہ شرماتی تھی جھجکتی تھی یا عدم اعتماد کا شکار تھی لیکن رئیسہ سالار کے لیے گفتگو کا آغاز کرنا ایک مشکل کام تھا۔ وہ صرف بات کا جواب دیتی تھی' اکسانے پر سوال کرتی تھی لیکن اگر کوئی اسے مخاطب نہ کرتا تو وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہ سکتی تھی... اپنے کام یا کسی بھی اس کھلونے میں مگن جس کے ساتھ وہ کھیل رہی ہوتی۔
"کار آگئی..." حمین نے اسے تاکید کرنے کے بعد گیٹ سے نمودار ہونے والے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے پرجوش انداز میں اعلان کیا اور ساتھ اسے متنبہ کیا۔
"یاد رکھو' یہ ایک سیکرٹ ہے۔" حمین نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر ایک انگلی رکھی... پھر اسی ہتھیلی کو مٹھی کی شکل میں بند کیا۔ رئیسہ نے بیگ اٹھانے سے پہلے اس کے ایکشن کی نقل کی پھر حمین نے high .. کے لیے ہوا میں ہاتھ بلند کیا۔ رئیسہ نے بھی بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اپنے ہاتھ کا پنجہ اس کے ہاتھ سے ٹکراتے ہوئے high Five کیا۔



"سالار! کچھ دیر کے لیے یہ سب چھوڑ دو۔" امامہ نے اس رات بالآخر اس سے کہا تھا۔
وہ بہت دیر تک فون پر کسی سے بات کرتا رہا تھا اور ڈنر کے دوران آنے والی اس کال کو لینے کے بعد ڈنر بھول گیا تھا۔ امامہ بہت دیر تک ٹیبل پر اس کا انتظار کرنے کے بعد وقفے وقفے سے اسے دیکھنے بیڈ روم میں آتی رہی لیکن اسے مسلسل فون کال میں مصروف دیکھ کر اس نے بالآخر بچوں کو کھانا کھلا دیا اور اب جب وہ بالآخر بیڈ روم میں آئی تو سالار فون کال ختم کر رہا تھا۔
کھانے کا پوچھنے پر اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ صوفہ پر بیٹھا اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ اور بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ جس کرائسس میں تھا' وہ اس سے بے خبر نہیں تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ تسلی ہی دے سکتی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کی تسلیاں طفل تسلیوں سے زیادہ کچھ نہیں... سالار سکندر کی راتوں کی نیند اگر حرام ہوئی تھی تو اس کی وجوہات یقیناً" سنگین ہی تھیں۔
وہ اور سالار کئی دنوں سے آپس میں بہت کم بات چیت کر پا رہے تھے۔ جو بات چیت ہوتی بھی تو وہ بھی صرف اس کے علاج کے حوالے سے اور امامہ کی زندگی کا مرکز صرف اس کی زندگی ہی رہ گیا تھا۔ وہ کوشش اور جدوجہد کے باوجود اپنے ذہن کو کسی اور چیز میں الجھا نہیں پاتی تھی اور سالار کے پاس کتنا سا مال میں اپنے ان آخری مہینوں میں

اپنی بیماری کے بارے میں روز بیٹھ کر بات کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔
"کیا چھوڑ دوں؟" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے چونکا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"کام۔"
"اچھا!" وہ ہنس پڑا۔
"سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنے علاج پر توجہ دو... اپنی صحت' اپنی زندگی پر۔ ہمارے لیے صرف وہ اہم ہے۔" وہ اب جیسے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"امامہ! میرے پاس چوائس نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک کام کروں۔" وہ اس کی بات سن کر کچھ لمحوں کے لیے جیسے کچھ بول ہی نہیں پائی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا تھا۔
"میں ہر طرح سے مشکل میں ہوں۔ آج کل برے وقت میں نے پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن ایسا برا وقت نہیں کہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاؤں ریت ہو جائے۔"
وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا... امامہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں... وہ کئی ہفتوں سے لگاتار رو رہی تھی۔ اس کے باوجود آنکھوں کا پانی ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کنواں ہی بن گئی تھیں۔
"گناہ گار تو ہوں میں... ہمیشہ سے ہوں۔ گمان اور غرور تو کبھی نہیں کیا میں نے ہکیا بھی تو توبہ کرلی... لیکن پتا نہیں کیا گناہ کر بیٹھا ہوں کہ یوں پکڑ میں آیا ہوں۔"
"آزمائش ہے سالار... گناہ کی سزا کیوں سمجھ رہے ہو؟" امامہ نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔
"کاش آزمائش ہی ہو اور ختم ہو جائے' نہ ختم ہونے والی سزا نہ ہو۔" وہ بڑبڑایا تھا۔
"تمہارے پاس کتنی سیونگز ہیں؟" اس نے بات کرتے کرتے موضوع بدل دیا۔
"میرے پاس؟" وہ الجھی... "پتا نہیں... پاکستان میں بینک میں کافی رقم ہو گی۔ شادی سے پہلے کی بھی تھی' بعد میں بھی جمع کروائی رہی لیکن مجھے اماؤنٹ نہیں پتا... تمہیں ضرورت ہے کیا؟" اس نے یک دم سالار سے پوچھا۔
"نہیں... مجھے ضرورت نہیں ہے لیکن تمہیں شاید اب اسے استعمال کرنا پڑے' بچوں کے لیے۔ یہاں سے پاکستان جائیں گے تو وہاں کتنا عرصہ پاپا کے پاس تمہیں بچوں کے ساتھ ٹھہرنا پڑے' مجھے ابھی اندازہ نہیں... چند مہینے ٹھہرنا پڑتا ہے یا چند سال' مجھے نہیں پتا۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔
"وہاں پاپا کے پاس بچوں کی تعلیم کم از کم متاثر نہیں ہو گی... امریکہ میں میں فی الحال تم سب کو رکھنا افورڈ نہیں کر سکتا' خاص طور پر اب جب میری جاب ختم ہو رہی ہے اور میں اپنے ادارے کو لانچ کرنے کے پروسس میں بھی بے حد مسائل کا شکار ہوں اور اس پر یہ ٹیومر... ورلڈ بینک کی جاب کے ساتھ میڈیکل انشورنس بھی ختم ہو جائے گی جو امریکہ میں میری ہیلتھ انشورنس ہے' وہ کینسر ٹریٹمنٹ کور نہیں کرتی۔"
سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔
"اس لیے میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ میں کیا چیز کروں اور کیا نہیں۔"
"سالار! تم اس وقت صرف ایک چیز پر دھیان دو... اپنے آپریشن اور علاج پر... باقی ساری چیزیں ہو جائیں گی' بچوں کی تعلیم۔ تمہارا ادارہ... سب کچھ... اور پیسوں کے بارے میں پریشان مت ہو۔ بہت کچھ ہے میرے پاس جو بیچا جا سکتا ہے..."
سالار نے اسے ٹوک دیا۔ "نہیں' کوئی بھی چیز میں اب نہیں بیچوں گا۔ تمہارے پاس یہ سب کچھ ہونا چاہیے۔ میں گھر نہیں دے سکا تمہیں۔ تو کچھ تو ہونا چاہیے تمہارے پاس کہ۔"
امامہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب اس سے آگے کچھ مت کہنا... مجھ سے یہ مت کہنا کہ میں

مستقبل کا سوچوں۔۔۔ یہ سب کچھ میرے پاس ہو اور تم میرے پاس نہ ہو تو میں مستقبل کا کیا کروں گی۔"
پانی اس کے گالوں پر کسی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔
"مستقبل کچھ بھی نہیں ہے سالار۔۔۔! جو ہے بس حال ہے۔ آج ہے آنے والا کل نہیں۔۔۔ پڑھ لکھ جائیں گے بچے۔۔۔ بہت اعلیٰ اسکولز میں نہیں بھی تو بھی۔۔۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے کل کے بارے میں۔" وہ روتی رہی تھی۔
"تمہیں پتا ہے امامہ! مجھے کس چیز کا رنج سب سے زیادہ ہے؟"
"سالار نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے آنسوؤں کو روکنے کے لیے وہ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔" تم ٹھیک کہتی تھیں کہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت سود پر کھڑے اداروں کے لیے کام کرتے کرتے گزار دیا۔ صرف کچھ سال پہلے میں نے کام کرنا شروع کیا ہوتا اپنے ادارے کے لیے تو آج یہ ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوچکا ہوتا۔۔۔ مجھے یہ بیماری تب ہوئی ہوتی تو مجھے یہ رنج نہ ہوتا کہ میں اپنے کیے کا ازالہ نہیں کرسکا۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے میرا۔۔۔ جو کسی طوق کی طرح میری گردن میں لٹکا ہوا ہے۔" وہ بے حد رنجیدہ تھا۔
"تم کیوں سوچ رہے ہو ایسے ہم کوشش تو کررہے ہو۔۔۔ محنت تو کررہے ہو۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش تو کررہے ہو۔۔۔" وہ اس کی باتوں پر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔
"ہاں، لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے۔"
"تم امید چھوڑ بیٹھے ہو؟"
"نہیں۔ امید تو نہیں چھوڑی لیکن۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے ہونٹ کاٹنے لگا" مجھے کبھی یہ لگا ہی نہیں تھا کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ جب تک سب کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ ہر کام کرلیں گے۔ ہر کام ہوجائے گا۔۔۔ ہم وہ سارے کام پہلے کرلینا چاہتے ہیں جو ہمارے نفس کو پسند ہیں وہ سارے کام زندگی کے آخری حصے کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ میں بھی مختلف نہیں تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔۔۔"
سالار اپنے ہاتھ مسل رہا تھا بے حد رنج کے عالم میں۔
"قرآن کہتا ہے ناکہ جب انسان جزا سزا کے لیے روز قیامت اللہ کے سامنے پیش ہوگا تو وہ پکار پکار کر کہے گا کہ اے میرے رب! مجھے ایک بار دوبارہ دنیا میں لوٹا دے۔ ایک موقع اور دے اور اس بار میں تیری اطاعت کروں گا۔۔۔ گناہ سے دور رہوں گا۔۔۔ مجھ سے بہتر کوئی یہ سمجھ نہیں سکتا کہ وہ روز قیامت کیسی ہوگی وہ ایک بار پھر دنیا میں لوٹا دینے کی پکار کیسی ہوگی۔ یہ ایک موقع اور مانگنے کی التجا کیا ہوگی۔"
اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
"ایک بار میں نے مارگلہ کی پہاڑی پر ایک درخت سے بندھے آدھی رات میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے ایک موقع دے کہ میں گناہوں سے تائب ہوجاؤں۔ میں وہ نہ کروں جو کچھ میں کرتا رہا ہوں۔۔۔ اللہ نے مجھے موقع دیا اور میرا خیال تھا کہ میں سب گناہوں سے تائب ہوگیا۔ ایسا نہیں تھا۔ میں چھوٹے گناہوں سے تائب ہوکر بڑے گناہوں میں پھنس گیا تھا۔۔۔ اب ایک موقع میں اللہ تعالیٰ سے اور مانگنا چاہتا ہوں لیکن مجھ میں ہمت ہی نہیں۔۔۔ مجھے اللہ سے بہت شرم آنے لگی ہے۔"
سالار اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔
"اب میں صرف اللہ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ میری زندگی نہیں صرف مجھے اس کام کی تکمیل کرلینے دے جو میں کرنا چاہتا ہوں اور اگر یہ کام میں نہ کرسکا تو پھر میری دعا ہے کہ یہ کام میری اولاد پایہ تکمیل تک پہنچائے اگر میں

نہ رہا تو پھر تم جبریل کو ایک اکانومسٹ..."

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیوں سوچتے ہو تم ایسے۔"

"سوچنا چاہیے امامہ۔"

"تم ہی کرو گے یہ کام سالار...! کوئی اور نہیں کر سکے گا... تمہاری اولاد میں سے بھی کوئی نہیں... ہر کوئی سالار سکندر نہیں ہوتا۔"

وہ شاید زندگی میں پہلی بار اعتراف کر رہی تھی۔ اس کے غیر معمولی ہونے کا... اس کے خاص ہونے کا... اس کے تمام اعترافات اور اظہار ندامت کے باوجود... اس کی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہونے کے باوجود اسے یہ ماننے میں معمولی سا بھی شائبہ نہیں تھا کہ اس کا شوہر عام انسان نہیں تھا۔

سالار نے اس رات اس سے بحث نہیں کی تھی۔ اس کی اپنی ہمت جتنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ امامہ کی ہمت اس طرح توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک اور چیک اپ اور ٹیسٹ کے لیے امریکہ جانا تھا اور وہ مزید کسی بری خبر کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار بھی کر رہا تھا۔



"ممی! میں آپ کو سیب کاٹ کر لا کر دوں؟"

امامہ جبریل کی بات پر حیران ہوئی تھی گھر کے سامان کی پیکنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ ہر روز تھوڑا تھوڑا سامان پیک کر کے اسٹور کرتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ گھر کے ایک کمرے میں اسی کام میں مصروف تھی جب جبریل نے اس کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے یک دم اس سے کہا تھا۔ امامہ کی حیرانی بجا تھی... پھل کاٹ کر کھلانے کی آفر حمین کی طرف سے "تو نارمل" بات تھی لیکن جبریل اس طرح کے کام نہیں کرتا تھا نہ ہی وہ خود پھل کھانے کا شوقین تھا۔

"نہیں... تم کھانا چاہ رہے ہو تو میں تمہیں کاٹ دوں؟" امامہ نے جواباً "اسے آفر کی۔

"نہیں۔" جبریل نے جواب دیا۔ وہ اس کمرے کی کھلی ہوئی وارڈ روب سے کپڑے نکال نکال کر امامہ کے قریب بیڈ پر رکھ رہا تھا جنہیں امامہ ایک بیگ میں رکھ رہی تھی۔ وہ شاید اتنے مہینوں میں پہلا موقع تھا جب امامہ کو تشویش ہوئی تھی۔ اس کے بچے اس کی پریشانی اور تکلیف کو محسوس کرنا شروع ہو گئے تھے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی کئی مہینوں کے بعد اس نے جبریل کو غور سے دیکھا تھا... وہ ایک دو مہینے میں دس سال کا ہونے والا تھا اور وہ دس سال کا ہونے کے باوجود اپنے قد کاٹھ سے دس سال سے بڑا لگتا تھا۔ وہ شکل و صورت میں سالار کی نسبت اس سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا اور حمین سالار سے... لیکن اس کے دونوں بیٹوں کی آنکھیں سالار کی طرح تھیں... بڑی گہری۔ ذہانت سے چمکتی ہوئی... کوئی اگر کسی اور چیز سے نہیں تو آنکھوں سے یہ ضرور پہچان لیتا کہ وہ سالار سکندر کی اولاد تھے۔

"آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" جبریل نے ماں کی نظریں خود پر مبذول پا کر پوچھا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"تم بڑے ہو گئے ہو۔" جبریل نے کچھ جھینپ کر ماں کو دیکھا پھر ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ ماں سے کہا۔

"تھوڑا سا۔"

"ہاں۔ تھوڑے سے... جلد ہی پورے بڑے بھی ہو جاؤ گے۔" وہ بیڈ پر پڑے کپڑے اٹھاتے ہوئے اس سے بولی۔

"لیکن میں بڑا ہونا نہیں چاہتا۔" بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے امامہ نے اسے کہتے سنا' وہ وارڈ روب کی ایک اور

شیلف خالی کر رہا تھا۔
"کیوں؟" اسے ۔۔۔ اچنبھا ہوا۔
"ایسے ہی۔" اس نے بڑے عام سے انداز میں ماں سے کہا۔
وہ پہلا موقع تھا جب امامہ کو اس کا انداز عجیب الجھا ہوا محسوس ہوا۔ اس گھر میں صرف وہ نہیں تھے جو پریشان تھے۔۔۔ ان کی سب سے بڑی اولاد بھی ایسی ہی پریشانی سے گزر رہی تھی لیکن اس پریشانی کی نوعیت کو امامہ تب بوجھ نہیں سکی تھی۔ وہ اسے صرف ایک ردعمل سمجھی تھی۔۔۔ جبریل پہلے بھی ماں کے حوالے سے بے حد حساس تھا۔ اسے کوئی بھی پریشانی ہوتی تو وہ سب سے پہلے محسوس کر لیتا تھا۔ پھر وہ ماں سے کریدے بغیر نہیں رہتا تھا۔۔۔ یہ اس کی فطرت کا حصہ تھا۔
امامہ نے اس چپ کا ٹنے کی آفر کو بھی اسی تشویش کا حصہ سمجھا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ کوئی بھی اسے ان دنوں دیکھ کر یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ پریشان تھی۔۔۔ دنوں میں اس کی گرتی ہوئی صحت، اس کے آنکھوں کے سیاہ حلقے اور اس کی اکثر رونے کی وجہ سے سرخ اور سوجی رہنے والی آنکھیں کسی کو بھی اس کی ذہنی اور جذباتی حالت کا پتا دے سکتی تھیں اس لیے جبریل اگر کوئی اندازہ لگا رہا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔
وہ کچھ الجھتی سوچتی ہوئی اسی طرح سامان پیک کرتی رہی اور وقفے وقفے سے سامان لا کر رکھتے ہوئے جبریل کو دیکھتی رہی پھر جیسے اسے خیال آیا تھا کہ اسے جبریل کو اپنے حوالے سے کوئی تسلی اور دلاسا دینا چاہیے تھا اس کی تشویش کو کم کرنے کے لیے۔
"جبریل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اسے یہ جملہ بولتے ہی اس جملے کے ہلکے پن کا احساس ہو گیا تھا۔ جبریل نے وارڈ روب کے پاس کھڑے کھڑے یک دم جیسے پلٹ کر ماں کو دیکھا اور پھر بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"مجھے پتا ہے۔"
امامہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔ جبریل نے جیسے ماں کا پردہ رکھا تھا۔۔۔ وہ ماں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا نہ ہی اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کئی دنوں کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے سے بات چیت کا موقع مل رہا تھا۔
ایک بار پھر سے وہ دونوں کام میں مصروف ہو گئے تھے اور تب ہی کام کرتے کرتے امامہ نے پہلی بار کمرے کی خاموشی کو محسوس کیا۔ وہ دونوں اتنی دیر سے کام کر رہے تھے لیکن ان کے درمیان بہت کم جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ معمول میں ایسا نہیں ہوتا تھا اسے اور جبریل کو جب بھی اکیلے کچھ وقت گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ دونوں بہت اچھی گپ شپ کرتے تھے۔ جبریل اسے اسکول کی بہت سی باتیں سناتا۔۔۔ اپنے دوستوں کے بارے میں۔۔۔ ٹیچرز کے بارے میں۔۔۔ وہ باتونی نہ ہونے کے باوجود ایسے مواقع پر ماں سے بہت کچھ شیئر کرتا تھا۔۔۔ آج پہلا موقع تھا کہ چھوٹے بہن بھائیوں کی عدم موجودگی میں بھی وہ اتنا خاموش تھا۔
امامہ کی چھٹی حس نے ایک عجیب سا سگنل دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔
"جبریل!"
"جی ممی۔" وہ اس کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سوال کرتے کرتے رہ گئی۔۔۔ کیا پتا یہ اس کا واہمہ ہی ہو وہ واقعی بے خبر ہو اور اگر وہ بے خبر تھا تو اس سے یہ سوال کرنا۔۔۔ وہ بات بدل گئی۔
"تمہارا قرآن پاک ختم ہونے والا ہے بس تھوڑے ہی دن میں۔۔۔ پھر ماشاء اللہ تم حافظ قرآن ہو جاؤ گے۔۔۔ تم نے قرآن پاک سے ابھی تک کیا سیکھا؟" وہ گفتگو کو اس موضوع پر لے آئی جس پر وہ اکثر اس سے بات کرتی تھی۔
وہ اب وارڈ روب کی ایک دراز خالی کرنے والا تھا۔۔۔ ماں کے سوال پر کام کرتے کرتے ٹھٹک گیا۔

"بہت ساری چیزیں ہیں۔" اس نے ذرا سا سوچ کر ماں سے کہا۔
"لیکن اگر کوئی ایک چیز ہو جو تمہیں سب سے امپورٹنٹ بھی لگتی ہو اور سب سے اچھی بھی۔۔۔" وہ مطمئن تھی' ان دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی تھی۔
"آپ کو پتا ہے' مجھے کیا چیز سب سے امپورٹنٹ لگتی ہے قرآن پاک میں؟" وہ بھی اب بے حد دلچسپی سے بات کرنے لگا تھا۔
"کیا؟" "Hope۔(امید)"
امامہ اس کا منہ دیکھنے لگی "کیسے؟" پتا نہیں اس نے کیوں پوچھا تھا لیکن جواب وہ ملا تھا جس نے کسی مرہم کی طرح اس کے زخموں کو ڈھانپا تھا۔
"دیکھیں' سارا قرآن ایک دعا ہے تو دعا hope (امید) ہوتی ہے نا۔۔۔ ہر چیز کے لیے دعا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے نا کہ اللہ ہر مشکل میں ہمیں امید بھی دے رہا ہے۔۔۔ یہ مجھے سب سے اچھی چیز لگتی ہے قرآن پاک کی۔۔۔ کہ ہم کبھی hopeless (ناامید) نہ ہوں۔ کوئی گناہ ہو جائے تب بھی اور کوئی مشکل پڑے تب بھی۔۔۔ کیونکہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔" اس کا دس سالہ بیٹا بے حد آسان الفاظ میں اسے وہ چیز تھما رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔۔۔ جو باتیں دانائی سمجھا نہیں پاتی' وہ معصومیت سمجھا دیتی ہے۔
جبریل بات کرتے کرتے رک گیا اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھی۔
"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" اس نے یک دم بے حد محتاط ہوتے ہوئے ماں سے پوچھا۔
امامہ نے نم آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم نے بالکل ٹھیک کہا اور تم نے بالکل ٹھیک چیز چنی۔"
وہ اب دوبارہ پیکنگ کرنے لگی تھی اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اور اس سے پوچھتے ہوئے کہ اس نے اور کیا چیز سیکھی قرآن پاک سے۔



"آپ بے حد خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنے ٹیومر کے بارے میں اتفاقی طور پر پتا چلا۔ ان اثرات سے پتا نہیں چلا جو ٹیومر کی وجہ سے جسم پر ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں۔" امریکہ میں ایک اور ٹیسٹ کے بعد وہاں کے ایک بہترین نیورو سرجن نے سالار سکندر کو "خوش خبری" دی تھی جو صرف اس کے نزدیک خوش خبری تھی۔
"دو ٹیومر ہیں۔۔۔ ایک بے حد چھوٹے سائز کا اور کچھ بڑا لیکن دونوں فی الحال اس اسٹیج پر ہیں کہ انہیں سرجری کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے بغیر کوئی زیادہ نقصان ہوئے۔" وہ اب رپورٹس اور ٹیسٹوں کے بعد اس کے آپریشن کے حوالے سے صورت حال کو ڈسکس کر رہا تھا۔"
"اور کم سے کم نقصان کیا ہے جو ہو سکتا ہے۔" سالار نے اسے ٹوکا۔
"نیورو سرجری ایک خطرناک سرجری ہے جس جگہ یہ دونوں ٹیومرز ہیں وہ جگہ بھی بہت نازک ہے۔۔۔ آپ کا دماغ متاثر ہو سکتا ہے۔۔۔ آپ کی یادداشت متاثر ہو سکتی ہے۔۔۔ اعصاب پر اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔ جس کے نتیجے میں آپ کو رعشہ کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھار مرگی کا حملہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی نظر متاثر ہو سکتی ہے۔" وہ ڈاکٹر یوں مضر اثرات کو دہرا رہا تھا جیسے کسی ہوٹل کا ویٹر مینو کارڈ دیکھے بغیر بھی وہاں ملنے والے کھانوں کی فہرست پڑھ رہا ہو۔
"اور میں سرجری نہ کرواؤں تو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کچھ عرصہ آپ سرجری کے بغیر گزار سکتے ہیں کیونکہ میں نے آپ کو بتایا ہے ابھی ان ٹیومرز نے آپ کے دماغ اور جسم کو متاثر کرنا شروع نہیں کیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہونا شروع ہو جائے گا اس وقت سرجری بے حد خطرناک ہو جائے گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا ٹیومر فوری طور پر remove کروالیں کیونکہ یہ ذرا بھی بڑا ہوا تو آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔۔۔ دوسرے ٹیومر کو دواؤں اور دوسرے طریقوں سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بڑھنے کو مکمل طور پر روک دیا جائے۔" ڈاکٹر غیر جذباتی انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

وہ بھی غیر جذباتی انداز میں یہ اندازے لگانے میں مصروف تھا کہ وہ سرجری کے بغیر کتنا عرصہ نکال سکتا تھا۔

"چھ سات ماہ۔۔۔ لیکن میں یہ advise نہیں کروں گا کہ آپ اسے زیادہ delay (دیر) کریں۔۔۔ جو میڈیسنز آپ استعمال کر رہے ہیں وہ اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکیں گی آپ کی۔۔۔" سالار سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

ایک مہینے کے بعد اسے کنشاسا چھوڑ کر پاکستان چلے جانا تھا۔۔۔ اس کے تین مہینے کے بعد اسے اپنا ادارہ لانچ کرنا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اس کے لیے یہ تھا کہ وہ ورلڈ بینک کی جاب چھوڑنے کے فوری بعد ایک بار پھر سے اپنے ادارے کے لیے فنڈز پول کرنے کی کوشش کرتا اور ایک بار ادارہ لانچ ہو جاتا تو اس کے فوراً" بعد وہ سرجری کے لیے کبھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسے اس وقت بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت تھی اور وہ بھی سامنے آکر۔ وہ غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا دھچکا ہوتا اس کے ادارے کے لیے' خاص طور پر تب اگر خدانخواستہ اس کی سرجری ٹھیک نہ رہتی۔۔۔ وہ چھ سات ماہ کے بعد سرجری نہیں کروا سکتا تھا اور وہ فوری طور پر سرجری کروانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

تین دن کے بعد کنشاسا واپس آنے پر اس نے امامہ کو یہ ساری صورت حال بتا دی تھی۔ وہ اس کے مخمصے اور الجھن کو سمجھ پا رہی تھی مگر کوئی حل وہ بھی اسے نہیں دے پا رہی تھی۔

اور حل ایک بار پھر جبریل نے ہی دیا تھا۔ سالار اس رات اتفاقی طور پر کسی کام سے لاؤنج میں نکلا تھا جب اس نے دروازہ کھولتے ہی جبریل کو ڈیسک ٹاپ کے سامنے بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ سالار کے یک دم رات گئے وہاں آنے پر اس نے برق رفتاری سے وہ سب کچھ بند کرنا شروع کیا تھا جو سائٹس وہ کھولے بیٹھا تھا۔ مگر وہ کمپیوٹر بند نہیں کر سکا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو جبریل؟" سالار نے لاؤنج کے وال کلاک پر دو بجے کا وقت دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں بابا مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں کارڈز کھیل رہا تھا۔" جبریل نے ڈیسک ٹاپ پر شٹ ڈاؤن کو کلک کرتے ہوئے باپ سے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جیسے کھڑے ہوتے ہوئے ڈیسک ٹاپ کو اپنے عقب میں چھپا لیا تھا یوں جیسے اسے خدشہ تھا کہ باپ تاریک سکرین میں سے بھی یہ بوجھ لے گا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

وہ جواب اگر حمین دیتا تو سالار کی سمجھ میں آسکتا تھا لیکن جبریل کی زبان سے وہ جواب بے حد غیر معمولی تھا۔ وہ اس کے بچوں میں سب سے زیادہ نظم و ضبط کا پابند تھا۔ آدھی رات کو ڈیسک ٹاپ پر بیٹھ کر کارڈز کھیلنے والا بچہ نہیں تھا۔

سالار نے بے حد نارمل گفتگو کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر ڈیسک ٹاپ آن کر لیا تھا۔ جبریل کا رنگ فق ہو گیا۔

"نیند کیوں نہیں آرہی تمہیں؟" سالار نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا جو اس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا گھبرایا ہوا تھا۔ تو انٹرنیٹ پر وہ کون سی ایسی چیزیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ یوں فق ہو گیا تھا۔

سالار کے اپنے پیروں کے نیچے سے بھی اس وقت زمین نکل گئی تھی۔ یہ تو پتا تھا اسے کہ وہ بیٹوں کا باپ تھا اور اس کے بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کی بلوغت کے دوران اسے ایسی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا

بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ پرانی سوچ اور اقدار رکھنے والا باپ نہیں تھا۔۔۔ جس کے پاس غلطی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔۔۔ وہ لبرل تھا۔ اس کے باوجود وہ ہل گیا تھا کیونکہ اس کا بیٹا ابھی صرف دس سال کا تھا اور حافظ قرآن بن رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جبریل نے اس کی بات کا مختصر جواب دیتے ہوئے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ لیے۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو باپ کی نظروں سے چھپانے کے لیے اس سے زیادہ اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا۔ باپ یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس پر شک کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس ڈیسک ٹاپ کو آن کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔

"تم روز دیر سے سوتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال کیا۔

"جی۔" جبریل نے اب جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

روز نیند نہیں آتی اور ڈیسک ٹاپ پر کارڈز کھیلتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا۔

"جی۔" اس نے جیسے بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

ڈیسک ٹاپ آن ہو چکا تھا۔ سالار ہوم پیج کھول چکا تھا۔۔۔ مزید کوئی سوال کیے بغیر اس نے وزٹ کیے جانے والے پیجز اور سائٹس کی ہسٹری کھول لی تھی' وہاں گیمز کا نام شامل نہیں تھا مگر ایک سرسری نظر نے بھی سالار کو منجمد کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا جو کچھ وزٹ کر رہا تھا۔ وہ اسے اس سے چھپانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتا پھر رہا تھا۔

oligodendroglioma۔۔۔ وہ ایک سرسری نظر میں بھی ان سارے پیجز میں چمکنے والا یہ لفظ پہچان سکتا تھا۔۔۔ وہ ان میں سے کسی پیج کو کلک کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اس نے گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا جس کا سانس رکا ہوا اور رنگ فق تھا۔۔۔ "تم میری بیماری کے بارے میں جانتے ہو؟"

یہ سوال کیے بغیر بھی وہ اس سوال کا جواب جانتا تھا۔ جبریل کی آنکھیں سیکنڈز کے ہزارویں حصے میں پانی سے بھری تھیں اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک عجیب خاموشی کا وقفہ آیا تھا جس میں باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر سالار نے اپنے اس دس سالہ بیٹے کو ہاتھ بڑھا کر اپنے گلے سے لگاتے ہوئے گود میں بٹھا لیا۔

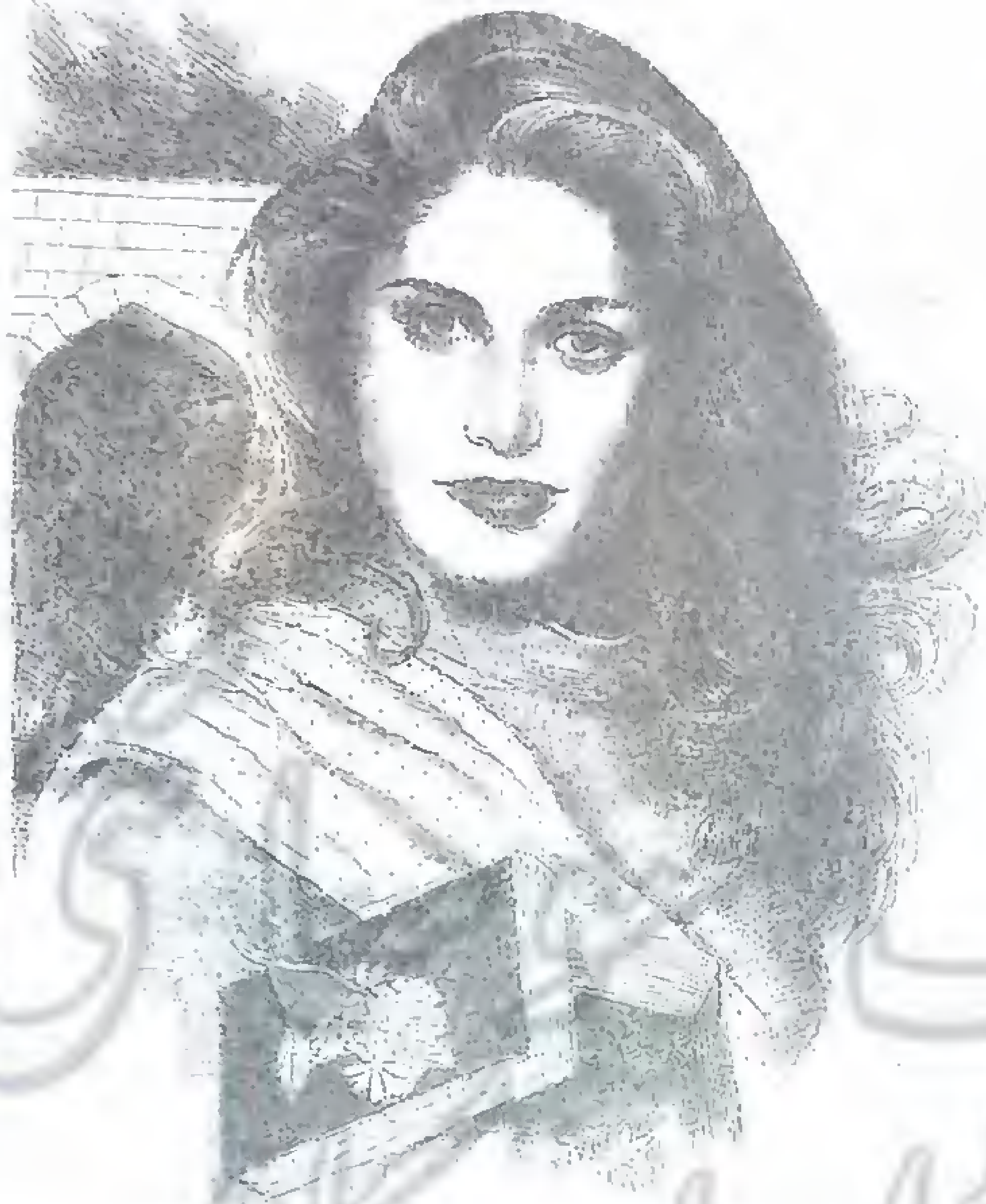
جبریل کے آنسو گالوں پر بہنے لگے تھے سالار نے اسے بچپن میں تو کبھی روتے دیکھا تھا لیکن اب بہت عرصے سے نہیں۔ وہ اسے پچھلے کچھ عرصہ سے "بڑا" سمجھنے لگا تھا اور وہ بڑا اب چھوٹے بچوں کی طرح اس کی گود میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اتنے مہینوں سے وہ راز جو اس کی معصومیت کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ آج افشا ہو گیا تھا۔

"بابا۔۔۔ پاپا" وہ اس کے سینے سے لگا ہوا سسک رہا تھا۔

"I don't want you to die" (میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا) اور یہی وہ لمحہ تھا جب سالار سکندر کے دل سے ہر خوف ختم ہو گیا تھا۔ اسے آپریشن کروانا تھا۔۔۔ فوری طور پر۔۔۔ وہ اپنے خاندان کو اس طرح موت اور زندگی کی امید کے درمیان لٹکا نہیں سکتا تھا۔۔۔ جو بھی ہونا تھا' ہو جانا چاہیے تھا۔

"او کے۔۔۔ I won't۔۔۔" اس نے اپنے بیٹے کا سر چومتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



ہاجرہ ریحان

خوبصورت

مجھے تو ہماری چھوٹی پھوپھی کے لیے یسوداس کے گانے کے کچھ بول بالکل صحیح لگتے تھے۔ "خوب صورت ہے وہ بلا کی۔ اور بلا سے کم نہیں۔"

"پتا نہیں دادا ابا نے کیا سوچ کر چھوٹی پھوپھی کا نام نفیسہ رکھا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید ان کی سوہنی صورت اور بڑی بڑی سی نفیس آنکھیں دیکھ کر دادا ابا کے ذہن میں یہ نام آیا ہوگا۔ اور ایسی بات بھی تھی۔ پہلی بار دیکھنے پر ہر کوئی ان پر فریفتہ ہو جاتا تھا مگر جیسے ہی ان کے طعنے تشنے شروع ہوتے لوگ دبک کر غائب ہو جانے میں عافیت سمجھتے تھے۔

صرف شکل ہی پیاری تھی۔ خاص طور سے مجھ پر اور میرے پالے ہوئے جانوروں سے ان کا بیر اور پھر میری حالت زار پر جب بھی وہ تقریر کرتی تھیں کچھ اس طرح کا نقشہ کھینچ دیتیں کہ میرا تو دل کرتا کہ اسی وقت خودکشی کر کے مرجاؤں۔ مجھ جیسوں کو تو زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ دھرتی کا بوجھ۔ مگر امی کی چہیتی ہونے کے باعث کوئی بھی ان سے منہ ماری نہیں کر سکتا تھا اور اگر کبھی کر بھی لیتا تو اپنا ہی نقصان کرتا۔

ایک امی ہی تھیں ہمارے پورے گھر میں جو چھوٹی پھوپھی کو نہ صرف چپ کروا سکتی تھیں بلکہ اکثر ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھی رکھتی تھیں۔ویسے ایسے حسین لمحات میں نے کم ہی دیکھے۔ یادگار بات یہ ہے کہ جب امی چھوٹی پھوپھی کو ڈانٹنا شروع کرتیں تو وہ چپ کر کے سر جھکا کر ایک جگہ جم کر کھڑی ہو جاتیں۔ آنکھ کا کاجل۔ کچھ پھیل سا جاتا۔ نظریں بوجھل ہو جاتیں۔ اور تھوڑی ہی دیر کے ضبط کے بعد۔ آنکھوں کا کاجل بہہ نکلتا اور چہرے پر وہ چار لمبی لمبی کالی لکیریں بڑی بھلی لگتیں۔ یہ حد تھی۔ اس کے بعد امی سنبھل کر ان کو کمرے میں جانے کا کہہ دیتیں۔

ہم سب بھائی بہنوں کے لیے ہی کیا اگر کوئی رشتہ دار (جو کہ اکثر ہی ہوتے تھے) موجود ہوتا تو اس کے لیے بھی یہ معجزہ جیسا کچھ واقعہ ہوتا۔ امی کا چھوٹی پھوپھی سے رشتہ کچھ ایسا ہی تھا۔ بقول دادا ابا کے۔ چھوٹی پھوپھی کو امی ہی نے تو پالا تھا۔

مجھے تو چھوٹی پھوپھی میں کوئی جاذبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بس اچھی بات اگر کوئی تھی بھی تو اتنی کے وہ پڑھنے میں بڑی اچھی تھیں۔ اور ان کی ذہانت میں کوئی شک نہیں تھا۔ میں دل سے دعا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد چھوٹی پھوپھی کو ہم سے جدا کردے۔ پہلی بار میری یہ دعا قبول ہوئی تو میرا خدا پر یقین پختہ ہو گیا۔

چھوٹی پھوپھی نے کراچی یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں سے مائیکرو بیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور اسکالر شپ لے کر امریکہ کی الاباما اسٹیٹ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے تین سال کے لیے چلی گئیں۔ ہم سب یعنی کے تمام بھائی بہنوں سمیت چند ایک کزن نے ان کے جاتے کے ساتھ ہی خوشی کے ترانے گائے۔ اور سکھ کا سانس لیا۔ مگر کیا ہی سچ کہا گیا ہے کے خوشی کے دن جلد گزر جاتے ہیں۔ تین سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ میں اس وقت تک آٹھویں پاس کر چکی تھی اور نویں جماعت یعنی کے بورڈ کے امتحانات کے قصے سن سن کر ویسے ہی پڑھائی پر اپنا اعتماد کھو چکی تھی۔

چھوٹی پھوپھی نے آتے کے ساتھ ہی سب سے پہلے مجھ غریب پر نظر کرم کی اور امی کو صاف صاف بتا دیا کہ یہ لڑکی ہمارے پڑھے لکھے خاندان پر بدنما داغ بن کر دکھائے گی لہٰذا اس کا انتظام کرنا لازمی ہے۔ امی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"تو کیا انتظام کیا جائے تمہارا لڑکی؟"

امی آپ میری شادی کر دیں' یوں میں کسی اور خاندان کی ہو کر ان کا نام بدنام کرتی رہوں گی اور آپ سب بچ جائیں گے۔"

یہ سننا تھا کے چھوٹی پھوپھی نے اپنی کاجل سے بھری آنکھیں گول گول گھمانی شروع کر دیں جیسا کہ بندوق کی لبلبی دبانے سے پہلے فلموں میں ہیرو بندوق کو اپنی انگلی میں گول گول گھماتا ہے۔ ظاہر ہے نشانہ میں ہی تھی۔ اس کے بعد کئی دن تک چھوٹی پھوپھی جب بھی مجھے دیکھتیں۔ دو چار طعنے مار کر ہی کسی اور کی طرف رخ کرتی تھیں۔ اور تھوڑی ہی عرصے میں ہم سب پھر سے اپنی اپنی بے کار زندگیوں سے واقف ہو کر شرمندہ سانسیں لینے لگے۔

چھوٹی پھوپھی کو گورنمنٹ کے ادارے اینمل ہسبنڈری میں جاب ملی۔ یہاں پر مرغیوں کی غذا اور ان کی بہتر نشوونما کا ڈپارٹمنٹ چھوٹی پھوپھی کے ذمہ تھا۔ جہاں مرغیوں کی غذا اور نشوونما پر ریسرچ بھی ہوتی تھی اور ساتھ میں شہر میں کہیں بھی کوئی پولٹری فارم کھولا جاتا تو اس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے او کے

سرٹیفکیٹ لینا لازمی تھا۔

اس سلسلے میں چھوٹی پھوپھی نے چند ہی دنوں میں تمام موجود اور وجود میں آنے والے پولٹری فارم کے مالکوں کا ناک میں دم کردیا تھا۔ جو ٹیم جاتی وہ اگر مرغیوں کی رہائش اور غذا میں ذرہ برابر بھی کمی پاتی جرمانے کے ساتھ ساتھ پولٹری فارم کو بند کردینے کا حکم نامہ جاری کردیتی۔ اوپر سے دورے بھی اچانک کیے جاتے تھے۔ جیسی بددماغ وہ گھر پر مشہور تھیں ویسی ہی کچھ اپنے ڈپارٹمنٹ کی بھی مشہوری کررہی تھیں اور بضد تھیں کہ وہ عوام کی صحت کی محافظ بنائی گئی ہیں تو یہ کام وہ دیانت داری سے ہی سرانجام دیں گی۔ چاہے کوئی خوش ہو' چاہے گالیاں ہزار دے۔

یہ سب باتیں وہ بڑی تفصیل سے امی کو صبح ناشتے کی میز پر سناتی رہتی تھیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے چند ایک اچھی مرغیاں یا چوزے لاکردے دیں کیوں کہ ان کے ڈپارٹمنٹ میں ریسرچ کے لیے ہر قسم کے چوزے لائے جاتے تھے۔ اس لیے بہت ہی آفس کی سیاسی باتیں سنتے رہنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتی تھی۔ نویں جماعت شروع ہونے میں کافی وقت تھا' یوں میں اپنا یہ قیمتی وقت اپنے فارم میں مرغیوں یا چوزوں کے اضافے کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

میں صبح صبح اٹھ کر ناشتے کی میز پر پہنچ جاتی پہلے کالج' اسکول یونیورسٹی جانے والوں کا ناشتے کی میز پر رش ہوتا۔ اس کے بعد چھوٹی پھوپھی خراماں خراماں اپنے کمرے سے تیار ہوکر میز پر آتیں۔۔۔ امی۔۔۔ چھوٹی پھوپھی کے ساتھ ہی ناشتا کرتی تھیں اور ان کی آفس پالیٹکس پر چھوٹی پھوپھی کو ہلکا پھلکا اشارہ بھی دیتی رہتی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں میرے مطلب کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک دن امی گھبرا گئیں کیوں کہ چھوٹی پھوپھی نے بتایا کہ کراچی کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کے کچھ لوگوں نے بہت بڑی سی زمین لے کر وہاں پولٹری فارم لگانے کا عندیہ دیا ہے اور چند ایک روز میں ہماری ٹیم وہاں جانے والی ہے۔ چھوٹی پھوپھی کو اپنے ذرائع سے خبر مل گئی تھی کہ زمین قبضہ کی گئی ہے اور پولٹری فارم کے لیے جو کچھ درکار ہوتا ہے وہ بھی وہاں موجود نہیں۔۔۔ یعنی صرف نام کو پولٹری فارم کھولا جارہا ہے۔ اصل میں وہاں کچھ اور کام کیے جائیں گے۔ امی نے ملتجی انداز میں چھوٹی پھوپھی کو ہدایات دیں کہ "وہ لوگ جو کہتے ہیں کردیں۔" مگر چھوٹی پھوپھی بضد ہوگئیں۔

"بھلا ایسا کیسے کرسکتی ہوں بھابھی۔۔۔! آپ ہی بتائیں۔۔۔ وہ جگہ پولٹری فارم کے لیے استعمال ہی نہیں کی جارہی تو ہمارا ڈپارٹمنٹ کس بات پر سرٹیفکیٹ جاری کردے۔"

امی نے چھوٹی پھوپھی کے جھنجلا کر اٹھ کھڑے ہونے پر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ جذباتی لمحہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ امی نے اپنی بات پھر سے دہرائی۔

"تم جو ٹیم بھیجوگی وہ سرٹیفکیٹ جاری کرکے ہی آئے گی۔۔۔ سمجھیں تم؟"

چھوٹی پھوپھی نے نرمی سے امی کا ہاتھ جھٹک دیا اور آفس کے لیے آنے والی وین کا ہارن سن کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد چھوٹی پھوپھی ناشتے کی میز پر کم ہی نظر آتیں۔ آتیں بھی تو اس وقت جب پورا گھر موجود ہوتا اور امی کچھ ایسی مصروف ہوتیں سب کو کھلانے پلانے میں کہ دونوں کو نظریں ملانے کا بھی وقت نہ ملتا تھا۔

مجھے بڑی حیرت تھی کہ ہمارے ہونے والے پھوپھا جان نے کیسے چھوٹی پھوپھی سے شادی پر ہامی بھرلی۔ ارے کیا اندھے ہیں؟ میں کئی بار سوچ چکی تھی۔

خیر! دیکھنے میں تو نفیسہ صاحبہ اچھی ہی لگتی ہیں' مگر ابھی بیچارے نے ان کی زبان سے برسنے والی گولیاں نہیں چکھی ہیں۔ تب ہی دھوکا کھا گئے ہیں اور یوں شادی کے دن قریب آگئے۔ امی چھوٹی پھوپھی پر واری صدقے جارہی تھیں اور گھنٹوں دونوں بیٹھ کر گپ لگاتی رہتیں۔

مجھ غریب پر نظر کرم کچھ خاص ہی تھی تب ہی مجھے

ان کے ساتھ بیوٹی پارلر بھیجا گیا تھا۔ ویسے بھی میرا دل اپنے ہونے والے چھوٹے پھوپھا جان کی بدقسمتی کا سوچ کر ہی دکھ سے لبریز تھا۔ لہٰذا تیاری تو مجھے کیا خاص کرنی تھی۔

"ہائے بچارے اچھے خاصے ہی ہیں... اللہ جانے کیسے انہوں نے چھوٹی پھوپھی کو پسند کرلیا... چچ چچ... کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے گی۔"

مگر اس وقت میری خوشی کی انتہا ہو جاتی جب یہ سوچتی کہ چھوٹی پھوپھی پیا دیس جا رہی ہیں یعنی کہ میری آزادی... ہائے... اللہ جلد از جلد... میں اپنے اس طرح کے خود غرض عزائم سے خود ہی سرشار بھی ہو جاتی اور پھوپھا جان کی بدقسمتی کا سوچ کر پھر سے رنجیدہ ہو جاتی۔ یہ خوش اور رنجیدہ ہونے کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ مجھے کسی نے آکر بیوٹی پارلر سے باہر بابا جانی کے آنے کی اطلاع دی' میں اس وقت بیوٹی پارلر کے ڈریسنگ روم میں بیٹھی تھی اور چھوٹی پھوپھی بیوٹی پارلر میں اندر تیار ہو رہی تھیں۔

میں باہر آئی تو دیکھا بابا جانی کا رنگ اڑا اڑا سا ہے۔ انہوں نے مجھے جلدی سے گاڑی میں بٹھا لیا جس میں بابا جانی کے کچھ دوست بھی موجود تھے اور کچھ کہے بغیر گاڑی چل پڑی۔ میں نے گھبرا کر پلٹ کر بیوٹی پارلر پر نظر کی اور بابا جانی کو بتانا ہی چاہتی تھی کہ چھوٹی پھوپھی بھی میرے ساتھ ہیں کہ بابا جانی نے مجھے ٹوک دیا اور یوں ہم خاموشی سے گھر آگئے۔

گھر میں داخل ہو کر عجیب سا احساس ہوا۔ وہ خوشی اور ہلچل جو میں چھوڑ کر دوپہر کو چھوٹی پھوپھی کے ساتھ نکلی تھی کہیں بھی نہیں تھی۔ کچھ بڑے بوڑھے دادا ابا کے ساتھ بیٹھے تھے جیسے ان کو دلاسا دے رہے ہوں۔ امی نے مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا اور پیار کرنے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں مجھے بھی بتا دیا گیا کہ چھوٹی پھوپھی کو بیوٹی پارلر سے اغوا کرلیا گیا ہے۔ شکر ہے تھا کہ چھوٹی پھوپھی نے ان لوگوں کو میری خبر ہونے نہیں دی تھی۔ اغوا کرنے والوں نے بیوٹی پارلر سے ہی فون کرکے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کس سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور پولیس میں جانے سے نقصان کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے کہ کر دھمکی بھی دے دی تھی۔

بابا جانی پوری رات اپنے چند دوستوں کے ساتھ دوڑتے رہے۔ چھوٹی پھوپھی کے آفس کے "تقریباً" تمام لوگ ہی رات بھر ہمارے ساتھ رہے۔ اس زمانے میں موبائل فون نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اگر گھر سے نکل جاتا تو اس کے آنے تک اس کی خیر خبر حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ امی روتی چلی جا رہی تھیں اور کبھی جائے نماز بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ ہم سب بھائی بہن اور گھر میں آئے ہوئے مہمان رشتہ دار بھی سہمے ہوئے تھے۔ فجر تک بابا جانی بھی واپس آگئے۔ ان کے ساتھ ان کے کچھ دوست اور ایک دو اسٹوڈنٹس تھے جو کبھی بابا جانی کو پولیس میں جانے کا مشورہ دیتے اور کبھی دھمکی کے بارے میں بات کرکے خود کو بہلاتے کہ بہتر یہی ہے کہ انتظار کیا جائے۔ تمام گھر سجا ہوا تھا' مگر گھر میں ایک ماتم کا سا سماں تھا۔

بابا جانی کے دوست باہر لان میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔ جبکہ گھر کا دروازہ بھاڑ سا کھلا پڑا تھا۔ اندر دالان میں امی نے صبح کے ناشتے کی تیاری شروع کردی تھی۔ جو مہمان تھے اور جو لوگ بابا جانی کے ساتھ پوری رات دوڑتے رہے تھے آخر کو انسان تھے اور سب کے چائے کھانے کی حاجت بہرحال اپنی جگہ پہ تھی۔ صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ چھوٹی پھوپھی کے آفس کے چند لوگ جا چکے تھے اور رشتہ دار ناشتا کرکے ٹولیوں میں بکھرے ایک دوسرے سے دبے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں ابھی چائے کی ٹرے لے کر باہر موجود بابا جانی کے دوستوں میں پہنچی ہی تھی کہ دیکھا ایک اسکول کی سوزوکی وین جیسی کھٹارہ سی گاڑی بھاڑ سے کھلے دروازے پر آکر رکی۔ شہاب انکل جو کہ بابا جانی کے اسٹوڈنٹ بھی تھے اور دوست بھی' میری ٹرے سے چائے کا کپ اٹھاتے رک گئے۔ ہم دونوں نے دم بخود ہو کر دیکھا کہ سوزوکی میں بیٹھنے والی پیچھے کی ڈبہ نما جگہ

سے چھوٹی پھوپھی زرق برق لال لباس میں نمودار ہوئیں۔ اترتے وقت اس کی کسی درز میں ان کے کپڑے پھنسے اور وہ دھڑام سے منہ کے بل سڑک پر گر پڑیں۔

شہاب انکل بھاگے اور اس سے پہلے کہ وہ سوزوکی تک پہنچتے۔ سوزوکی زن سے آگے بڑھ چکی تھی۔ چھوٹی پھوپھی کے کپڑوں کا کچھ حصہ سوزوکی کے پچھلے حصے میں کسی چیز میں پھنس گیا تھا جس کی وجہ سے سوزوکی آگے بڑھی تو چھوٹی پھوپھی جو منہ کے بل گری تھیں اسی حالت میں سوزوکی کے ساتھ گھسٹتی جانے لگیں۔ شہاب انکل جب تک چھوٹی پھوپھی کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ چکے تھے اور یوں سوزوکی بھچھوٹی پھوپھی کے لال جوڑے سے کچھ حصہ پھاڑ کر اپنے ساتھ لیتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ شہاب انکل نے چھوٹی پھوپھی کو اسی تیزی اور طاقت سے دونوں کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا تھا۔ اتنی ہی دیر میں گھر کے باقی لوگ بھی باہر آچکے تھے۔

چھوٹی پھوپھی کا چہرہ سپاٹ تھا' مگر ان کی آنکھوں کا کاجل بہہ کر ان کے چہرے پر لکیریں بنا چکا تھا۔ شاید گرنے سے ان کی ٹانگ میں چوٹ آگئی تھی' جس کے باعث وہ ہلکا سا لنگڑاتی چھوٹے چچا کا سہارا لیے ہی گھر میں داخل ہوئیں۔ تمام لوگ اب باہر کھڑے تھے اور چھوٹی پھوپھی اندر جارہی تھیں۔ میں بھاگ کر چھوٹی پھوپھی کے پیچھے ہولی تھی۔ دالان تک پہنچتے ہی چھوٹی پھوپھی کے منہ سے ہلکے سے پکار نکلی۔

"بھابھی۔۔۔ بھابھی۔۔۔!"

آٹے سے لتھڑے ہاتھ لیے امی کچن سے برآمد ہوئیں۔ انہوں نے چھوٹی پھوپھی کو آگے بڑھ کر

سمیٹنے لگے۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔

"کیا بہت رو رہی ہیں؟" میں نے دکھ سے اثبات میں سرہلا دیا۔ انہوں نے پھر کہا۔

"ان کے پاؤں پر شدید چوٹ لگی ہے۔ خون بہہ رہا تھا میں نے دیکھا تھا۔ سر (بابا جانی) سے کہو کسی ڈاکٹر کو بلالیں۔"

میں نے اسی طرح منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

"چھوٹے چچا ڈاکٹر ہیں وہ دیکھ رہے ہیں۔"

شہاب انکل سرہلاتے چپ ہوگئے۔



امی کافی پریشان تھیں کیوں کہ چھوٹی پھوپھی نے الاباما کی اسٹیٹ یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی آفر قبول کرلی تھی اور اب وہ جانے کے لیے تیاری پکڑ چکی تھیں۔ اس کہانی کا انجام اور کیا ہونا تھا۔ یہاں پر چھوٹی پھوپھی اب کسی طرح بھی رہنے کو تیار نہیں تھیں اور امی جانتی تھیں کہ ایک بار چھوٹی پھوپھی اس طرح ٹوٹے دل کے ساتھ چلی گئیں تو پھر کبھی واپس نہیں آئیں گی' مگر کسی کے پاس انہیں روکنے کا کوئی حیلہ بہانہ نہیں تھا۔

چھوٹی پھوپھی کی زبان۔ اس دن سے جو بند ہوئی تھی تو اب تک بند ہی تھی' وہ ضرورت پڑنے پر بھی بات کرنے کے بجائے اس جگہ سے ہی دور چلی جاتیں جہاں ان کی آواز کی ضرورت محسوس ہوتی۔ بابا جانی چھٹیاں ختم ہوجانے پر واپس پردیس سدھار چکے تھے اور یہاں پر دادا ابا اور امی کے دلاسوں پر چھوٹی پھوپھی اور بھی خود میں گم ہوجاتی تھیں۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے بیٹھ کر آنے والے یا گزر چکے وقت پر

بانہوں میں بھر لیا اور پھر پہلی بار میں نے چھوٹی پھوپھی کے اس طرح سسک سسک کر رونے پر کوئی خوشی محسوس نہیں کی بلکہ میرا دل ڈوب گیا۔ میں منہ بسورتی واپس باہر آگئی اور پورے لان میں بکھرے ہوئے چائے کے کپ جمع کرکے ٹرے میں رکھنے لگی۔ اتنے میں شہاب انکل بھی آکر میرے ساتھ چائے کے کپ

کوئی بھی بات کرسکے۔ بابا جانی سے امی نے فون پر بات کی اور یہی طے ہوا کہ ابھی چھوٹی پھوپھی کو جانے دیا جائے۔

ہم سب ایئرپورٹ پر چھوٹی پھوپھی کو چھوڑنے پہنچے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جب چھوٹی پھوپھی پڑھنے جارہی تھیں تو ہم سب کزن اور بھائی بہن کیسی

خوشی محسوس کر رہے تھے' مگر آج ہم سب کے دل اداس تھے۔ امی نے بھینچ کر چھوٹی پھوپھی کو آخری بار گلے سے لگالیا اور پھر اپنے لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرو۔۔۔"

چھوٹی پھوپھی کی آنکھوں کا کاجل پھیلا اور ان کے چہرے پر دو چار لکیریں بناتا ٹپ ٹپ بہنے لگا۔

"آپ کو اب تک امید ہے۔۔۔ داد دیتی ہوں۔" انہوں نے رندھے ہوئے لہجے میں امی سے کہا اور ہینڈ بیگ اٹھا کر ہم سب کی طرف دیکھے بغیر چلی گئیں۔

چھ مہینے کے بعد امی کو چھوٹی پھوپھی کا ایک لمبا چوڑا سا خط ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے شب و روز کیسے گزار رہی ہیں اور ایک دو جملے میں شہاب انکل کا بھی تذکرہ تھا کہ کیسے شہاب انکل ان سے ملے اور پہچان گئے جبکہ چھوٹی پھوپھی ان کو بالکل بھی پہچان نہیں سکی تھیں۔

دوسرے خط میں معمول سے ہٹ کر صرف ایک یہی بات تھی کہ شہاب انکل پاکستان آرہے ہیں اور ان کے ہاتھ چھوٹی پھوپھی نے ہم سب کے لیے کچھ تحفے بھجوائے ہیں۔

شہاب انکل آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ بس ایک بار ہی ہمارے گھر اپنی والدہ کے ہمراہ آئے تھے اور امی اور دادا ابا سے اکیلے میں کچھ بات کر کے چلے گئے۔ مجھے خبر اس وقت ہوئی جب پتا چلا کہ بابا جانی لندن سے ہی الاباما چلے گئے اور ایک مسجد میں سادگی سے شہاب انکل کے دو چار دوستوں اور چھوٹی پھوپھی کی دو چار مسلمان کولیگز کی موجودگی میں چھوٹی پھوپھی کا نکاح شہاب انکل کے ساتھ کروا دیا۔ رشتہ داروں میں خبر کردی گئی اور ہمارا گھر چھوٹی پھوپھی کے بغیر رہنے کا عادی ہو گیا۔

بڑی باجی کی شادی پر چھوٹی پھوپھی کی شرکت کی امی نے سختی سے ہدایات جاری کردیں جو کہ بادل نخواستہ قبول کرلی گئیں۔ سب گھر والے مصروف تھے لہٰذا مجھے دادا ابا کے ساتھ ایئرپورٹ بھیجا گیا کہ چھوٹی پھوپھی اور شہاب انکل کو لے آؤں۔ ایئرپورٹ تک جاتے وقت تو سب ٹھیک تھا کہ میں چھوٹی پھوپھی کا آخری بار چپ چاپ رہنے والا انداز دیکھ چکی تھی اور دل میں سمجھ رہی تھی کہ ابھی بھی گونگی سی نفیسہ شہاب تشریف لائیں گی اور چوں چراں کیے بغیر میرے ساتھ گھر کو روانہ ہو جائیں گی' مگر ہائے ری قسمت۔۔۔ کہاں لاکر مجھے دغا دی۔

چھوٹی پھوپھی نے پہلے تو ادب سے دادا ابا کو سلام کیا' گلے لگیں اور پھر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"ہیں۔۔۔ کیا کھانے لگی ہو؟ کتنی موٹی ہو گئی ہو اور کیا گھر میں تمہارے کپڑے نہیں بنتے جو اس حلیے میں تشریف لائی ہو۔ یہ بالوں کا حشر تو دیکھو۔۔۔ ابھی تک بے قابو' جب بال سنبھالے نہیں جاتے تو رکھے ہی کیوں ہیں۔ کٹوا دو بلکہ تم تو گنجی ہو جاؤ۔ اب میں آگئی ہوں۔ دیکھنا سب سے پہلے تم کو درست کروں گی۔"

میں نے پیچھے کھڑے شہاب انکل کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے۔ اب چھوٹی پھوپھی' دادا ابا کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے چل رہی تھیں جب کہ میں اور شہاب انکل ان دونوں سے کچھ فاصلے پر پیچھے چل رہے تھے۔ میں نے سامنے کی طرف نظر رکھتے ہوئے شہاب انکل سے کہا۔

"یہ کیسے ہو گیا۔۔۔ ان کی زبان تو پھر چل پڑی۔"

میں نے محسوس کیا کہ شہاب انکل ویسے ہی مسکراتے چلے جا رہے ہیں جیسے ان کو میری بات سنائی ہی نہیں دی کہ اچانک چھوٹی پھوپھی رک کر مڑیں' شہاب انکل کے کان کی طرف اشارہ کیا اور پھر میری طرف' مطلب یہی تھا کہ میں کچھ بک رہی ہوں۔ جس پر شہاب انکل گڑبڑا گئے اور پہلی بار انہوں نے مجھے سر جھکا کر دیکھا اور جھینپ کر سوری کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے دونوں کانوں میں ٹھونسی روئی باہر نکال کر میری ہاتھ کی مٹھی میں دباتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"لو۔۔۔ اب اس کی ضرورت تمہیں پڑنے والی ہے۔"



مت پرندے اُڑائیے صاحب
ان کو دانہ کھلائیے صاحب

سات پریوں کا ذکر ہے جس میں
وہ کہانی سنائیے صاحب

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے
اس کو جتنا چلائیے صاحب

آپ ہی ہیں نا دعویٰ دارِ سخن
چلیے! مصرع اُٹھائیے صاحب

باولا بھی ہے، بدتمیز بھی ہے
دل کے مُنہ کو نہ آئیے صاحب

شعر چوری بھی کام ہے کوئی
میری نیندیں چرائیے صاحب

سید کامی شاہ

انجان بن رہا تھا مگر جانتا بھی تھا
دل کو محبتیں بھی تھیں اس سے گلہ بھی تھا

اب یاد کچھ نہیں رہا بچھڑے تھے کس جگہ
کچھ دُور ساتھ ساتھ وہ میرے چلا بھی تھا

پچھلے برس ملا تھا بڑے اہتمام سے
آنکھوں میں رت جگے بھی تھے رنگِ حیا بھی تھا

برہم سا ہو بھی جاتا تھا وہ میرے ذکر پر
لیکن اکیلے پن میں مجھے سوچتا بھی تھا

یہ اور بات ہے کہ نہ راس آئیں رونقیں
اک شہر آرزوؤں کا دل میں بسا بھی تھا

اب اختلاف کرتا ہے میرے خیال سے
پچھلے برس تو ساتھ مرے آئینہ بھی تھا

محمود غزنوی

شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اپنے مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کیا کرو۔ انہیں اللہ تعالیٰ ہی کھلاتا اور پلاتا ہے۔"
فوائد و مسائل:۔
1۔ مریض کے لیے صحت مند انسان والی غذا مفید نہیں ہوتی اس لیے انہیں بھاری غذا نہ دی جائے۔
2۔ اگر مریض کی طبیعت کھانے پینے پر آمادہ نہ ہو تو سختی نہ کی جائے کیونکہ زبردستی کھلائی ہوئی غذا فائدے کے بجائے نقصان پہنچاتی ہے۔
3۔ مناسب ترغیب کے ذریعے سے ہلکی پھلکی زود ہضم غذا دی جا سکتی ہے تاکہ قوت قائم رہے۔
4۔ اللہ تعالیٰ مریض کو کھلاتا پلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں تندرست آدمی کی طرح کھانے پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسانیت،

انسانیت ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس کو لباس میں نہیں انسان میں تلاش کرو۔
(حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

پرانا رواج،

کسی شہر کے نئے حاکم نے مقامی عمائدین کے اعزاز میں شاندار ضیافت دی۔ اس موقع پر بہت سے موسیقار بھی حاضرین کا جی بہلانے کو موجود تھے۔ محفل عین شباب پر تھی کہ ایک گلوکار نے گانا شروع کر دیا۔
"پرانا گیا، نیا آگیا، منحوس ستارہ ڈوبا، بابرکت ستارہ طلوع ہوا۔"
حاکم بہت خوش ہوا اور پوچھا "یہ گیت کس نے لکھا ہے؟"
"یہ تو اس شہر کا پرانا رواج ہے۔ ہر نئے حاکم کے آنے پر یہی گیت گایا جاتا ہے اور مجھے بھی دو مصرعے یاد ہیں۔" گلوکار نے جواب دیا۔
(سنگ ون ینگ کی تصنیف۔ قدیم چینی حکایتیں)
عائشہ، تحریم۔ کراچی

نمک پارے،

- جب لوگ کسی شاعر کی نظم کو سمجھ نہیں سکتے تو وہ فوری فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ یہ نظم بے معنی اور بکواس ہے ـــــ اس کے برعکس جب کسی سیاست دان کا کوئی نظریہ ان کے فہم و ادراک سے بالا ہوتا ہے تو وہ نہایت سنگین صورت بنا کر کہتے ہیں "افسوس ہم میں تعلیم کی کمی ہے۔"
(برٹرنڈرسل)
- سائنس کی ہر ترقی تصور کی حیرت انگیز فتح کی کھلی دلیل ہے۔ (ٹاگاوٹ)
- سفیر اپنے ملک کی "آنکھ" اور "کان" ہوتا ہے۔
(ڈیبی)
حرا قریشی۔ ملتان

نئے سال تم جب بھی آنا،

نئے سال تم جب بھی آنا
سب کے لیے بس خوشیاں لانا
ہر چہرے پر ہنسی سجانا

ہر آنگن میں پھول کھلانا
جو بچھڑے ہیں انہیں ملانا
جو روتے ہیں انہیں ہنسانا
جو سوئے ہیں انہیں جگانا
جو روٹھے ہیں انہیں منانا
سب کے لیے بس خوشیاں لانا

صائمہ جبیں۔ کراچی

سنہری بات،

اچھی بات چاہے کوئی کیسے بتلے باندھ لو کیونکہ جب موتی کی قیمت مقرر کی جاتی ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سمندر کی تہہ سے لانے والا شریف ہے یا ذلیل۔

شبنم شمشاد۔ یزمان

تحفہ،

گلوکار کی بیوی نے شوہر سے کہا۔
"پچھلے ماہ تم نے آصف بیٹے کی سالگرہ پر تحفے میں جو طبلہ لاکر دیا تھا، میرا خیال ہے پڑوسیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔"
"تمہیں یہ کیسے اندازہ ہوا۔؟" گلوکار نے راگ الاپتے الاپتے رک کر پوچھا۔
"کل میں نے سنا ہمارے پڑوسی کمال صاحب ننھے آصف کو ایک چاقو دے کر کہہ رہے تھے۔
"بیٹا! ذرا دیکھنے کی کوشش تو کرو کہ طبلے کے اندر کیا ہے؟"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

آنکھیں بولتی ہیں،

- چھوٹی آنکھوں والے ایسے لوگ بہت ملنسار اور وفا شعار ہوتے ہیں۔
- گول آنکھوں والے... ایسے افراد دوستی میں حالات کو مدنظر رکھتے ہیں بلاوجہ دوستی نہیں کرتے۔
- بہت موٹی آنکھوں والے... ایسے لوگ زیادہ دلیر نہیں ہوتے۔ اکثر کو سانس بھول جانے کی شکایت ہوتی ہے۔
- سیاہ آنکھوں والے... اس قسم کے افراد حالات سے بے خبر ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔
- بھوری آنکھوں والے... ایسے مرد ساری زندگی عشق کے دائرے سے نہیں نکلتے اور عورتیں بہت ضدی ہوتی ہیں۔
- شربتی آنکھوں والے... ان کی گھریلو زندگی کشمکش کا شکار رہتی ہے۔ ان کے ہاں شک و شبہ زیادہ پایا جاتا ہے۔
- دھنسی آنکھوں والے... ایسے لوگ کسی کے ماتحت کام نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ آزادی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

سربراہ مملکت کا گھر،

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک قریبی رشتہ دار حضرت عمرؓ سے ملنے آیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ام کلثوم کو آواز دی۔
"ہمارے لیے کھانا لائیں۔"
حضرت ام کلثوم نے روٹی، زیتون کا تیل اور نمک پیش کر دیا۔
آپؓ نے فرمایا۔ "آپ بھی آجائیں، ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔"
فرمایا۔ "مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوتا کہ ان کپڑوں میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔ دیکھیے نا حضرت جعفرؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ اپنی بیگمات کو کتنا اچھا عمدہ اور اعلا لباس لاکر دیتے ہیں اور میں ہوں امیر المومنین کی بیوی اور یہ سادہ لباس، ہمارے یہ عزیز مہمان کیا کہیں گے؟"
حضرت عمرؓ نے اپنی بیگم کی یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔
"کیا تم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ لوگ تمہیں حضرت علیؓ کی بیٹی اور امیر المومنین کی بیگم کے نام سے پکاریں؟"
اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے مہمان سے کہا۔

"آیئے قریب ہو جائیں اور کھانا تناول کریں، جو گھر میں تھا، آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"
حضرت ام کلثوم حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی صاحب زادی اور امام حسینؓ اور امام حسنؓ کی بہن تھیں۔ حضرت عمرؓ نے عزت و شرف کے لیے ان سے نکاح کیا تھا۔
نازیہ ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

علاج،

میاں نفیس احمد ایک ماہر نفسیات کے پاس پہنچے اور بولے۔
"میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا ہے۔"

"اچھا اچھا۔" ماہر نفسیات نے کہا۔
"تو آپ کی قوت ارادی کو مضبوط کر دوں تاکہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کر سکیں اور غلطی کی تلافی۔"
"نہیں، نہیں۔" میاں نفیس جلدی سے بولے "میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کر دیں۔"
نوال افضل گھمن۔ گجرات

پہچان،

"لیکن بیگم صاحبہ! جس کار نے ٹکر مار کر آپ کو نیچے گرایا تھا اس کا نمبر تو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا؟" بیگم صاحبہ سے سپاہی نے پوچھا۔
"نہیں، میں نے نمبر نہیں دیکھا۔" بیگم صاحبہ نے سوچ کر جواب دیا۔
"ہاں البتہ اس کار میں ایک اسمارٹ سی عورت بیٹھی تھی، جو گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی اور کپڑا ساٹھ روپے میٹر والا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی، جس میں نقلی ہیرا تھا، بالوں میں سونے کا کلپ تھا جبکہ وہ مصنوعی پوستین کا سوٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔"
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

خاص باتیں،

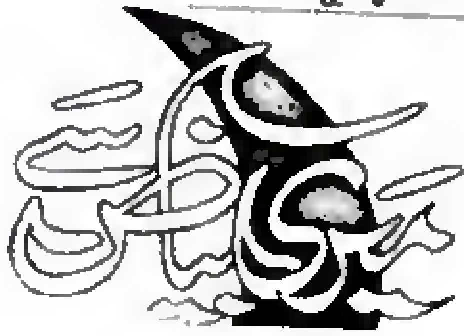
☆ چینی رہنما ماؤزے تنگ کے ایک فقرے نے عوام کی محرومیوں کو ختم کر کے انہیں جدوجہد میں شریک سفر بنا دیا تھا اور وہ فقرہ تھا۔
"میں اس وقت تک فرش پر سوؤں گا جب تک میری قوم کا ایک فرد بھی فرش پر سو رہا ہے۔"
☆ اس سے بڑھ کر اور کسی بات میں عظمت نہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی زمین کا کوئی کونا زیادہ استعمال کے قابل، قابل کاشت اور غذا کے قابل بنایا جائے۔
کسی آدمی کے دل کو ذرا زیادہ عقلمندانہ، زیادہ خوشیوں سے بھرپور، جری، زیادہ خوش قسمتی سے بھرا بنا دیا جائے اور اس کی مصیبتوں کو کم کر دیا جائے۔
(کالیریل)
☆ اگر ایک یا دو لفظ کسی کو خوش کر سکتے ہیں تو وہ یقیناً ذلیل ہے جو ان لفظوں کو نہ کہے۔ یہ تو اپنی موم بتی سے دوسرے کی موم بتی جلانے جیسا کام ہے۔ چراغ سے چراغ جلاؤ تو تمہیں بھی روشنی ملے گی۔ پھر تم بھی مسکراہٹ پاؤ گے۔ تم دوسرے کا چراغ روشن کرو گے تو تمہارے چراغ کی روشنی ذرا بھی مدھم نہ ہوگی۔
• مانگنے والوں کو دینا اچھا ہے لیکن اس سے اچھا یہ ہے کہ حاجت مند کو شخص پہچان کر بے مانگے اس کی حاجت پوری کر دی جائے۔
• سخاوت کرنے والے کو سخاوت سے زیادہ لذت حاجت مند کو تلاش کرنے میں ملتی ہے۔
(خلیل جبران)
صدف عمران۔ کراچی

ہیپی نیو ایئر،

یہ سال تیرے واسطے خوشیوں کا نگر ہو
کیا خوب ہو ہر روز تیری عید اگر ہو
عائشہ۔ گوجرہ



خالدہ جیلانی



نور عبدالسلام ———— نواب شاہ

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں
امجد وہ کوئی نقش مجھے بھولنے تو دے

ملائکہ کوثر ———— بسم اللہ پور

کتاب ہستی جہاں سے کھولی
تیری ہی یادوں کے باب نکلے

ثمرہ جاوید ———— بسم اللہ پور

کس طرح کا احساس زیاں ہے جو ہوا گم
کس طرح کا احساس ہے جو بچا ہے
ملک آدھا گیا ہاتھ سے اور چپ سی لگی ہے
اک لونگ گرا جب ہے تو کیا شور مچا ہے

نسبت سینعد ———— کھروڑ پکا

نئی رتیں، نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے
سال نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے
کبھی دن بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر سے جاگنا
تیری یاد ہے، میں ہوں اور جنوری کی تنہائیوں کے سلسلے

گڑیا شاہ ———— کھروڑ پکا

اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آپہنچے
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعبیر کرتے ہیں

زوباریہ خالد ———— لاہور

وہ جس رستے سے چاہے آجائے
میرے چاروں طرف محبت ہے

رضوانہ شکیل راؤ ———— لودھراں

مت پوچھو، کیسے جنگیں ہاریں سرد محاذوں پر
کچھ دشمن سے مات الگ کھائی، کچھ خود سے مات الگ
یہ لوگ فقط خوشیوں میں شریک ہونے والے ہیں
آنکھوں کے رنگ الگ رکھنا، دل کے حالات الگ

رضوانہ ملک ———— جلال پور پیر والا

اس کے لہجے سے بس یہ معلوم ہوا!
اسے دشوار لگتا ہے، ہم سے رابطہ رکھنا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ———— کراچی

اس لیے تو بچوں پر نور سا برستا ہے
شرارتیں تو کرتے ہیں، سازشیں نہیں کرتے

سیدہ لوبا سجاد ———— کھروڑ پکا

منتظر میرے زوال کے ہیں
میرے اپنے بھی کمال کے ہیں

ثمرہ اقراء ———— کراچی

بڑی مختصر سی تمنا ہے میری
میں سراپا محبت ہوں محبت چاہتا ہوں

شائستہ اکبر ———— گڈو کالونی

رسمی سا ہے اس شہر کے لوگوں سے تعلق
برسوں ہوئے خود سے بھی رفاقت نہیں میری

خالدہ پروین ———— گاؤں اولکھ

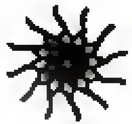
بھیگا کھڑا ہے سرد رت میں سوگوار دل
دھند کی صورت اداسیاں اترتی جاتی ہیں

کوثر خالد ———— جڑانوالہ

مٹھی میں کائنات بڑی دیر تک رہی
میری طرف حیات بڑی دیر تک رہی
ڈھلنے لگی تھی رات کہ تم یاد آگئے
پھر اس کے بعد رات بڑی دیر تک رہی

صائمہ جبیں ———— کراچی

جدا ہوئے ہیں تو کیا ہوا پھر یہی تو دستور زندگی ہے
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا



امت الصبور



شمیرا کاجل صدیقی کی ڈائری سے

میری ڈائری میں میرے موسٹ فیورٹ شاعر (ہمارے کہنا زیادہ مناسب ہوگا) علامہ محمد اقبال کی یہ غزل تحریر ہے جس کے لفظوں اور شاعری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یقیناً یہ آپ سب کے دلوں کے تاروں کو بھی چھیڑے گی ضرور۔ آیئے چلتے ہیں غزل کی جانب۔

شکوہ عشق نہیں، جرأت گفتار نہیں
میرے ہاتھوں میں کوئی جبر کی تلوار نہیں

ابن آدم ہوں انسان سے محبت کی ہے
آگ کا، چاند کا، پتھر کا پرستار نہیں

میں نے مانا کہ تو یوسف سا حسیں ہے لیکن
یہ میرا دل ہے کوئی مصر کا بازار نہیں

اے خدا مجھ کو محبت دے عبادت کے عوض
میں تو تیری کسی جنت کا خریدار نہیں

جس نے انسان سے محبت ہی نہ کی ہو اقبال
درحقیقت وہ خدا کا بھی طلب گار نہیں

گڑیا شاہ کی ڈائری سے

فیض احمد فیض کی یہ غزل کہ جس میں جھانکتا دکھ، درد اور کرب ہے۔ پڑھ کر دیکھیں جس کا احساس آج بھی زندہ اور تازہ لگتا ہے۔ پتا نہیں کس قدر غم کی شدت میں یہ الفاظ فیض نے ادا کیے ہوں گے۔ 1974ء میں ڈھاکا سے واپسی پر جب اپنے ہم وطن اجنبی بن گئے تھے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے، ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

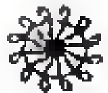
دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

توبیہ قطب کی ڈائری سے

درد کا رشتہ بہت عجیب ہوتا ہے۔ احساسات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن دکھ کا احساس دلوں کو ایک ہی رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ اعتبار ساجد کی یہ نظم آپ کی نذر۔

تم اس درد سے گزرے ہونا!
وہ رت، جس میں جل جاتی ہیں آنکھیں
تم پر بھی گزری ہے
وہ شب جو مہتاب سے ٹپکے
آنسو آنسو، شبنم شبنم، وہ شب
مجھ پر بھی اتری ہے
وہ دن جب گھڑیاں سو جائیں
لمحے پتھر کے ہو جائیں
وہ دن تم نے بھی کاٹا ہے
وہ دن میں نے بھی کاٹا ہے
دونوں کے جسموں، روحوں میں





نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

یاسمین حنفی.... کراچی

"نمل" بہت خوب صورت بہت اعلا.... پر "جنت کے پتے" سے زیادہ نہیں.... "آب حیات" پڑھ تو رہے ہیں پر تبصرہ اینڈ میں.... "شہر آشوب" بھی اچھا جا رہا ہے۔ مجھے اس میں سائر کا کردار پسند ہے۔ دونوں ناولٹ بھی بہت اچھے تھے۔ افسانوں میں سمیرا حمید اور فائنہ رابعہ چھائی رہیں۔

ج۔ بہت شکریہ یاسمین! مختصر سا تبصرہ کیا آپ نے۔ "آب حیات" پر تبصرہ بعد میں کیوں بھئی؟ اپنی رائے لکھیں۔ ہم منتظر ہوتے ہیں۔

عفت سعید.... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سرورق کی ماڈل پیاری تھی۔ آنکھوں کے پرابلم کی وجہ سے خواتین سے مارچ 2014ء سے اگست 2015ء تک ناتا ٹوٹا رہا۔ جس کی وجہ سے اپنا فیورٹ اینڈ بیسٹ ناول پڑھ نہیں پائی ہوں۔ اپنی فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد کا ناول "آب حیات" کی کچھ اقساط گزر گئی تھیں۔ نمرہ احمد کا "نمل" پڑھ رہے ہیں وہ بھی کزن بھابھی ندا نے پڑھنے پر مجبور کیا کہ پچھلی اقساط کا خلاصہ پڑھ لو اور "نمل" کو پڑھنا شروع کرو۔ واؤ نمرہ احمد جی آپ جو بھی لکھتی ہیں دل پہ نقش ہو جاتا ہے آپ کی تحریر نہ بھولنے والی تحریر۔ آپ کا اتنا گہرا مطالعہ کہ ہم پڑھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ خواتین کا ہر سلسلہ ڈائجسٹ کی خوب صورتی ہے۔ "کھٹی سنی" سے لے کر بیوٹی بکس تک۔ ڈائجسٹ سے دیکھ کر نئی نئی ڈشز کی فرمائشیں کرتی ہوں جو پیاری بھابھی زیبا اور پیاری مماجانی بنا کر دیتی ہیں۔ نایاب جیلانی شعاع میں تو آ رہی ہیں خواتین میں بھی آجائیے۔ لیٹرز میں انیقہ انا کو شوق سے پڑھتی ہوں کیونکہ وہ چکوال کی ہیں۔

ج۔ پیاری عفت! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شائع نہ ہو سکا، مگر اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے اس بارے میں شکوے شکایت کے بجائے سمجھ لیا کہ تاخیر کی وجہ کیا تھی۔ پیاری قارئین! آپ ناراض نہ ہوا کریں۔ خط شائع ہوں کہ نہ ہوں۔ ہم انہیں پڑھتے ضرور ہیں۔

بیشتر دلچسپ خطوط اس وقت موصول ہوتے ہیں جب نیا پرچہ مارکیٹ میں آجاتا ہے، لیکن کاپی پریس میں جانے تک ہمیں جو بھی معیاری اور قابل نگارشات خواہ وہ خط ہی کیوں نہ ہوں۔ موصول ہو جائیں تو ہم کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح انہیں جگہ دے ہی دیتے ہیں۔

چکوال سے کوئی خاص تعلق ہے تو آپ صرف اسی وجہ سے انیقہ انا کے خط شوق سے پڑھتی ہیں؟

نایاب کا تو ہم بھی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

آپ کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ اب اپنا خیال رکھیے گا۔

شبانہ امین راجپوت.... کوٹ رادھا کشن

دسمبر کا شمارہ دس تاریخ کے بعد ملا، سرورق مناسب ہی تھا۔ کرن کرن روشنی سے اپنے ایمان کو تازہ کیا اور اپنے پسندیدہ سلسلے وار ناولز پڑھے "آب حیات" "نمل" اور "شہر آشوب" ان کی تعریف میں، میں کیا لکھوں۔ سمیرا

حمید کا افسانہ "ولی" کافی متاثر کن تھا۔ ام طیفور کے ناول "اس درد کی دوا کرے کوئی" نے بھی کافی محظوظ کیا۔ عینی ملک کے "پرورش" نے بھی بہت متاثر کیا۔

ج۔ پیاری شبانہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جارہی ہے۔

نادیہ یاسمین، ریحانہ اکبر، بلقیس فاطمہ..... بستی عنایتی، تحصیل خیرپور

خواتین سے تعلق آٹھ، نو سال پرانا ہے۔ میرے خط لکھنے کی ایک بڑی وجہ "نمل" ہے۔ سچ میں "نمل" بہت زبردست جارہا ہے۔ نمرہ جی کے اشعار بہت زبردست ہوتے ہیں۔ آپ آخر میں نمرہ کا انٹرویو ضرور لیجئے گا اور ان کی عمر بتادیں، کتنی ہے کیوں کہ ہمیں کہانی پڑھتے ہوئے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ پتا نہیں رائٹر کیسی ہے۔ کتنی بڑی ہے وغیرہ وغیرہ۔

خط لکھنے کی دوسری بڑی وجہ میری آنٹی (چچی) کی خواتین سے خاموش محبت ہے۔ وہ تیسری کلاس میں تھیں، تب سے پڑھ رہی ہیں اور اب تو ماشاء اللہ ان کی بیٹی بھی تیسری میں جانے والی ہے۔ ان کا نام بلقیس فاطمہ ہے۔ ان کے لیے دعا کریں۔ اللہ انہیں اور میرے بھائی کو صحت اور زندگی والے بیٹے عطا فرمائے۔ (آمین)۔

خواتین کے سارے سلسلے بہت زبردست ہیں۔ عمیرہ جی! "آب حیات" تو خواتین کی رونق ہے۔ باقی ساری رائٹرز بھی بہت زبردست لکھتی ہیں۔

ج۔ پیاری نادیہ، ریحانہ اور بلقیس! محبت کا اظہار کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفے یا ذخیرۂ الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی، محبت اپنا پتا خود بتادیتی ہے۔ ہماری طرف سے سالگرہ مبارک اور آپ کی چچی اور ہماری دیرینہ قاری بلقیس فاطمہ اور آپ کو اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ بلقیس فاطمہ اور آپ کے بھائی کے لیے دعاگو ہیں۔

نمرہ کی عمر بیس سے پچیس کے درمیان ہے۔

سمیرا اصغر..... لاہور

کرن کرن روشنی پڑھ کر ہمیں دین کی مزید آگاہی ہوتی ہے۔ میں نے ایک خاص بات پوچھنی ہے۔

نومبر کے شمارے میں اللہ کی رحمت کے متعلق بتایا گیا تھا جس کا ایک طریقہ ذکر ہے، اس کے فوائد و مسائل میں بتایا گیا کہ جو درود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتائے ان کے پڑھنے سے ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پلیز میری رہنمائی کریں۔ مسنون دعائیں اگر پڑھتے ہیں تو کیا ان کے پڑھنے سے گناہ ہوتا ہے؟

باقی سلسلوں کے متعلق کیا کہوں۔ تمام شمارہ ہی لاجواب ہے۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "نمل" پڑھتی ہوں۔ اس کے تمام کردار ہی بہت اچھے ہیں۔ نمرہ جی سے ایک بات پوچھنی ہے کہ فارس کی اپیل بائی زمر نہیں ہو سکتی کیا؟ امثل عزیز شہزاد کی "شہر آشوب" بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ خدا کرے کہ اجیہ اور سائر کو جلد عقل آجائے۔

ج۔ پیاری سمیرا! مسنون دعاؤں سے مراد وہ دعائیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھیں اور صحابہ کرام کو سکھائیں۔ یہ دعائیں پڑھنے سے گناہ کا سوال ہی نہیں بلکہ ثواب ملتا ہے۔ حدیث میں ہے بہترین ذکر لاالہ الا اللہ اور بہترین دعا الحمدللہ ——— ہے۔ آپ مسنون دعائیں پڑھیں، قرآن پاک کی تلاوت کریں اس کا ترجمہ و تفسیر پڑھ کر اس پر عمل کریں۔ دنیا اور آخرت کے لیے کافی ہے۔ البتہ وہ دعائیں جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتائیں یا ان کے بارے میں شک ہے، ان کے بارے میں اندیشہ ہو سکتا ہے، جو چیز شک میں ڈالے اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

طلعت ثناء..... سیال شریف

جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ "نمل" ہے

ویل ڈن نمرہ جی "جنت کے پتے" کی طرح اس دفعہ بھی بازی لے گئی۔ ہم نمرہ جی کے کرداروں کو گھر میں ایسے ڈسکس کرتے ہیں جیسے وہ ہمارے سامنے جیتے جاگتے کردار ہوں۔ باقی رسالہ بھی ہماری جان ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل بھی بہت اچھا تھا۔ "آب حیات" میں اکٹھی پڑھوں گی مکمل ہونے پر۔ سارا کھیل انا کا تھا بہت اچھا ناولٹ تھا۔ یہ کوئی نئی رائٹر ہیں بدیع الجمال پہلے نہیں پڑھا۔ ام طیفور نے بھی جیسے پہلوان کو انسان بنایا اچھا لگا۔ رنگا رنگ سلسلہ اب کیوں مزہ نہیں دیتا۔ "خبریں وبریں" بھی پرانی تھیں آپ کی بیاض سے ہوتے ہوئے نفسیاتی الجھنیں پڑھیں

عدنان صاحب بہت نیکی کا کام کررہے ہیں۔ بہنوں کو سنوارنے کا کام نیکی ہی ہے۔

ج۔ پیاری طلعت! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ "نمل" کی تعریف نمرہ تک پہنچا رہے ہیں' لیکن یہ کیا بھئی؟ "آب حیات" آپ مکمل ہونے پر پڑھیں گی تو ہم آپ کی رائے کیسے جان سکیں گے ہمیں تو بہت اچھا لگتا ہے جب ہر قسط پر تفصیلی تبصرہ پڑھتے ہیں۔ بدیع الجمال بہت عرصہ پہلے لکھتی تھیں پھر پاکستان سے باہر چلی گئیں۔ اب ایک طویل مدت بعد پھر قلم اٹھایا ہے۔

رنگا رنگ پھول کا سلسلہ آپ کو مزہ نہیں دیتا' یہ جان کر حیرانی ہوئی جبکہ اس سلسلے میں لطائف' اقتباس' اقوال سب ہی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ آپ کے سوال کا جواب بیوٹی بکس میں دیں گے۔

ضحیٰ خان۔۔۔

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ خواتین کی پچھلے چھ سال سے قاری ہوں' مگر خط لکھنے کی نوبت پہلی بار آئی ہے۔ اب آجائیں تبصرے پر تو "عمیرہ احمد" کیا کمال کا لکھ رہی ہیں۔ "آب حیات" نے تو مانو اپنا دیوانہ ہی بنا ڈالا۔ "آب حیات" کی تعریف کے لیے الفاظ کا انتخاب مشکل امر ہے۔ "نمل" کی تعریف میں کیا کہا جائے اور کیا نہیں....ڈیل ڈن نمرہ احمد ہر نئی قسط کے ساتھ سسپنس بڑھتا ہی جارہا ہے۔ فارس سب کچھ جانتا تھا۔ نمرہ احمد ہمیشہ چونکا دینے والے موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اور اس ناول کے بعد خوشی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تو ہے جو ناولز میں ہیرو ہیروئن کی محبت رومانس اور شادی کے علاوہ بھی کچھ لکھ رہا ہے میرا پسندیدہ کردار "سعدی" بے شک وہ زمر' فارس اور حنین کی طرح ٹیلنٹڈ نہیں ہوگا' مگر وہ اپنی زبان سے ہی ساری بازی جیت لیتا ہے۔ "شہر آشوب" میں سائر کا کردار ایک نفسیاتی مریض کا میرب پر بہت ہی ترس آتا ہے۔ اجیہ کی کہانی ابھی سمجھ نہیں آئی۔ خیر قسطوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ "حروف ساز" اور "ولی" دونوں مرکزی خیال کے حوالے سے بہترین تھے۔ اس بار سمیرا احمد نے بھی کچھ آسان زبان میں لکھا اس لیے ایک ہی بار میں سمجھ آگیا۔ "سارا کھیل انا کا تھا" بہت بہترین اور مکمل ترین ناول تھا۔ "اس درد کی دوا کرے" کھٹا میٹھا سا کچھ مزاحیہ سا تھا۔ ضیغم کا کردار بہت دلچسپ تھا اور نیلوفر کا فیصلہ بھی زبردست تھا۔ "پیغام تھا" پڑھ کر وقار پر بہت دکھ ہوا آج کل خلوص' وفا اور محبت پر دولت اور پیسے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ "عینی ملک" کی "پرورش" آج کل کے ہر ماں باپ کو پڑھنی چاہیے۔ ڈائجسٹ میں سلسلے وار ناول تین ہیں۔ اگلے مہینے سے چار ہو جائیں گے۔ یہ بہت زیادہ ہیں۔ مکمل ناول صرف دو ہوتے ہیں انہیں بڑھائیں اگر سلسلے وار ناول کم نہیں ہوسکتے تو صفحے بڑھا دیں۔

ج۔ پیاری ضحیٰ! کوشش کریں گے کہ آپ کی تمام فرمائشوں کو پورا کرسکیں۔ اتنا اچھا تبصرہ کرنے کا شکریہ۔

صائمہ بشیر۔۔۔ گجرات پاکستان

پیارے نبی کی پیاری باتوں کے فوراً بعد "نمل" پڑھا۔ اور واقعی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ ہر قسط کے آغاز پر موضوع کا ہونا اور پھر اس کی تفسیر بیان کرنا بہت متاثر کن ہے۔ "آدمی کے دو دل" پڑھنے کے بعد مجھے اپنا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ جزاک اللہ۔ نمرہ احمد "نمل" میرے لیے کہانی ہی نہیں تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ نمرہ احمد! آبدار کو سعدی کی ہیروئن مت بنایئے گا ورنہ میں کیا کروں گی؟ یہ جب آپ روبرو میں آئیں گی تب بتاؤں گی۔ حنہ کا سیم سے یہ ڈائیلاگ کہ "زیادہ جہاں سکندر بننے کی ضرورت نہیں ہے" "آپ سوچ نہیں سکتیں کہ رات کے دس بجے یعنی آدھی رات کو کافی عرصے بعد میں قہقہہ لگا کر ہنسی (میں نو بجے تک سو جاتی ہوں لہٰذا دس بجے میرے لیے آدھی رات ہی ہے) اور مجھے یقین تھا کہ سعدی جواہرات کا نام کبھی بھی نہیں لے گا۔ اب جواہرات ڈاکٹر کو بھی خاور کا نام لینے کو کہے گی اور فرعون کے ہاتھوں ہی ہامان کا خاتمہ ہوگا۔ شکر ہے کہ احمر حنہ کا ہیرو نہیں ورنہ تو میرا دل ہی جل گیا تھا جب مجھے لگا کہ احمر...؟ ایک آخری بات کہ زمر کا فارس کو یہ کہنا کہ "اس ملک میں قانون ـــ ہے قانون پر چلنے والا کوئی نہیں ہے" اس نے میری حب الوطنی اور زیادہ کردی کہ ہم کمزور ہی سہی' مگر ابھی بھی ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ دشمن کو کبھی بھی خود پر غالب نہیں آنے دیں گے۔ ان شاء اللہ۔

ج۔ پیاری صائمہ! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت

نہیں۔ آب دار سعدی کی ہیروئن بن بھی جائے تو سعدی آپ کا بھائی ہی رہے گا (بھئی سعدی کا کردار ایک اچھے بچے کا ہے نا) دس بجے اور آدھی رات؟ کراچی میں تو رات دس بجے دن نکلا ہوتا ہے۔

احمر حنہ جیسی پیاری لڑکی کا ہیرو کیسے ہو سکتا ہے۔ اور زمر نے واقعی بہت اچھی بات کہی۔ ہمیں بھی اس کی بات بہت پسند آئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک بہت اچھا ہے اگر اس میں کہیں کوئی خرابی یا کمی ہے تو اس کے ذمہ دار بھی ہم ہیں۔

سیدہ زہرا تحسین علی.... کراچی

دسمبر کا تمام شمارہ بہترین ہے۔ ایک نکتہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ اکثر کہانیوں میں محبت کزن سے ہو جاتی ہے اور لڑکا ماں کو منانے کے لیے یا تو بیرون ملک جا کر واپس نہیں آتا یا اسی کزن سے شادی کی شرط رکھ دیتا ہے یا پھر بیرون ملک جا کر بسنے کی دھمکی دے دیتا ہے اور آخر کار ماں کو ہار ماننا پڑتی ہے۔ کیا اس کے علاوہ ماں کو کسی اور طریقے سے رام نہیں کیا جا سکتا۔ اور بھئی ہماری زمر کے ساتھ کچھ برامت کیجئے گا۔

ج۔ پیاری تحسین! ہم آپ سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ کچھ کہانیوں میں تو واقعی یہی ہوتا ہے، لیکن اکثر کہانیوں میں یہ نہیں ہوتا.... آپ کا پیغام مصنفین تک پہنچا رہے ہیں کہ وہ اب ماؤں کو منانے کے لیے نئے طریقے اختیار کریں۔

عمیمہ خان.... کراچی

اس ماہ کا شمارہ پڑھا۔ سرورق کی ماڈل بہت اچھی لگی۔ اس کے بعد فہد مرزا سے ملاقات اور سونیا مشال سے باتیں بھی نہایت ہی دلچسپ لگیں۔ "آب حیات" کی قسط بہت اچھی لگی اور اس قسط کو ختم تو بہت ہی سسپنس میں کیا ہے۔ عموماً" تین سال کے بچے اتنے "بولڈ" اور "کونک" نہیں ہوتے جتنا حمین ہے۔ اس کے بعد آتے ہیں کہانی "سارا کھیل انا کا تھا" کی طرف تو کہانی حقیقت سے قریب لگی اور کہانی "دلی" کی بات کریں تو یہ بھی زبردست کہانی تھی اور سبق آموز بھی۔ "شہر آشوب" پڑھی مگر یہ سمجھ نہیں آیا کہ سائرس کی بے وفائی کا بدلہ میرب سے لے رہا ہے۔ "اس درد کی دوا کرے کوئی" تھوڑی مزاحیہ تھی۔

اب آتے ہیں ناول "نمل" پر تو نہایت ہی زبردست قسط آئی ہے اور سعدی کا کردار سب سے اچھا لگا۔ اس کے علاوہ یہ کہنا تھا کہ نمرہ احمد قرآن کی تفسیر بہت ہی اچھے انداز میں کرتی ہیں اور نمرہ احمد ہر طرح کے ناولز بہت اچھے لکھتی ہیں۔ کہانی "پرورش" بھی سبق آموز تھی۔

آپ نے میرا خط نہیں چھاپا تو میں یہ ہی سمجھوں گی کہ آپ صرف تعریفی خطوط لگاتی ہیں۔

ج۔ پیاری عمیمہ! آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے تو صرف تعریف ہی کی ہے تنقید تو کی ہی نہیں پھر بھی ہم پر یہ شک کہ ہم تنقیدی خط شائع نہیں کریں گے۔ لگتا ہے کہ آپ خطوط کا سلسلہ نہیں پڑھتی ہیں۔ ورنہ آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ ہم پر کتنی بے رحمانہ تنقید ہوتی ہے اور ہم پوری خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

تبصرہ آپ نے اچھا کیا ہے۔ بروقت مل بھی گیا۔ آئندہ خط لکھیں تو اس یقین کے ساتھ لکھیں کہ تعریف ہو یا تنقید ہم کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

تین سال کے بچے عموماً" ایسے نہیں ہوتے لیکن یہ نہ بھولیں کہ حمین سالار کا بچہ ہے۔

نائلہ امین عرف ایمن.... شکریال راولپنڈی

بھئی فرسٹ انٹری ہے۔ ٹھیک ٹھاک بول کر جائیں گے.... دہلیز پہ ہی سلام کر کے تھوڑی نا بھاگ جائیں گے۔ تمام رائٹرز کے لیے سچ کہوں تو تعریف کے الفاظ نہیں ملتے' لیکن.... لیکن "نمرہ احمد" میں یہ کہوں گی کہ اے کاش میں نمرہ جی سے مل سکتی۔ حنہ سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اب کیوں کہ اب وہ اتنا نہیں کھاتی' آبدار بھی بہت کیوٹی کیوٹی سی ہے زمر بے چاری کے مرض کا سن کر دلی صدمہ ہوا۔ آہ فارس غازی! میری اور تمہاری اک سی کہانی ہے۔ اصل میں ہم دونوں سب کو سمجھتے ہیں پر ہمیں کوئی بھی سمجھنا نہیں چاہتا۔ ایک اور اہم بات کرنی تھی بہت غصہ آتا ہے ان قاری بہنوں پر جو ذرا ذرا سی بات پہ تنقید لکھ بھیجتی ہیں (میں خواتین و شعاع دونوں شماروں کی بات کر رہی ہوں) مجھے ایک اور بات کہنی ہے یہاں کہ عمیرہ احمد' نمرہ احمد اور ہاشم ندیم یہ وہ رائٹرز ہیں جن کے لفظ میرے دل پہ ٹھاہ کر کے لگتے ہیں اور یہ میرے استاد ہیں کیونکہ ان تینوں کی باتوں میں ایسی تاثیر ہے جو ہمیشہ میرے دل پر اثر کرتی ہے اور ہاں عفت سحر طاہر سے کہیں وہ بھی

کوئی نت کھٹ سی تحریر لکھیں۔ (بن مانگی دعا میں جب سفینہ بیگم کا غرور ٹوٹا وہ سین پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بہت اچھا ناول تھا سب ناولز کی طرح) ج: پیاری نائلہ! دلہیز سے ہم بھی آپ کو بھاگنے نہیں دیں گے۔ صفحات کم سہی لیکن دل میں ہمارے بہت جگہ ہے یہاں آپ جم کے قیام کر سکتی ہیں۔

اگر فارس غازی اور آپ کی کہانی ایک ہے تو بہت ہی خوشی کی بات ہے کیونکہ دیر تو لگی لیکن زمر نے فارس غازی کو سمجھ لیا ہے۔

عفت سحر طاہر سے ہم نے بھی فرمائش کی ہے۔ از میرٹ کی کمی ہم بھی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ ایک خوش خبری آپ کو سنا دیں آپ عفت سحر کا ناول جلد پڑھ سکیں گی۔

ارم بشیر۔۔۔ اسلام آباد

ٹھنڈے ٹھنڈے دسمبر میں گرمیوں والا ٹائٹل لیکن ٹائٹل بہت خوب صورت ہے سب سے پہلے شہر آشوب پڑھی۔ آپ لوگوں کا شکریہ کہ شہر آشوب کی قسط کافی لمبی ہوتی ہے۔ آج کی قسط پڑھنے سے پہلے تک تو سارا کا تصور بڑا ہیرو والا تھا مگر اس قسط میں جو زبان استعمال کی ہے اس نے میرب کے لیے اس سے تو کہیں سے بھی وہ ناول کا ہیرو نہیں لگا۔ اس خط کے ساتھ دو ڈائجسٹ بھیج رہی ہوں ایک خواتین فروری 2008 کا اور دوسرا ریشم نومبر 2015 کا ہو سکتا ہے کہ جو بات میں آپ کو بتا رہی ہوں شاید وہ آپ لوگوں کو پہلے سے ہی پتا ہو اور آپ لوگ اس پر کارروائی بھی کر چکے ہوں لیکن اگر آپ لوگ اس بات سے لاعلم ہیں تو میں نے بتانا ضرور سمجھا خواتین 2008 والے شمارے کے صفحہ نمبر 60 پر راشدہ رفعت کی کہانی ہے (محبت ہم سفر میری) یہی کہانی اس ماہنامہ ریشم کے صفحہ نمبر 241 پر کسی مونا محمود نے خواہشوں کے گلاب نام سے چھپوائی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ تو جرم ہے کسی کی کہانی اپنے نام سے چھپوانا اس لیے مجھے بہت عجیب لگا۔ میری عادت ہے کہ میں پرانے ڈائجسٹ بھی سنبھال کر رکھتی ہوں۔ میری الماری بھری ہوئی ہے خواتین ڈائجسٹوں سے اور میں پرانے ڈائجسٹ نکال نکال کر پڑھتی بھی رہتی ہوں' اسی لیے راشدہ رفعت کی یہ اتنی پرانی کہانی بھی میرے دماغ میں تھی۔

ج پیاری ارم! ہمیں پتا ہے کہ ہماری قارئین خواتین ڈائجسٹ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ اس کے شمارے سنبھال کر رکھتی ہیں لیکن شاید کہانی چرانے والی مونا محمود کو اس بات کا اندازہ نہ تھا' اس لیے انھوں نے پورے اطمینان سے چوری کی لیکن پکڑی گئیں۔ اس دیدہ دلیری پر ہم انہیں کیا کہیں' انہیں خود شرم آنی چاہیے۔ آپ کا تہہ دل سے شکریہ کہ آپ نے ہمیں پرچے بھجوائے۔ ہمارے علم میں یہ بات نہیں تھی۔

آمنہ سعید۔۔۔ نیلور اسلام آباد

بہت سنا تھا "نمل" کے بارے میں فیس بک پر' میسجز پر خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے خطوط میں اور بہن کی دوستوں سے۔ پھر میں نے پچھلے مہینے ہی نیٹ سے ساری اقساط نکال کر پڑھیں۔ بہت زبردست کہ شاید زندگی میں پہلے کبھی ایسا ناول نہیں پڑھا۔ اور نمرہ آپی پلیز اگر آپ نے عین ٹائم پر زمر کو اگلے جہان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اتنی زور زور سے روؤں گی کہ میری آواز آپ کے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔ (ہاہاہا)

سمیرا حمید آپی آپ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں مگر عجیب۔ سمجھ آبھی جاتی ہے اور نہیں بھی۔ مگر ایک بات کہ آپ کا اسٹائل واقعی دوسروں سے جدا ہے۔ پڑھ پڑھ کر خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو 2011 میں فیملی میگزین میں کہانی لکھی۔ چار سال تک بچوں والی کہانیاں لکھیں۔ اور اب میری خواہش ہے کہ میں بھی کوئی ناول لکھوں مگر لکھ نہیں پاتی۔

ج پیاری آمنہ! آپ نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھی ہیں تو بڑوں کے لیے بھی لکھ سکتی ہیں اور آپ کا تو مطالعہ بھی وسیع ہے۔ کوشش کریں تو ضرور کامیاب ہوں گی (ان شاءاللہ)

نزہت فاطمہ۔۔۔ لاہور

نو سال سے آپ کی خاموش قاری ہوں' اس تاسف کے ساتھ کہ خواتین ڈائجسٹ کو بہت پہلے کیوں نہ پڑھنا شروع کیا۔ بلاشبہ آپ کا رسالہ خواتین کی تعلیم و تربیت کا احسن فریضہ بہت اعلا طور پر انجام دے رہا ہے۔ یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔ مستقبل میں اس کی ذمہ داریاں (اور آپ سب کی بھی) اس حوالے سے بہت بڑھ جائیں گی۔ جس

کی نشاندہی "آب حیات" اور "نمل" نے اور ان سے بھی قبل "زمین کے آنسو" اور "عہد الست" نے کردی ہے۔ یعنی کہ دنیا خصوصاً" عالم اسلام کے تیزی سے بدلتے حالات اور ان کی بناء پر درپیش چیلنج۔ بلکہ اصل چیلنجز تو اب مسلمان خواتین کو درپیش ہوں گے کیونکہ دشمنان اسلام نے "مسلمان عورت" پر فوکس کرلیا ہے۔ کہ اسے اپنے مذموم منصوبوں کے لیے آلہ کار بنانا ہے مغرب پر واضح ہوچکا ہے کہ جب تک مسلمان عورت گھر اور خاندان کو سنبھال کر بیٹھی ہے ان کا کوئی وار کاری نہیں ہوسکتا ہے اس لیے ان کا ایجنڈا ہے کہ خاندان کا ادارہ انتشار کا شکار ہو۔ عمیرہ احمد آپ کے زور قلم کے لیے دعاگو ہوں۔

آخر میں آپ کی اجازت سے اقراء شریف کے خط کے حوالے سے کچھ کہنا چاہوں گی۔ اقراء بٹی وحی صرف اور صرف رحمانی ہے۔ اور خدا کے رسولوں پر اس کی طرف سے حضرت جبرئیل لے کر آتے رہے۔ شیطان کو وحی کا اختیار نہیں ہے۔ صرف وسوسہ ڈالنے کا اختیار ہے۔ اور وہ بھی ان لوگوں پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو اپنے رب سے تعلق مضبوط رکھتے ہیں۔ نماز قرآن اور ذکر کے ذریعے۔ اور احکامات الٰہی کی پابندی سے۔

ج پیاری نزہت! آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے لیکن پاکستان میں ابھی بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو ان کے ایجنڈے کو ناکام بنانے کے لیے کام کررہے ہیں۔ پاکستانی خواتین گھر سے باہر کام کرنے کے لیے نکلتی ہیں تو اپنی اقدار مذہب اور روایات کا خیال رکھتی ہیں۔ گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں ہی کو دیکھ لیں اپنے گھر اور خاندان کے لیے کتنی جان توڑ محنت کرتی ہیں۔ ایک عورت اپنے گھر کا پورا کام نہیں کرپاتی اور وہ چار چار گھروں کے کام نمٹاتی ہیں۔

پاکستانی خواتین اپنی تعلیم، تربیت اور مذہب سے مضبوط تعلق کی بنا پر ہر میدان میں سرخرو ہوں گی۔ ان شاء اللہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

شہنیلا اعراج۔۔۔ ابوظہبی

کالج کے زمانے سے ان رسالوں سے دوستی ہوئی۔ 24 سال گزر گئے، آج تک کوئی غیر معیاری تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ ہاں غیر دلچسپ تحریریں، کہانی کی کمزوریاں یا پھر کردار نگاری کی خامیوں کے ساتھ تو رہی ہیں لیکن مجموعی طور پر کہانیوں کا معیار اعلا رہا ہے۔

خوب صورت کہانیاں۔ اور ہر کہانی کسی نہ کسی پیغام کے ساتھ۔ سارے خطوط کے بیچ ایک میرا خط نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے بہت ساری رائٹرز ایسی تھیں کہ جن کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوئی۔ لیکن عنیزہ سید کی کہانیوں نے ہمیشہ میرے ذہن پر قبضہ جمائے رکھا۔ ایک لمبے عرصے تک ان کے علاوہ کوئی دوسری رائٹر میری پسندیدہ نہیں بن سکی۔ ان کے بعد اب عمیرہ احمد ہیں جن کی ہر تحریر مجھے پہلے سے بڑھ کر نظر آئی ہے۔ سالار اور امامہ کو ایک ساتھ رہتے، لڑتے جھگڑتے، ہنستے بولتے دیکھنا (پڑھنا) بہت اچھا لگا۔ لیکن نومبر کی قسط میں ایک سین نے مجھے کچھ مایوس کیا اور کچھ مضطرب بھی۔ وہ سین جس میں سعد اپنی فیملی کے ساتھ سالار سے ملنے اس کے گھر آتا ہے۔

جس قدر سعد خود غیر متوازن شخصیت کا مالک ہے، اتنی ہی غیر متوازن اور تنگ ذہن اس نے بیوی بھی پائی ہے۔ غضب کا جوڑ ملایا ہے امامہ نے۔

یقیناً" ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر دین دار حلیہ رکھتے ہیں لیکن تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے، مگر یہ لازمی نہیں ہے کہ عمیرہ ہر بار ہی اپنی کہانی میں ظاہری طور پر دین دار حلیہ رکھنے والوں کو منافق ہی دکھائیں پیر کامل میں ڈاکٹر جلال۔ اور آب حیات میں سعد۔ سعد اور اس کی بیوی کی تنگ ذہن کو بڑی مہارت کے ساتھ تبلیغ کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ کم و بیش یہی کام مغرب بھی کررہا ہے، مسلمانوں کو دہشت گردی کے ساتھ منسلک کر کے۔

ایک چھوٹی سی بات اور۔

وہ یہ کہ عالیہ نقاب لیے ہوئے تھی، امامہ کو اتنی میزبانی تو دکھانی چاہیے تھی کہ اسے لے کر کسی دوسرے کمرے میں بیٹھ جاتی۔

ج محترمہ شہنیلا اعراج! خوش رہیں۔ اس دنیا میں ہر شخص، ہر چیز یہاں تک کہ ہر ذرے کی اپنی جگہ اہمیت ہے اور کوئی بھی چیز بے مقصد اور بے کار نہیں۔ آپ نے یہ کیونکر سوچ لیا کہ آپ کے خط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ ہماری 24 سال سے خاموش قاری ہیں اور آج خط لکھا ہے تو یقین جانیں ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ اب کسی کو 24 سال تک تو خاموش نہیں رہنا چاہیے بلکہ دل کی

بات کہہ دینی چاہیے۔ چلیں شکر ہے دیر سے ہی سہی آپ آئیں تو۔

عمیرہ احمد نے کسی خاص جماعت کے بارے میں نہیں لکھا۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو بہت مذہبی ہوتے ہیں لیکن تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دوسروں کی کمزوریوں کو بیان کرنے میں انہیں لطف آتا ہے۔ امامہ سعد کی بیوی کو کمرے میں اس لیے نہیں لے کر گئی کہ وہ جانا نہیں چاہتی ہوگی۔

تسکین گل..... عیسیٰ خیل

عیسیٰ خیل۔ پنجاب کے ضلع میانوالی کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جس میں صحت، تعلیم کی ناکافی سہی مگر سہولتیں موجود ہیں۔ البتہ گیس کی سہولت کے لیے کافی عرصے سے انتظار میں ہیں۔

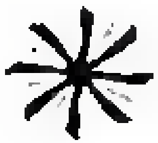
عیسیٰ خیل غیرت مند لوگوں کا شہر ہے جہاں پردے کی پاس داری فرض اولین کے طور پر کی جاتی ہے اور یہاں کی خواتین چاہے بوڑھی ہوں یا جوان سال، پردے کے بغیر گھر سے نکلنا گناہ سمجھتی ہیں۔

عیسیٰ خیل کو سرسنگیت کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا سوہنا خان بیدس اور مجبور عیسیٰ جیلوی جیسے اعلا پائے کے شاعر اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ جن کے لکھے ہوئے لازوال گیت جب عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی آواز میں منظر عام پر آئے تو آج بھی زبان زد عام ہیں۔

عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی پرائڈ آف پرفار منس بھی اسی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ اور کلیم اللہ خان جاذب اور جاوید راز اور بہت سے اعلا شعراء کا عمدہ کلام عوام کے ذوق سلیم کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ عیسیٰ خیل میں بولی جانے والی سرائیکی کی جو قسم ہے، وہ خوب صورت الفاظ سے مالا مال ہے۔ سرائیکی کا لہجہ دل موہ لینے والا ہے۔

عیسیٰ خیل کے لوگ غصے کے بہت تیز ہوتے ہیں۔ ہمارا تو جی! محبوب بھی لیٹ آئے تو فائر مارنے پر تل جاتے ہیں (ہاہاہا)

ج: پیاری تسکین! آپ کا عیسیٰ خیل آپ کا ہی نہیں ہمارا بھی ہے۔ پاکستان کا ہر شہر، ہر گاؤں بہت پیارا ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ خوب صورت ہے، یہاں کے لوگ بہت اچھے محبت کرنے والے ہیں، بس کچھ لوگ اپنی سیاست چمکانے کے لیے تعصب کا زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے ارادوں میں ناکام کرے اور ہدایت دے۔



قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

برائے فروخت

آپ نے اکثر برائے فروخت کے اشتہارات دیکھے ہوں گے لیکن ایسا انوکھا اور منفرد اشتہار آپ کی نظروں سے شاید کبھی نہ گزرا ہو۔ جس میں بمبئی کی ایک بہو نے اپنی ساس کے لیے برائے فروخت کا اشتہار دیا ہے۔ یہ اشتہار پرانی اشیاء کی خرید فروخت کی ویب سائٹ پر دیا گیا ہے۔ (کیا اپنے والدین کو بھی برائے فروخت کے لیے پیش کر سکتی ہے یہ بہو یا شوہر کی ماں ہی۔۔۔؟) جس میں ساس کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی ان کی آواز ایسی ہے کہ جس سے پڑوسیوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ (او بہو بیگم! اب تک کیسے زندہ ہیں۔۔۔؟) آپ کتنا ہی اچھا کھانا بناتی ہوں، لیکن ان کی ساس اس میں ایک سو ایک خامیاں نکال سکتی ہیں۔ (جب آپ ساس بنیں گی

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

مطالبہ

خبر ہے کہ میرا نے ماڈل ایان علی کا کیس لڑنے والے وکیل اور سابق گورنر پنجاب سردار لطیف کھوسہ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا کی خواہش ہے کہ ان کا مقدمہ سردار لطیف کھوسہ لڑیں۔ میرا نے حکومت پاکستان سے اپنی شادی کے حوالے سے جھوٹی خبروں کا نوٹس لینے کا مطالبہ کر دیا ہے (او جی! اب حکومت کو یہی کام کرنے رہ گئے ہیں کہ وہ۔۔۔؟) اور کہا ہے کہ ایسی خبریں مجھے بلیک میل کرنے کی سازش ہے۔ (ہم سمجھے بلیک منی) میرے فین (کون سے والے۔۔۔؟) ایسی خبروں اور تصاویر پر دھیان نہ دیں یہ سب بے بنیاد ہیں۔ (تو پھر رائی کا۔۔۔ پہاڑ کیسے بنتا ہے) انہوں نے مزید کہا کہ میری شادی کے حوالے سے آئی خبروں سے میرا دل دکھی ہوا ہے۔ (ویسے میرا امریکن شہریت حاصل کرنا چاہتی ہیں اور آج کل اسی تگ و دو میں لگی ہوئی ہیں۔)



تو...؟ وہ ایک بہترین مشیر بھی ہیں وہ دنیا بھر کے عقل مند ترین انسانوں اور دانشوروں کو بھی مشورے سے نواز سکتی ہیں۔ (کہیں یہ اشتہار بھی ان کے مشوروں ہی

کی بدولت تو نہیں دیا گیا...؟) بہو صاحبہ نے اس اشتہار میں ساس کی قیمت کے خانے میں لکھا ہے کہ اگر آپ ہماری ساس کو نقد رقم دے کر خریدنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تو ایک عدد پرانی کتاب بھی قیمت کے طور پر دی جاسکتی ہے۔ (کتاب حاصل کرنے کا اچھا طریقہ ہے)



ساتھیوں نے بے نظیر کے قتل کا منصوبہ بنایا اس کے بعد زرداری کو حکومت دی گئی اس شرط کے ساتھ کہ مشرف کو کچھ نہیں کہنا۔ اب نواز شریف کو بھی اس شرط پر حکومت دی گئی کہ مشرف کی طرف آنکھ اٹھا کر

نہیں دیکھنا۔ حیرت ہے لوگ پھر بھی یہ طعنے کیوں دے رہے ہیں کہ سانحہ کارساز کے شہیدوں کے خون کا حساب کیوں نہیں لیا جارہا۔ بے نظیر کے قاتلوں کو کیوں نہیں پکڑا جارہا۔ حیرت ہے۔

(عبداللہ طارق سہیل)

☆ محمد علی جناح ٹھیک تھے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے پاکستان بننے کی مخالفت نہ کی ہوتی تو شاید آج پاکستان رقبے میں زیادہ بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا۔ مجھے ہندوستانی ہونے پر شرمندگی ہے اور میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمان بزدل ہیں۔ میں کشمیر کے مسلمانوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح بزدل نہیں ہیں۔

(یعقوب میمن کے ہندوستان سینٹرل جیل ناگ پور میں پھانسی چڑھنے سے پہلے آخری الفاظ)

زیادتی

قومی کرکٹ ٹیم کے آفیشلز کی جانب سے سرفراز احمد کے ساتھ زیادتی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ابھی تک جاری ہے جبکہ بحیثیت وکٹ کیپر اور بیٹسمین ان کی مجموعی کارکردگی انتہائی شان دار رہی ہے اور کوئی ان کی کارکردگی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ بحیثیت بیٹسمین ان کی خاص بات یہ ہے کہ دوسرے بیٹسمینوں کے برعکس وہ کسی بھی نمبر پر جاکر انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ اچھی بیٹنگ کرتے ہیں۔ کرکٹ کے شائقین کو سرفراز احمد کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر شدید غم و غصہ ہے۔ رمیز راجا کا کہنا ہے کہ سرفراز ان کھلاڑیوں میں سے ہیں جن کا نام ٹیم شیٹ پر پہلے نمبر پر لکھا جاتا ہے۔ (تاکہ کاٹنے میں آسانی رہے) یونس خان کہتے ہیں کہ اگر میں کپتان ہوتا تو کبھی سرفراز کو باہر نہ بٹھاتا۔ شائقین کرکٹ اس بات کا ذمہ دار وقار یونس کو قرار دے رہے ہیں (پتا نہیں وقار یونس کی لابی اتنی مضبوط کیوں ہے کہ ٹیم کی خراب کارکردگی کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو پاتے اور اس زیادتی پر تو کوئی ان سے پوچھ ہی نہیں رہا کہ ملک کے اس ٹیلنٹ کو باہر بٹھا کر وہ ان کھلاڑیوں کو کیوں کھلا رہے ہیں جو ملک و ٹیم پر بوجھ ہیں...؟)

ادھر ادھر سے

☆ مارک سیگل نے بتایا ہے کہ مشرف کے تین



منیب بٹ سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"شہزادہ منیب احمد بٹ۔"
2 "پیار کا نام؟"
"منیب ہی بلاتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش؟"
"14 اپریل 1992ء۔"
4 "قد/ستارہ؟"
"پانچ فٹ دس انچ اور اسٹار ایریز (حمل) ہے۔"
5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"میں گھر میں بڑا ہوں۔ ایک چھوٹا بھائی اور ایک چھوٹی بہن ہے۔"
6 "شادی؟"
"ابھی نہیں کرنی' ابھی اس فیلڈ میں بہت آگے تک جانا ہے۔ ابھی تو میں صرف 23 سال کا ہوں۔"
7 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویٹ ہوں۔ میڈیا سائنس میں۔"
8 "شوبز میں کس نے متعارف کرایا؟"
"سعید شاہ نے متعارف کرایا۔"
9 "شوبز میں پہلی انٹری؟"
"کمرشل کیا تھا۔"
10 "وجۂ شہرت؟"
"ڈرامہ سیریل "باندی" اور مختلف کمرشلز۔"
11 "پہلے پہل کیا کمایا؟"
"کمرشل کے تو 20 ہزار ملے تھے اور ڈرامے میں 35 ہزار ملے تھے۔"
12 "صبح کب اٹھتے ہیں؟"
"میرا تو دل چاہتا ہے کہ میری صبح ہو ہی نا' شام کو ہی سو کر اٹھوں' مجھے نیند بہت پیاری ہے' سونا مجھے بہت عزیز ہے۔"
13 "شوبز کی برائی؟"
"کہ اگر کوئی کسی کردار میں ہٹ ہو گیا ہے تو اسے اسی طرح کے رول ملیں گے۔ حالانکہ اس آرٹسٹ کا دل چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی کروں۔"
14 "بیدار ہوتے ہی پہلا کام؟"
"اپنا فون چیک کرتا ہوں اور شاور لے کر بھاگتا ہوں اپنے کام پر۔"
15 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"چھٹی کے دن دل چاہتا ہے کہ سب کے ساتھ مل کر کہیں کھانے پینے جائیں۔ ہم بٹ ہیں اور بٹ کو کھانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔"
16 "کوئی ایک کھانا ایک مہینے تک کھانا پڑے تو آپ

کی جوائس؟"

"رازمہ چکن۔ بہت مزے کی ہوتی ہے۔"

17 "پسندیدہ تہوار؟"

"تہوار سارے ہی اچھے ہوتے ہیں مگر "نیو ایئر" کی تو بات ہی الگ ہے۔"

18 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"اللہ نہ کرے کہ کمی ہو' ہر چیز کی زیادتی ہی ہے۔ ہزاروں لوگوں سے اچھا ہوں۔"

19 "شدید بھوک ہو تو؟"

"بہت بری کیفیت ہوتی ہے۔ مجھ سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ شدید بھوک میں آپ مجھے جلا ہوا' بھنا ہوا' بوائل ہوا' کچھ بھی دے دیں میں کھالوں گا۔"

20 "آج کل کن دنوں کا انتظار ہے؟"

"جب میری شادی ہوگی۔ یعنی اپنی شادی کے دنوں کا۔"

21 "بہت تھکن ہو تو؟"

"تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے گھر پہنچ جاؤں یا کسی کیفے میں جا کر چل کرلوں۔"

22 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"

"دوستوں کے ساتھ یا گھر والوں کے ساتھ کچھ کھا پی کر۔"

23 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"بالکل نہیں ہے۔ بہت کمپرومائزنگ ہوں۔ میرے جیسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوں گے۔"

24 "غصہ آتا ہے؟"

"مجھے غصہ بالکل بھی نہیں آتا۔

25 "لڑکیوں کی کون سی بات اچھی نہیں لگتی؟"

"یہ کہ لڑکیاں ایٹی ٹیوڈ دکھاتی ہیں اور ایٹی ٹیوڈ دکھانے والی لڑکیاں مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔"

26 "کون سی بات اچھی لگتی ہے؟"

"بااخلاق ہوں۔ بڑوں سے بات کرنے کی تمیز ہو اور خوب صورت تو ہر لڑکی ہوتی ہے۔"

27 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"

"میں اس جگہ سے ہٹ جاتا ہوں اور نظریں جھکا دیتا ہوں۔ شرما جاتا ہوں اور ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہوں۔"

28 "پرائز بانڈ کا شوق ہے؟"

"جب ہم چھوٹے تھے تو ابو پرائز بانڈ لیتے تھے اس کے بعد لینے بند کردیے' جب نکلنا بند ہوگئے۔"

29 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"ابو کے غصے سے ٹھیک ٹھاک ڈر لگتا ہے۔"

30 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"جی شہرت ملی ہے۔"

31 "جوائنٹ اکاؤنٹ پسند ہے یا؟"

"نہیں نہیں کوئی جوائنٹ اکاؤنٹ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنا اپنا اکاؤنٹ ہونا چاہیے۔"

32 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"

"مجھے فخر ہے اپنے ملک پر۔ اس لیے کسی ملک کی شہریت نہیں لینا چاہوں گا۔"

33 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"

"کچھ نہیں سوچتا۔ بہت فضول خرچ ہوں۔"

34 "بچپن کی کوئی برائی جو ابھی تک موجود ہو؟"

"نیند کی عادت' بچپن سے ہی لیٹ اٹھتا ہوں۔"

36 "کیا بات موڈ کو اچھا کردیتی ہے؟"

"اگر کوئی محبت سے میری تعریف کردے تو بس قربان ہونے کو دل چاہتا ہے اس پر۔"

37 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

38 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"

"دونوں ہی ہوسکتے ہیں۔"

39 "اگر لگاتار چھٹیاں ملیں تو کس طرح گزارتے ہیں؟"

"اگر لگاتار چھٹیاں آجائیں تو پھر ایک دن اپنی فیملی کو دیتا ہوں ایک دن دوستوں کو۔ بس اس طرح دن بانٹ دیتا ہوں۔"

40 "اگر کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"لڑکی کی محبت اپنے برے حالات میں' اولاد کی محبت دیکھنی ہو تو والدین کی بیماری میں اور دوست کی محبت دیکھنی

ہو تو اس وقت جب آپ کسی مشکل میں پھنس گئے ہوں۔"

41 "عورت کا کون سا روپ پسند ہے ذہانت کا یا حسن کا؟"

"عورت اگر بیوی کے روپ میں ہو تو ذہین ہو۔ کیونکہ دو چار بچوں کے بعد اس کا "حسن" تو اڑ جاتا ہوتا ہے۔"

42 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنا بیڈ روم۔"

43 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"

"نام نہیں بتا سکتا۔ اسے میں فوراً" جواب دیتا ہوں۔"

44 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"

"بوریت کا تو ٹائم ہی نہیں ملتا' اتنا مصروف رہتا ہوں۔ کبھی ٹائم ہو تو فلم دیکھ لیتا ہوں یا دوستوں کے ایس ایم ایس پڑھ لیتا ہوں۔"

45 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"جی' بہت سے لوگوں کو۔ خاص طور پر خواتین کو۔"

46 "آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو کیا نکلے گا؟"

"پیسے بالکل بھی نہیں نکلیں گے' کارڈز نکلیں گے کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈز... میں کیش نہیں رکھتا۔"

47 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"اسلحہ۔ لائسنس یافتہ۔"

48 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"کوئی کہے کہ وقت پہ آیا کرو تو مجھے برا لگتا ہے۔ وقت کی پابندی مجھ سے نہیں ہوتی۔"

49 "کن پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"

"اپنے پر تو جیب کیا' بینک' اکاؤنٹ سب کچھ خرچ کرتا ہوں۔ کیونکہ کام ایسا ہے کہ اپنے اوپر خرچ کرنا پڑتا ہے۔"

50 "اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"مجھے گاڑیوں کا بہت شوق ہے ہر سال ماڈل چینج کرتا ہوں۔"

51 "کھانے کے لیے بہترین جگہ' چٹائی' ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"

"کھانے کی بہترین جگہ ہے کار۔ اگر آپ نے کار میں بیٹھ کر "چیز رول" نہیں کھایا تو کچھ نہیں کھایا۔"

52 "فائیو اسٹار میں کھانے میں مزہ آتا ہے یا ڈھابے میں؟"

"یہ تو موڈ پر منحصر ہے۔ اگر اندرون سندھ یا اندرون پنجاب تو ڈھابے پر اور اگر شہر میں "ٹائی" کے ساتھ ہوں تو پھر بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کا دل چاہتا ہے۔"

53 "ہاتھ سے کھاتے ہیں یا چھری کانٹے سے؟"

"یہ بھی کھانے پر منحصر ہے۔ دیسی کھانے تو میں دونوں ہاتھوں سے کھاتا ہوں۔"

54 "دماغ ساتویں آسمان پر کب پہنچتا ہے؟"

"جب آپ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی مال میں ہوں اور لڑکیوں کا ایک جھمگٹا آپ کی طرف آ رہا ہو تو ساتویں کیا — آسمان بھی ہوتے تو کم تھے۔"

55 "دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی کھانے؟"

"دیسی... اور مٹن —— بکرے کا گوشت بہت پسند ہے' میں کہیں کھانے پہ جاؤں اور مٹن کی کڑاہی اور پلاؤ نہ کھاؤں ممکن ہی نہیں۔"

56 "کوئی کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتے ہوں؟"

"میں انڈا آملیٹ بہت اچھا پکاتا ہوں۔ پورے خاندان میں میرے آملیٹ کی دھوم ہے۔"

57 "عشق کے بخار کتنے چڑھے؟"

"عشق خود ایک بخار ہے اور یہ ساری چیزیں نو عمری (ٹین ایج) کی ہوتی ہیں اور میں اس سے نکل آیا ہوں۔"

58 "عورت نرم دل ہوتی ہیں یا مرد؟"

"کچھ عورتیں تو بہت ہی پتھر دل ہوتی ہیں اور کچھ بہت نرم' مردوں کے مقابلے میں عورت ہی ہوتی ہے۔"

59 "کون سے رویے دکھ کا باعث ہوتے ہیں؟"

"میرے ساتھ تو سب ہی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ ابھی تک تو۔"

60 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے کسی کیڑے سے ڈر نہیں لگتا' میں بہت بہادر انسان ہوں۔"

61 "کبھی شکار کیا کسی کا؟"

"ہاں ایک چوہے کا شکار کیا تھا اپنی شارٹ گن سے' وہ چوہا گھر میں گھس آیا تھا۔"

62 "کسی شخصیت کو اغوا کرنے کے لیے کہا جائے تو کس کو اغوا کریں گے اور تاوان میں؟"

"میں صنم چوہدری کو اغوا کروں گا اور تاوان میں اس کے ایکسٹینشن اس کے لینسز اس کا میک اپ سب چھین لوں گا۔"

63 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"نہیں.... ہر کوئی دیکھ بھال کے ہی محبت کرتا ہے۔"

64 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"دودھ پلائی۔"

65 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"شادی میں کیش دینا چاہیے۔ جب میری بہن کی شادی ہوئی تو جنھوں نے کیش دیا تھا وہ لفافے بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

66 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"صرف اور صرف اپنی امی کے ہاتھ کا کھانا اچھا لگتا ہے مجھے اپنی امی کے ہاتھ کی کوئی ایک چیز مہینہ بھر بھی کھانی پڑے تو کھاؤں گا۔"

67 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"ذوالفقار علی بھٹو سے۔"

68 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"ایک ہی بار کیا تھا وہ بھی میٹرک میں کیا تھا۔"

69 "آپ کو فوبیا ہے؟"

"گہرے پانی کا۔"

70 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"فون' چارجر' والٹ' پانی کی بوتل اور بہت کچھ۔"

71 "ماں ناراض ہو جائے تو؟"

"سوری بولتا ہوں اور لپٹ جاتا ہوں ماں سے۔"

72 اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟"

"جی فوراً" اور سوری کرتا ہوں۔"

73 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"

"اچھی عادت یہ ہے کہ لوگوں کو جلدی معاف کردیتا ہوں

اور بری آپ دوسروں سے پوچھیں۔"

74 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی۔"

"دونوں کی سنتا ہوں۔"

75 "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہو؟"

"بچپن کی تصاویر کے البمز پڑے ہیں اور کچھ نہیں۔"

76 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"غصہ ہی نہیں آتا۔"

77 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"

"بہت کروٹیں بدلتا ہوں ہزار بار۔"

78 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"

"فون اور پانی کی بوتل۔"

79 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"پوری کائنات۔"

80 "کبھی زندگی بری لگی؟"

"نہیں کبھی نہیں' زندگی بہت حسین تحفہ ہے خدا کا۔"

81 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"ٹماٹر۔"

82 "ویلن ٹائن ڈے مناتے ہیں؟"

"قہقہہ... مناتا تو نہیں ہوں۔ لیکن اگر کہیں سے پھول آجائیں تو پھر انہیں فون کرتا ہوں۔"

83 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"آج کل تو قسمت سے ملتا ہے اور قسمت بھی کسی کسی کی اچھی ہوتی ہے۔"

84 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"ماروں گا اس کو۔"

85 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"جب کہیں لیٹ ہو جاتا ہوں۔"

86 "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"

"میں وقت کا پابند ہو جاؤں اور پنکچول ہو جاؤں۔"

87 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں؟"

"شام کے وقت۔"

88 "دنیا کا کون سا مسئلہ فوری طور پر حل ہونا چاہیے؟"

"جو مسلمانوں پہ ظلم ہو رہا ہے۔ فوری طور پر ختم ہونا چاہیے۔"

89 "جس دن موبائل سروس آف ہو تو؟"

"تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے جسم سے روح نکال لی ہو۔"

90 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"

"20 روپے۔"

91 "اچانک لائٹ چلی جائے تو؟"

"اب تو جاتی ہی نہیں ہے۔"

93 "اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے تجربے سے؟"

"پہلے اپنے تجربے سے سیکھتا تھا اب تھوڑا ذہین ہو گیا ہوں اس لیے دوسروں کے تجربے سے بھی سیکھتا ہوں۔"

94 "پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"

"پاکستان کی عوام کے لیے سوچتا ہوں کہ انہیں تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔"

95 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"

"کسی کے لیے نہیں' جو ہمارا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔"

96 "لوگ کن باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"ادھر ادھر کی باتوں میں گوسپ کرکے۔"

97 "حجاب ضروری ہے یا فیشن ہے؟"

"فیشن ایبل حجاب ہو تو کیا ہی بات ہے۔"

98 "شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟"

"کوئی بھی ہو سکتی ہے اگر جیب میں پیسہ ہے تو۔"

99 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"عروج و زوال زندگی کا حصہ ہے' قبول کروں گا زوال کو۔"



بقیہ سروے

کہیں بھول گیا ہوں رکھ کے.... ایسے خواب ہیں جو حقائق پر حجاب رکھ دیتے ہیں۔ ملکی حوالے سے.... نابلد' ذہن خالی بلکہ....

ذاتی حوالے سے؟ "لم یزل اپنے نیک اور صالح بندوں میں تھوڑی سی جگہ دے دے۔ حرا بکھرتی جارہی ہے' وہ بس سمیٹ لے۔"

3 ۔غار حرا میں ایک رات (سفرنامہ) مستنصر حسین تارڑ دیدار بے شک جیسا بھی بے مثل ہوا آنکھیں بالآخر تھکتی ہیں تو میں کچھ دیر آنکھیں بند کرکے اونگھنے کی سعی کرتا رہا لیکن بند آنکھیں بھی کھلی رہتیں کہ ان میں سے خانہ کعبہ کا روشن جلوہ رخصت نہ ہوتا۔"

4 ۔ نہ کوئی ضروری بات' نہ وعدہ' نہ کسی کی ڈھارس بندھائی' نہ دیرینہ رستوں پر گئے' نہ یاد رکھنے' نہ بھول جانے کی بات ہوئی' نہ بدلتے موسموں کی مخمصے میں پڑے' نہ حقائق پر سے راز آشکار کرنے پڑے تو پھر دیر کیسے اور کیونکر ہوتی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کچھ منصوبے پہلے سے بندھے ہیں' تکمیل کی امید ہے.... بہت نیچے سے اوپر جانے کے منتظر ہیں' اتنا اونچا بس کہ فلک سے زمین پر نظر بھی رہے۔

انجل.... دہڑکی

1 ۔

جس کے ہاتھ میں پتھر' کماں' تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا میرے شہر مہرباں میں نہ تھا

ہمیں تو اس جاتے ہوئے سال میں ہی پتا چلا کہ یہ دنیا بڑے دہرے معیار کی ہے۔ اس دوغلی دنیا میں دوغلے معیار کے لوگ ہی جی سکتے ہیں۔ یہاں منافقت عام ہے اور منافق لوگ بڑی جی داری سے سر اٹھا کے اوپر گردن تان کے چلتے ہیں۔ سچے لوگوں کو تو ہمیشہ قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اپنی سادگی کی' اپنی سچائی و سادہ دلی کی۔ کبھی کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ پیاز کے پرتوں کی طرح انسانوں کے اتنے چہرے کیوں ہوتے ہیں؟ یہ کچھ چہرے اتنا کھلا دھوکا کیوں دیتے ہیں۔ لوگوں کے رویوں اور لہجوں میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوالات اکثر ذہن میں سر اٹھاتے ہیں۔ لیکن ان سب سوالوں کے جواب میں جامد خاموشی ہی ہوتی ہے۔ کچھ سوالات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے جواب عمر بھر نہیں مل پاتے۔ کیونکہ کچھ بھید بھرے راز ہمیشہ راز ہی رہیں تو اچھا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ کچھ چہرے ہمیشہ نقابوں میں ہی رہیں تو اچھا ہے کیونکہ بہرحال حقیقت بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس دنیا سے اور دنیا والوں سے کچھ بھی توقع (expect) کرنا فضول ہے۔

گئے سال نے یہ ہی سوچ دی کہ لوگ کسی کے نہیں ہوتے۔ اگر کسی کا کوئی ہوتا ہے تو وہ اللہ ہے۔

2۔

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا کرتا ہے
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

جہاں تک خواہش کا تعلق ہے تو خواہشات کا کاسہ کبھی نہیں بھرتا۔ چاہے تعبیروں کے کتنے ہی کھنکتے سکے گرتے رہیں۔ خواہشوں کا طواف کبھی رکا نہیں کرتا۔ تو خواہشات کا کیا ہے یہ تو ایک کے بعد ایک دل کے کسی کونے میں جنم لیتی ہی رہتی ہیں۔ بقول شاعر کہ.....

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ خواہشوں کو اپنے دل میں دفن کردو لیکن دل کو ان میں دفن نہ ہونے دو اور پھر ہم تو ٹھہرے ہی کچھ الگ قسم کے لوگ.... کہ ہم عجب طرز کے لوگ تھے ہمارے اور ہی روگ تھے۔ تو خواہش ہے زندگی کی کتاب سے کاش کا لفظ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ تلاش ہے اپنے ہی وجود کی۔ جستجو ہے کہ اندھیری گپھاؤں میں الجھی کبھی اپنی ہی ذات کا کوئی سرا کھوج سکوں۔ خواب ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم خواب ہو جائیں۔ خیال کی دنیا کبھی حقیقت کا روپ دھارے سامنے آئے۔ تمنا ہے کہ اس دورنگی دنیا میں کسی بھی کمپرومائز کے بغیر اپنے اصل رنگ میں جی سکیں۔

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

ملکی حوالے سے کیا کہوں کہ اس میں جنگل کا ہی سہی کوئی قانون نافذ ہو۔ سچ جو کہ یہاں نایاب ہے۔ سچ جسے

جھوٹ کی اونچی دیواروں والے قلعوں میں قید کر دیا گیا ہے۔ کاش! کہ سچائی ایک بار پھر سے اجاگر ہو جائے۔ کاش! کہ اس وطن عزیز کی دائمی بقا کے لیے اس ملک کے سیاست دان اپنی سیاست چمکانا چھوڑ کر جھوٹ اور مصلحت کی ساری دیواریں گرا دیں۔ اس بیرونی امداد کے بدلے جو انہوں نے اپنی طاقت' اپنی حرمت' اپنی عزت اور جانے کیا کیا رہن رکھ دیا ہے۔ کاش! کہ کبھی صاحب اقتدار سوچیں کہ انہوں نے چند سکوں کے عوض کتنے سپنے بیچ دیے ہیں۔

3 ۔ ٹی وی پروگرامز کے بارے میں کیا کہوں۔ ایک وقت تھا کہ 'ہمیں بھی یہ ٹاک شوز دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ ابھی سچائی مری نہیں۔ ابھی سچ زندہ ہے۔ ابھی کچھ سچے لوگ باقی ہیں۔ پر اب یہ ساری خوش گمانیاں ہوا ہو چکی ہیں۔ یہ پروگرامز ہماری سوچ کیا بدلیں گے۔ انہیں تو اپنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ (خاص طور پر مارننگ شوز والوں کو) بقول خلیل جبران "کہ یہ وہ مداری ہیں جو آکر تماشا دکھاتے ہیں اور بس...." کیونکہ یہ وہ خالی ڈھول ہیں جو صرف بجنا جانتے ہیں۔ ہم سب ان پروگرامز کے لمبے لمبے جذباتی مکالمے سن کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ تو کیمرے کے سامنے کا سچ ہے۔ اور کیمرے کے پیچھے کا سچ تو کبھی سامنے آتا ہی نہیں۔ جہاں یہ اینکر پرسن انہی سیاست دانوں جن سے یہ کڑے کڑے سوالات کرتے ہیں اور پھر ان ہی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگاتے ہیں۔ باقی اس سال کوئی کتاب پڑھی نہیں۔ ہاں البتہ کسی کہانی کا ایک اقتباس ہے جو کہ مجھے بے حد پسند ہے' وہ لکھ رہی ہوں۔

"جب اپنا بہت عزیز' بہت پیارا بچھڑ جائے تو انسان اپنے جینے کے جواز' اپنے زندہ رہنے کے بے معنی سے ہی سہی لیکن بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے' تاکہ اگر انہیں کبھی وہ بچھڑنے والا ملے تو ان سے جینے کا جواز' ان کی زندگی کا استفسار نہ مانگے اور مانگے تو وہ جھٹ سے بتائیں کہ تیری یادیں تھیں' کچھ نشانیاں تھیں' کچھ وعدے تھے' کچھ ذمہ داریاں تھیں جن کو نبھانے کے لیے جینا پڑا' مجبوری تھی' سمجھا کرو۔"

4 ۔

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

میں چہرہ شناش کبھی نہیں رہی۔ نہ ہی چہرے پڑھنے کا ہنر جانتی ہوں۔ تو ہمیشہ سب پر آنکھیں بند کرکے یقین کیا ہے' بقول....

مخلص ہوں میں دشمن پہ بھی کرتا ہوں بھروسا
تا عمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

سو ہمیشہ لوگوں کو پہچاننے میں دیر کر دیتی ہوں۔ جس کا ہر بار نئے سرے سے پچھتاوا ہوتا ہے اور شاید سدا ہو گا۔

فریدہ گوہر۔ ملتان

1 ۔ اس سال میری والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یوں لگتا ہے دنیا ہی اندھیرا ہو گئی۔ دل چاہتا ہے کہ دروازہ کھولیں اور ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہمارے سامنے ہو۔ جو دنیا کا حسین ترین چہرہ تھا۔

گئے سال میں' میں گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہوئی۔ کالج کی ہنگامہ خیز زندگی کو خیرباد کہا۔ میرا سبجیکٹ اردو ہے اور پھر پرنسپل' سالانہ عید میلاد النبی کا جشن' جلسہ تقسیم انعامات' اسپورٹس ڈے' فن فیئر اور کالج کو بہتر سے بہتر بنانے کی تدابیر۔ لڑتے لڑتے وقت گزر گیا اور پتا بھی نہیں چلا۔ اب خود کو منظم کرنے کی کوشش ہے۔ آپ کی مدد درکار ہے۔ کیا آگے بڑھنے' مصروف رہنے اور قلم کو استعمال کرنے میں آپ میری مدد فرمائیں گی؟

(یقیناً"....ہم آپ کے ساتھ ہیں فریدہ!)

2 ۔ کاش سانحہ آرمی پبلک اسکول پشاور پیش نہ آیا ہوتا۔ معصوم بچوں کے ساتھ ساتھ اسکول کی پرنسپل کی شہادت خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کاش میں خواتین ڈائجسٹ میں افسانہ لکھ پاتی۔

3 ۔ عمیرہ احمد کا "پیر کامل" پڑھا۔ عشق رسول کی جو آگ سینے میں جلی' بیان سے باہر ہے۔ پھر ان ہی کے ناول "آب حیات" کا مطالعہ کر رہی ہوں' ہر قسط شوق سے پڑھتی ہوں۔ حجتہ الوداع کا خطبہ جس اہتمام سے پڑھنے کو ملا لاجواب ہے۔ قلم آئینہ ہی تو ہے' خوب صورت زاویے پر رکھ کر عکس دکھاؤ تو بات سیدھی دل میں جا اترتی ہے۔

4 ۔ ذہن میں پیدا ہونے والے بے شمار کہانیوں کے خاکے اور کردار کاغذ پر اتارنے کا سوچتی رہی ہو اور بس سوچتی رہی کہ ایک سال اور گزر گیا۔

1 ۔ بالکل جناب میں کھانا پکاتے وقت پسند اور ناپسند کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ غذائیت سے بھرپور کھانے پکائے جائیں۔ اپنے چھوٹے سے آشیانے میں صرف میں اور میرے شریک حیات ہیں اور میں ہمیشہ سے ان کی ہی پسند کا خیال رکھتی ہوں اور ان کی فرمائش کا ہی کھانا پکاتی ہوں۔ مثلاً "جیسا امی خاگینہ بناتی تھیں' ویسا بناؤ' امی جیسا زردہ' امی جیسا قورمہ' امی جیسا پلاؤ' پکانے سے پہلے ہی کہہ ضرور دیتی ہوں کہ میں کوشش ضرور کروں گی مگر ان کے جیسا مزہ نہیں لاسکتی۔ تو میرے میاں فوراً" کہہ دیتے ہیں کہ "کوئی بات نہیں' تم کوشش تو کرو" تو اسی کوشش میں اٹھائیس سال کے بعد کچھ بہتر نتائج سامنے آئے ہیں۔

2 ۔ میں اس دیار غیر میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنی پیاری اماں کے سکھائے ہوئے اصول اپناؤں۔ جیسے کہ شامی کباب تیار رہتے ہیں۔ بھنا ہوا گوشت ضرور تیار رکھتی ہوں اور دو تین قسم کی چٹنیاں ضرور تیار رہتی ہیں۔ تو اس طرح مہمان کے آنے پر آرام سے دسترخوان وسیع ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں مہمان کی آمد پر بہت خوش ہوتے ہیں اور مہمان اپنے آپ کو مہمان نہیں سمجھتا بلکہ اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کا کھانے پر انتظار کر رہے تھے۔ گرم گرم چپاتیاں مزہ دے جاتی ہیں۔

3 ۔ صبح کا ناشتا تو صرف ہفتے اور اتوار کو ہوتا ہے۔ باقی پانچ دن تو انڈے' ڈبل روٹی اور دلیہ کا ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہم دونوں ہی صبح صبح ہوا کے تیز گھوڑے پر سوار ناشتا کرتے ہیں۔ گرم گرم چائے اور کافی پی کر اور کبھی چھوڑ کر' مگر ناشتے کے برتن دھو کر کچن صاف کر کے اسی معاشرے کے کارکن بن جاتے ہیں۔ لیکن ہفتے اور اتوار کو سو کر بھی دیر میں اٹھتے ہیں۔ پھر میرے میاں کی فرمائش... سوجی کا حلوہ پراٹھوں کے ساتھ... کلونجی والے آلو پوریوں کے ساتھ... مزہ دے جاتے ہیں۔ جب تک کہ میرا ناشتا تیار ہو وہ دو ایک قریبی دوستوں کو مع اہل خانہ کے مدعو کر چکے ہوتے ہیں اور یہ بات میں جانتی ہوں' اس لیے ایسا ہی اہتمام کرتی ہوں۔

کلونجی کے آلو

کلونجی کے آلو بنانا بہت آسان ہے۔ حسب ضرورت آلو لے کر چھیل کر چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کرلیں۔ حسب ذائقہ ہری مرچیں' نمک' ہرا دھنیا' ایک چھوٹا چائے کا چمچہ کلونجی' اچار کا تیل اور تقریباً" ایک گلاس پانی پتیلی میں ڈال دیں اور دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ جب آلو گل جائیں تو ان کو ہلکا سا بھونیں کریں اور گرم پوریوں سے نوش فرمائیں۔ گھر والے بہت خوش ہوں گے۔ اچار اور دہی کا رائتہ بھی اچھا لگے گا۔

اسی طرح سوجی کا حلوہ بھی بناتی ہوں۔ سوجی' شکر' گھی' میوے' سب کچھ حسب ضرورت... سوجی بھون کر اس میں شکر ڈال دیں۔ پھر کٹے ہوئے میوے' جب سب یکجان ہو جائیں تو حسب ضرورت پانی ڈال کر بھونتے رہیں اور گھی جب نظر آنے لگے تو چولہا بند کر دیں۔ بہت مزے کا ہو گا۔

معاف کیجیے گا' میں نے دوسری بہنوں کی طرح ترکیب نہیں لکھی۔ کیونکہ ہر گھر میں ایک باورچی خانہ ہوتا ہے اور سب لوگ اپنے اپنے لحاظ سے ہی چیزیں ڈال کر پکاتے ہیں۔ خود میں نے کبھی کلو اور سیر کا حساب نہیں رکھا۔ بس اپنے انداز سے کام کیا ہے اور الحمدللہ جب بھی تیار کرتی ہوں سب ہی کھا کر خوش ہوتے ہیں۔ آپ بھی آزمائیے... ان شاء اللہ مزے دار ہو گا۔

4 ۔ باہر کا کھانا مردوں کے دم سے ہوتا ہے اور میرے میاں ہمیشہ گھر کے کھانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے باہر کا کھانا کسی خاص موقع پر ہی ہوتا ہے۔ جیسے کہ سالگرہ ہے۔ میری فرمائش ہے... یا کسی مہمان کے ساتھ... ہمارے پنجاب کے مہمان جب تک کہ باہر کا کھانا نہ کھائیں' سمجھتے ہیں کہ مہمان نوازی نہیں ہوئی۔ ویسے ذاتی طور پر میں اپنے ان مہمانوں کو بہت پسند کرتی ہوں۔

5 ۔ اچھا کھانا پکانا بھی ایک فن ہے۔ ہمیشہ کھانا دل سے پکانا چاہیے۔ بسم اللہ کہہ کر درود شریف پڑھ کر... محبت سے... جیسے کہ ہم لوگ اور سارے کام کرتے ہیں۔ (جیسے کہ باہر جانا' کپڑے کی خریداری' ٹی وی دیکھنا' باتیں کرنا) تو اگر ہم... ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھیں' تو اچھا کھانا بھی پک جائے گا۔ محنت رائیگاں بھی نہیں ہوگی اور خوشی خوشی سب لوگ کھانے سے انصاف کریں گے۔ ✡

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہی مچھلی

ضروری اشیاء :

مچھلی	آدھا کلو (کھال اور ہڈی سمیت)
دہی	تین کپ
نمک	حسب ذائقہ
چلی ساس، سویا ساس	دو دو کھانے کے چمچے
چائنیز نمک	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	ایک کپ
ہری مرچیں	چار عدد
کڑھی پتے	تھوڑے سے

ترکیب :

مچھلی، نمک لگا کر دھو لیں۔ دہی میں نمک، چلی ساس، سویا ساس، لیموں کا رس، گرم مسالا پاؤڈر ملا کر اس آمیزے کو مچھلی پر لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اور ہری مرچوں کو لمبائی میں کاٹ کر کڑھی پتے کے ساتھ تل کر نکال لیں اور اسی تیل میں مچھلی ڈال کر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ مچھلی کو زیادہ چلائیں نہیں اور الگ سے پانی بھی نہ ڈالیں۔ جب اس پر تیل اوپر آنے لگے تو ڈش میں نکال لیں اور اوپر سے تلے ہوئے کڑھی پتے اور ہری مرچیں ڈال کر روٹی اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

مسالا فش

ضروری اشیاء :

مچھلی (بون لیس)	آدھا کلو
تیل	ایک تہائی کپ
پیاز	ایک عدد (درمیانی)
لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
لال پسی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پانی	ایک چوتھائی کپ
ٹماٹر	ایک عدد
ہری مرچیں	دو عدد
ہرا دھنیا	پانچ کھانے کے چمچے

ترکیب :

تیل گرم کریں اور پیاز ڈال کر گلابی کر لیں۔ اس میں لہسن اور ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں، اس کے بعد لال پسی مرچ، ہلدی اور نمک ڈال کر ذرا سا پانی شامل کر کے بھونیں۔

مچھلی کے باریک قتلے اس مسالے کے اوپر رکھ دیں۔

اس کے بعد اوپر سے ٹماٹر کے گول قتلے کاٹ کر رکھ دیں اور ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ دس منٹ کے بعد مچھلی کے ٹکڑوں کو احتیاط سے پلٹ کر پانچ منٹ کے لیے دوبارہ ڈھک دیں۔

تیار ہو جائے تو ڈش میں نکال کر ہری مرچوں اور ہرے دھنیے سے گارنش کر لیں اور ذائقے دار مسالا فش کو نان یا چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

گریوی مسالا فش

ضروری اشیاء :

مچھلی	ایک کلو
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

گریوی کے لیے :

دہی	آدھا کپ
ٹماٹر	دو عدد
پیاز	آدھا کپ

فرنچ ٹوسٹ

ضروری اجزا :

انڈا	ایک عدد
بریڈ سلائسز	تین عدد
دودھ	تین کھانے کے چمچے
نمک	ایک چٹکی
دار چینی پاؤڈر	دو چٹکی یا آدھا چائے کا چمچہ
چینی	دو چائے کے چمچے
مکھن	حسب ضرورت

ترکیب :

سب سے پہلے ایک فرائنگ پین میں بریڈ سلائسز کو ہلکا سا سینک لیں۔ ایک پیالے میں ایک عدد انڈا' چینی' نمک اور دودھ اچھی طرح ملا لیں پھر اس میں دار چینی پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح بیٹ کر لیں یہاں تک کہ ساری چیزیں یکجان ہو جائیں۔ اب فرائی پین میں مکھن ڈالیں۔ بریڈ سلائس کو ایک ایک کر کے پیالے میں تیار آمیزے میں ڈپ کریں۔ دونوں طرف سے اچھی طرح ڈپ کرنے کے بعد فرائی پین میں ڈال کر تل لیں۔ جب ایک طرف سے براؤن ہو جائے تو پلٹ دیں۔ اسی طرح تینوں سلائسز تل لیں۔ پیش کرتے وقت پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔

لال پسی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن' ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پیالے میں مچھلی (چھوٹے قتلے)' لیموں کا رس' پسی کالی مرچ' ہلدی' نمک ملا کر تل لیں اور الگ رکھ لیں۔ ساس پین میں تیل گرم کر کے لہسن' ادرک پیسٹ ڈال کر اس میں دہی' ٹماٹر (پیس لیں)' براؤن پیاز (پیس لیں) لال مرچ' نمک اور میتھی دانہ ڈال کر دس منٹ پکائیں پھر مچھلی ڈال کر درمیانی آنچ پر بیس منٹ مزید پکائیں۔ ہری مرچیں ڈال کر دو سے تین منٹ دم پر رکھیں۔ چولہے سے اتار کر سرونگ ڈش میں نکالیں اور پیش کریں۔

پانی نکل جائے تو میدہ ملا کر نرم ہاتھوں سے 5 منٹ تک گوندیں ایک سائز کے گول گول بالز بنا لیں۔

*



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ام عبید

بچپن میں ٹائی فائیڈ کی وجہ سے آپ کے بھائی کا ذہن متاثر ہوا۔ ان کا حافظہ بالکل نہیں ہے۔ تین سال اسکول جانے کے باوجود وہ کچھ نہ سیکھ سکے۔ گھر میں بھی نہیں پڑھا۔ کام سکھانے کی کوشش کی کند ذہنی کی وجہ سے نہ سیکھ سکے۔ نقصان کر دیتے ہیں غصہ کے تیز ہیں۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑے.... والد صاحب نے ان کو اپنے کام میں لگانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہے۔ لوگ ان کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے اینٹھ لیتے ہیں۔ وہ آپ سے بھی لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔ والد کے ساتھ بھی ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی ہے۔ بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ علیحدہ ہو چکے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ چھوٹے بھائی کی شادی کرنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ آپ کی والدہ معذور ہیں اور والد بیمار رہتے ہیں۔

آگے آپ لکھتی ہیں۔ جو بھائی ایک جوڑی جوتا نہیں خرید سکتا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کیسے اٹھائے گا مگر امی ابو کی خدمت کے لیے بہو کی بھی ضرورت ہے۔

ج: اچھی بہن! آپ کو بھائی سے ہمدردی ہے تو ان کا علاج کرائیں ان کو کوئی ہنر سکھانے کی کوشش کریں لیکن معذرت کے ساتھ آپ کو بھائی سے ہمدردی بھی اس وقت ہوئی جب آپ کو والدین کی خدمت کے لیے کسی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ ایک لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر بغیر معاوضے کی خادمہ لانا چاہتی ہیں جس کے روٹی کپڑے کی ضمانت بھی آپ کا بھائی نہیں دے سکتا جبکہ بڑے بھائی بھی کسی مدد سے صاف انکار کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا بھی صحیح ہے۔

اس آئینہ میں خود کو رکھ کر دیکھیں اور سوچیں کہ کیا آپ اپنی بیٹی کے لیے ایسا رشتہ پسند کریں گی؟

اپنے والدین کی خدمت آپ بہن بھائیوں کا فرض ہے۔ آپ خود کریں یا کوئی ملازمہ رکھیں۔ کسی بہو پر ساس سسر کی خدمت فرض نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی دعائیں لینے کے لیے خدمت کرے تو یہ اس کی سعادت مندی ہے۔

سعدیہ کراچی

س: میرا پچھلا خط بھی میں نے آپ کو دسمبر میں لکھا تھا اور آپ نے اس کا جواب جنوری کے شمارے میں دے بھی دیا تھا۔ صرف ایک سوال کہ حدیث پاک میں بھی فرمان ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا تو ایسا شخص جس نے ہمارے اعتبار کا خون کیا ہو اعتبار کا شیشہ چکنا چور کیا ہو کیا ایسے شخص پر ہمیں پھر بھی اعتبار کر لینا چاہیے۔ شاید وقت اس زخم پر مرہم رکھ دے۔ کہتے ہیں وقت سب زخموں کا مرہم ہے پھر اس کا کیوں نہیں؟

میرے دل میں اب بھی یہ وہم موجود ہے کہ شاید اب بھی وہ موبائل میں ایسی چیزیں رکھتا ہو۔

ج: اچھی بہن! میں نے پہلے آپ کو کافی نرمی سے جواب دیا تھا حالانکہ اس وقت بھی آپ کو بتانا یہی تھا کہ آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ اتنی سی بات کا اتنا بڑا افسانہ....؟

چار بچوں کی ماں، تیرہ سال کی بیٹی۔ سب سے چھوٹا بیٹا تین سال کا، ایک ماں کی ایسی سوچ.... کون سی چیز ہے جو آپ کو حاصل نہیں ہے؟ گھر، بچے، جاب کی آزادی، شوہر کا پیار (پچھلے خط میں آپ نے خود لکھا تھا) ذرا ذرا سی بات پر آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ بھی تو آپ کی اس خامی کو برداشت کر رہا ہے، کیا ایسے خیالات اس کے نہیں ہو سکتے اور آپ ایک معمولی بات کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔

مشورہ آپ کو پہلے دے دیا تھا۔ لیکن آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا.... اب کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ آپ کا شوہر سمجھ دار ہے وہ آپ کا نفسیاتی علاج کرا رہا ہے۔

جہاں تک اعتبار ٹوٹنے کی بات ہے تو اعتبار تو جب ٹوٹے گا جب وہ آپ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا بنا لے گا۔ ایک لمحے کے لیے سوچیں ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا، کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ ہم سب ہی بے شمار گناہوں غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر کو فرشتہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ فرشتہ نہیں ثابت ہوا (فرشتہ ہو بھی نہیں سکتا) تو آپ کا اعتبار ٹوٹ گیا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن آپ مسئلہ بنائے بیٹھی ہیں۔ یہ ناشکری ہے اور ناشکری کو کفر کے برابر کہا گیا ہے۔

م۔ف

س:۔ میرے ساتھ عجیب وغریب مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے ساتھ کوئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ میرے تخیل پر چھایا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ میں نے سائیکاٹرسٹ کو بتایا اور اس کی دی ہوئی دوائی سے میرے اس مسئلے پر شروع میں تو کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔ میری پریشانی اب یہ ہے کہ جب میں سائیکاٹرسٹ کو تفصیل سے اپنا مسئلہ بتا رہی تھی۔ تب سائیکاٹرسٹ کے پاس تقریباً "بیس اس کی اسٹوڈنٹس بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب میری باتوں کو بہت غور سے سن رہی تھیں یعنی کہ ان لوگوں کو میرے اس مسئلے کا پتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے دماغ سے ہر وقت یہ بات چپکی رہتی ہے کہ سائیکاٹرسٹ تو پروفیشنل ہے۔ اس نے میرا مسئلہ کسی کو نہیں بتانا لیکن سائیکالوجی کی اسٹوڈنٹس جو انٹرن شپ کے لیے آئی تھیں۔ انہوں نے گھر جا کر میرا مسئلہ سب کو بتایا ہو گا۔ اور اگر وہ مجھے زندگی کے کسی موڑ پر مل گئیں تو میرا کیا حال ہو گا۔ کہیں وہ سب کے سامنے میرا راز فاش نہ کر دیں۔ یہی سوچ سوچ کر ہر وقت سر میں درد رہتا ہے۔

ج:۔ اچھی بہن! آپ بالکل نہ ڈریں۔ زندگی کے کسی موڑ پر وہ آپ کو ملیں بھی تو آپ کو پہچانیں گی بھی نہیں۔ تعلیمی دور میں ہم نہ جانے کتنے لوگوں سے ملتے ہیں۔ پھر کون کہاں نکل جاتا ہے۔ یاد بھی نہیں رہتا۔ وہ طالبات روزانہ آپ جیسی نہ جانے کتنی لڑکیوں اور لڑکوں سے ملتی ہوں گی۔ اس طرح کے کتنے مسائل ان کے سامنے آتے ہوں گے۔ پورے تعلیمی دور میں اگر وہ پانچ، چھ سو لوگوں سے ملیں تو کسی کا نام اور شکل کیسے یاد رہ سکتی ہے۔ پھر پانچ دس سال گزر جائیں تو ہمارا حلیہ بھی بدل جاتا ہے۔ کچھ موٹے ہو جاتے ہیں۔ کچھ کا رنگ سنولا جاتا ہے۔ کچھ کے بال گر جاتے ہیں۔ کچھ زیادہ حسین ہو جاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وقت ہم پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ضرور ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ اگر ہم کچھ عرصہ بعد کسی سے ملیں تو وہ ہمیں پہچان جائے آپ اطمینان رکھیں۔ اول تو ان کا آپ سے ملنا ممکن نہیں اگر کوئی مل بھی جائے تو پہچاننا آسان نہیں اور اگر یہ دونوں ناممکن باتیں ممکن بھی ہو جائیں تو سیدھی سی بات ہے کہ آپ ان کو پہچاننے سے انکار کر دیں۔



امت الصبور



حیا۔۔۔ وہاڑی

س۔ میرا مسئلہ میرے ہاتھ ہیں۔ میرے ہاتھ خشک اور کھردرے ہیں نرم و ملائم نہیں ہیں حالانکہ ہر قسم کا موئسچرائزنگ لوشن اور کولڈ کریم کا استعمال کر چکی ہوں۔ پلیز آپ کوئی سادہ آسان اور گھریلو سا نسخہ بتا دیں میرے ہاتھ اچھے ہو جائیں۔

دوسرا مسئلہ ہونٹوں کا ہے براہ مہربانی ہونٹوں کو گلابی کرنے کے لیے بھی کوئی مشورہ دے دیں۔

ج۔ آپ ہر قسم کا لوشن اور کریمیں استعمال کر چکی ہیں اس کے باوجود فائدہ نہیں ہوا تو اس کا مطلب ہے کہ صحیح صابن استعمال نہیں کرتیں۔ عموماً کپڑے دھونے کے لیے جو صابن استعمال کیا جاتا ہے اس میں کاسٹک سوڈا ہوتا ہے جو ہاتھوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خراب ڈٹرجنٹ پاؤڈر سے بھی ہاتھوں کی جلد خراب ہو جاتی ہے۔ درج ذیل ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کے ہاتھوں کی جلد بہتر ہو جائے گی۔

1۔ روزانہ رات کو سوتے وقت ہاتھوں پر ناریل یا چنبیلی کا تیل لگائیں۔

2۔ ہاتھوں کو گرم پانی سے دھو کر دودھ کی ملائی لگا کر مساج کریں اس سے جلد ملائم رہتی ہے۔

3۔ ایک ہاتھ پر تھوڑی سی چینی رکھ کر اس میں تھوڑا سا لیموں کا رس نچوڑیں۔ اس کو ہاتھوں پر اس وقت تک رگڑیں جب تک چینی کے دانے پوری طرح گھل نہ جائیں۔

4۔ روغن بادام' لیموں کا رس اور گلسرین ایک ایک چمچہ لے لیں۔ اس کا آمیزہ بنا کر محفوظ کرلیں اور روزانہ ہاتھوں پر آہستہ آہستہ مساج کریں۔

ہونٹ گلابی کرنے کے لیے آپ سیب کے بیج پیس کر لگائیں اس سے ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

2 ۔ دودھ میں زعفران پیس کر ملالیں' اسے ہونٹوں پر لگائیں۔

3 ۔ بادام پیس کر بالائی میں ملالیں' اسے رات سونے سے پہلے ہونٹوں پر لگائیں۔

کہکشاں صابر۔۔۔ کویت

س۔ میری بات پکی ہوگئی ہے اور کچھ دنوں میں شادی ہو جائے گی' مگر میرے چہرے پر دانہ ہوتا ہے تو وہ کالے رنگ کا نشان چھوڑ دیتا ہے۔ جس سے چہرہ بہت عجیب لگتا ہے اور اب وہ نشان نہیں جا رہا اور مجھے انسومنیا ہے۔ جس کی وجہ سے میری نیند پوری نہیں ہوتی جس کی وجہ سے میرے چہرے پر آنکھوں کے نیچے بلیک سرکلز بنے ہوئے ہیں۔ کوئی آسان طریقہ بتائیں۔

ج۔ کہکشاں! اگر یہ دانہ پیپ کا ہوتا ہے تو اسے چھیڑیں نہیں' کچھ دن بعد یہ داغ خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ڈاکٹر کو دکھالیں کیونکہ دانہ دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کس قسم کا ہے عموماً "بیٹنوویٹ این" کریم لگانے سے دانوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ آپ حسب ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

1۔ جلد زیادہ چکنی ہے تو صفائی کا خیال رکھیں۔

2۔ پیٹ کی خرابی سے بھی دانے نکلتے ہیں' قبض نہ ہونے دیں۔

3۔ پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔

4۔ عموماً ذہنی تناؤ و ڈپریشن سے بھی جلد متاثر ہوتی ہے اور چہرے پر دانے نکلتے ہیں۔

نیند نہ آنا آنکھوں کے حلقوں کی ایک بڑی وجہ ہے۔ کم از کم آٹھ گھنٹے کی نیند بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ پیٹ کی خرابی یا جگر کی خرابی سے بھی آنکھوں کے گرد حلقے بن جاتے ہیں۔ نیند کے لیے آپ سرسوں کے تیل سے پورے سر پر مالش کریں پھر نیم گرم پانی سے غسل کریں اور رات سونے سے پہلے گرم دودھ پئیں ان سے اچھی نیند آئے گی۔

ڈاکٹر کے مشورے سے آپ نیند کے لیے دوا بھی لے سکتی ہیں۔